معارف القرآن

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا الحاج محمد ادریس صاحب کاندھلوی

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

جلد اول مشتمل بر تفسیر پارہ ۱ ۲ ۳

بہ ترجمہ حقیقت آگیں کہ مکاتب چند و عبارت خود حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی قدس اللہ سرہ

شائع کردہ

مکتبۃ المعارف

دار العلوم حسینیہ شہداد پور

سندھ، پاکستان

باجازت: مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ۵۳ جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ

الحمد للہ وللہ المنۃ کہ دریں زمان میمنت اقتران تفسیر سراپا تنویر گنجینۂ حقائق و معارف
خزینۂ اسرار و لطائف کشاف مشکلات قرآنیہ و وصاف مخدرات فرقانیہ

مسمّٰی بہ

معارف القرآن

شیخ التفسیر و الحدیث حضرت مولانا الحافظ محمد ادریس صاحب کاندھلوی

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

جلد اوّل مشتمل بر تفسیر پارہ ۱ ۲ ۳

بہ ترجمۂ حقیقت آگاہ معارف پناہ عارف باللہ حضرت شاہ عبد القادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ اسرارہما

شائع کردہ

مکتبۃ المعارف

دار العلوم الحسینیہ شہداد پور
سندھ، پاکستان

باجازت: مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ۳۵۳ مہران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

نام کتاب :- معارف القرآن جلد ۷

نام مصنف :- حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

مکمل سیٹ :- ۸ جلد

صفحات جلد ۷ :- ۷۰۳

کتابت متن قرآن کریم : خطاط القرآن حضرت سید محمد اشرف علی الحسینی سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

کتابت سرورق :- سید انیس الحسن ابن سید الخطاطین سید نفیس الحسینی دامت برکاتہم العالیہ لاہور

کتابت ترجمہ و تفسیر :- سید عصمت اللہ، سید جعفر حسین، سید ضیاء اللہ گوجرانوالہ

تعداد طبع اول :- ۱۴۱۹ھ ۱۱۰۰ (گیارہ سو)

تعداد طبع دوم :- ۱۴۲۲ھ

پریس : القادر پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر :- مکتبہ المعارف دارالعلوم حسینیہ شہدادپور سندھ پاکستان

فون ۴۲۲۷۶ - ۴۱۳۷۶ (۰۲۲۳۲)

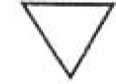
ملنے کے پتے

کراچی :- صدیقی ٹرسٹ، صدیقی ہاؤس، المنظر اپارٹمنٹس ۴۵۸ گارڈن ایسٹ
نزد لسبیلہ چوک کراچی۔ پوسٹ کوڈ نمبر ۷۴۸۰۰

لاہور :- مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ۳۵۳ مہران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

شہدادپور :- مکتبہ المعارف دارالعلوم حسینیہ شہدادپور ضلع سانگھڑ سندھ پاکستان پوسٹ کوڈ ۶۸۰۳۰

اہم نوٹ



ہم نے اس کتاب کی تصحیح میں حتی الوسع کوشش کی ہے پھر بھی ممکن ہے کوئی غلطی رہ گئی ہو۔ لہٰذا تمام قارئین سے التماس ہے کہ اگر کہیں غلطی پاویں تو براہِ راست ہمیں اطلاع دیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اسے درست کیا جا سکے، اللہ تعالیٰ اس کا اجر آپ کو عطا فرمائیں گے۔

خط و کتابت کیلئے :- مکتبہ المعارف دارالعلوم حسینیہ شہدادپور پوسٹ کوڈ ۶۸۰۳۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

احوال و آثار

ہندوستان کے صوبہ یو.پی میں شاہدرہ دہلی اور سہارنپور ریلوے لائن پر مظفر نگر سے ۵۰، دہلی سے ۶۴ اور سہارنپور سے ۶۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ایک قصبہ ہے جسے "کاندھلہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چالیس پچاس ہزار نفوس پر مشتمل یہ قصبہ برگ و گل کے اعتبار سے زرخیز اور افراد کے اعتبار سے مردم خیز ہے۔

بارہویں، تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں جس قدر اہل علم و فضل اس قصبہ کی خاک سے اٹھے، وہ شرف کسی اور قصبہ کو حاصل نہ ہو سکا۔ بقول احسان دانش "کاندھلہ میں متعدد شاعر بھی تھے، اور جید مولوی بھی، انگریزی کے فارغ التحصیل فضلاء بھی اور اصول و عقیدہ سے انگریزی کو گناہ خیال کرنے والے صاحب نظر بھی، نیز پرانی فیشن کے وہ علماء بھی جن کی علمیت کے باعث بڑی بڑی درس گاہیں، اور دنیا بھر کے دارالعلوم کاندھلہ کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ جس روشن ضمیر نے مثنوی مولانائے روم کا ساتواں دفتر لکھا وہ بھی اسی قصبہ کی خاک سے اٹھا تھا"

کاندھلہ کے ارباب علم و فضل کی ایک طویل فہرست ہے، جسے اس وقت چھیڑنا طوالت کا باعث ہوگا، کاندھلہ کے انہی علماء و فضلاء کے باعث دنیائے علم و دانش میں دیوبند اور علی گڑھ کی طرح کاندھلہ کا نام بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحؒ کا تعلق بھی اسی مردم خیز قصبہ سے ہے۔ اگرچہ آپ کی جائے پیدائش بھوپال ہے لیکن آپ کا وطن مالوف کاندھلہ ہے۔ مقدمۃ التفسیر میں مولانا نے خود اس بات کی صراحت فرمائی۔

"بھوپال میری جائے ولادت اور کاندھلہ میرا وطن ہے"

شہر بھوپال میں مولانا ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ ۲۰ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اس طرح آپ صدیقی النسب ہیں، آپ مثنوی مولانا روم کے ساتویں دفتر کے مؤلف مولانا مفتی الٰہی بخش کی اولاد میں ہیں۔

تعلیم و تربیت

خاندانی روایات کے مطابق مولانا نے قرآن کریم حفظ کیا۔ کاندھلہ میں قرآن کریم کی تکمیل کے بعد آپ کے والد مولانا حافظ محمد اسمٰعیل کاندھلوی رحؒ آپ کو تھانہ بھون لے گئے اور وہاں مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ کے مدرسہ اشرفیہ میں آپ نے درس نظامی کی ابتدائی کتب پڑھیں

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولوی عبداللہ، مؤلف تیسیر المنطق سے آپ نے کسب فیض کیا۔ مولانا تھانوی کے مدرسہ میں چونکہ صرف ابتدائی تعلیم کا اہتمام تھا اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے مولانا آپ کو سہارنپور لائے اور مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم میں داخل کیا۔ مظاہر العلوم میں آپ نے مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حافظ عبداللطیف، مولانا ثابت علی جیسے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا اور ۱۹ برس کی عمر میں سند فراغ حاصل کی مظاہر العلوم سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد ذوق پیدا ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں بھی جو عالَمِ اسلام کی مقتدر ہستیوں کا مرکز تھا، دورۂ حدیث کیا جائے چنانچہ مظاہر العلوم سے سند فراغ حاصل کرکے دوبارہ دورہ حدیث کیا، اور مولانا علامہ انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین دیوبندی، اور مفتی عزیز الرحمٰن رحمہم اللہ جیسے اجلاء محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

تدریسی زندگی

۱۳۳۸ھ ۱۹۲۱ء سے آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مفتی محمد کفایت اللہ کے قائم کردہ مدرسہ امینیہ دہلی سے آپ نے تدریس شروع کی اور ایک سال بعد ہی ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دیوبند میں تدریس کی دعوت دی۔ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی تدریس ایک بڑا اعزاز تھا، مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا اور دیوبند فروکش ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعزاز کو اس طرح دوآتشہ کیا کہ ایک سال قبل جن کبار اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا، انہی کے پہلو میں بیٹھ کر ان سے حاصل کردہ فیض کو عام کرنا شروع کردیا۔ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے سال اول ہی میں آپ نے فقہ کی اعلیٰ ترین کتاب الہدایہ، ادب کی ایک اہم کتاب مقاماتِ حریری جیسی مشکل کتب پڑھائیں۔ دارالعلوم دیوبند سے یہ تعلق کم وبیش نو سال قائم رہا۔ اس دوران نمازِ فجر کے بعد نودرہ میں درس قرآن دیتے جس میں دارالعلوم کے متوسط اور اعلیٰ درجات کے طلباء حتی کہ بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ اسی درس کی بناء پر آپ کو بیضاوی اور تفسیر ابن کثیر پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم چھوڑ کر حیدرآباد دکن آگئے۔

حیدرآباد دکن میں قیام

حیدرآباد دکن کا نو برس پر مشتمل قیام آپ کی زندگی میں اس اعتبار سے تاریخی گردانا جاتا ہے کہ وہاں قیام کے دوران آپ نے عظیم الشان کتاب التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح تالیف کی۔ حیدرآباد دکن میں قیام کے دوران دنیائے علم کے ایک عظیم کتب خانہ، کتب خانہ آصفیہ میں موجود بعض نادر مخطوطات سے استفادہ کیا جن میں تورپشتی کی المفاتیح شرح مصابیح سب سے اہم ہے۔ جس سے آپ نے تعلیق میں استفادہ کیا اور بعض مقامات پر سیرۃ المصطفیٰ میں بھی اس کے حوالہ جات موجود ہیں۔ حافظ تورپشتی کی یہ کتاب مصابیح کی ایک بلند پایہ شرح ہے جس کا مخطوط نسخہ دنیا میں صرف کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں

علامہ شبیر احمد عثمانی، صدر مہتمم اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہوتے تو ان حضرات نے آپ کو بحیثیت شیخ التفسیر دارالعلوم آنے کی دعوت دی جو آپ

نے قبول کرلی اور حیدر آباد دکن کے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ پر ستر روپے ماہانہ کی دارالعلوم کی تدریس کو ترجیح دی۔ اور ۱۹۳۹ء میں دوبارہ دارالعلوم آگئے۔ دارالعلوم میں یہ قیام ہجرتِ پاکستان تک (دس سال) رہا اور وہاں آپ نے تفسیر بیضاوی، تفسیر ابن کثیر، سنن ابی داؤد اور طحاوی کی مشکل الآثار جیسی امہات الکتب پڑھائیں۔

پاکستان، ہجرت

مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور اس کے بعد پورے برصغیر میں مسلمانوں کے لیئے علیحدہ مملکت کے حصول کے لیئے بھرپور تحریک شروع ہوگئی۔ مولانا نے اگرچہ عملاً تو سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن آپ دوقومی نظریہ کے زبردست حامی تھے، سیرۃ المصطفٰے میں بھی جہاد کی بحث میں دوقومی نظریہ پر مدلل اور علمی گفتگو کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ مئی ۱۹۴۹ء میں مولانا نے پاکستان ہجرت کرنے کا ارادہ کرکے بادلِ ناخواستہ دارالعلوم دیوبند سے استعفٰی دے دیا۔ اس موقع پر آپ کو دارالعلوم ہاٹھ ہزاری چاٹگام، مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی جانب سے بحیثیت شیخ الحدیث آنے کی دعوت دی گئی لیکن آپ نے مغربی پاکستان آنے کو ترجیح دی اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں ریاست بھاولپور کی دعوت پر آپ پاکستان آگئے اور جامعہ عباسیہ بھاولپور میں بحیثیت شیخ الجامعہ تدریسی خدمات کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا۔

جامعہ عباسیہ بھاولپور سے وابستگی

۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو آپ نے جامعہ عباسیہ میں بحیثیت شیخ الجامعہ چارج لیا۔ جامعہ عباسیہ میں عصری و دینی تعلیم کے اختلاط کی وجہ سے روحانیت اور للٰہیت نہ تھی جو دینی مدارس کا خاصہ ہوتی ہے، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کو وہاں کا یہ ماحول اور مادی دوڑ پسند نہ آئی اور جلد ہی طبیعت میں تکدّر پیدا ہوگیا۔

جامعہ اشرفیہ لاہور سے تعلق

۱۹۵۱ء کے اوائل میں مولانا جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے اور یہاں خطاب فرمایا، مولانا مفتی محمد حسن کی نظر انتخاب نے مولانا کو جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کے طور پر منتخب کرلیا۔ چنانچہ بھاولپور واپس جانے کے بعد ایک خط میں مولانا کو جامعہ اشرفیہ آنے کی دعوت ان الفاظ میں دی۔

"میں آپ کو پلاؤ اور بریانی چھوڑ کر دال روٹی کی دعوت دے رہا ہوں"

مولانا نے دال روٹی کی اس مخلصانہ دعوت کو بصد اخلاص قبول کیا، مفتی صاحب نے دل کی گہرائیوں سے جو بات کہی تھی، مولانا کے دل پر اثر کرگئی اور مولانا ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو جامعہ عباسیہ سے کم مشاہرہ پر جامعہ اشرفیہ آگئے اور پھر عمرِ عزیز کے آخری لمحہ تک جامعہ اشرفیہ سے اپنا تعلق قائم رکھا۔

❁ ❁ ❁ ❁

وفات حسرت آیات

۲/ اگست ۱۹۷۳ء کی شب اچانک ہچکیاں آنی شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر اور اطبا معائنہ کے بعد اس بات پر متفق ہوئے کہ معدہ بہت کمزور ہوگیا ہے اور جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ کمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۲/ اگست ۱۹۷۳ء سے جولائی ۱۹۷۴ء تک کا یہ تمام سال اسی طرح کمزوری اور نقاہت میں گزرا۔ لیکن شدید مرض اور اضمحلال میں بھی درس بخاری کا سلسلہ بند نہ کیا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو شدید دورہ پڑا اور طبیعت پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اخیر وقت میں جب ذرا ہوش آتا تو کلمہ طیبہ کا ورد ہوتا اور یہ آیت تلاوت کرتے اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔ ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء ۸ رجب ۱۳۹۴ھ کو صبح صادق کے وقت طلوع آفتاب سے قبل علم کا یہ آفتاب و ماہتاب اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسی دن ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ خلف الرشید، والد محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس طرح اس پیکر علم و عرفان کو سپرد خاک کیا گیا۔ مولانا کی وفات حسرت آیات برصغیر میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اہل علم پر غم کا ایک پہاڑ بن گئی۔ مولانا کی وفات سے ایک ایسا علمی خلا پیدا ہوا کہ جو بعد میں پورا نہ ہوا۔

تصنیفی خدمات

تدریسی خدمات کا ایک مختصر خاکہ گذشتہ اوراق میں پیش کیا جاچکا ہے، درس و تدریس اور وعظ و خطبات کے علاوہ تحریر و تصنیف سے بھی مولانا نے دین متین کی لازوال خدمات سرانجام دی ہیں۔ تصنیف و تالیف میں مولانا کسی خاص میدان کے شہسوار نہیں بلکہ ہر میدان علم میں شہسواری کا ایسا ملکہ رکھتے ہیں کہ گویا زندگی ہی اس میدان میں گذری ہے۔

علم تفسیر، حدیث، عقائد و کلام، سیرت نبی کریم ﷺ، رد فرق باطلہ، غرض کہ ہر علمی میدان میں مولانا نے اپنی لازوال خدمات کے ایسے سنگ میل نصب کیے ہیں کہ جو رہتی دنیا تک قائم و دائم رہیں گے۔ مولانا کی تصانیف کے مفصل تذکرہ کا تو یہ موقع نہیں لیکن اختصار کے ساتھ آپ کی چند تصانیف کا تعارف پیش خدمت ہے۔

علم تفسیر۔ معارف القرآن

علوم و معارف کا ایک بھرپور خزینہ اور علماء متقدمین کے علوم کا ایک بہترین مجموعہ ہے، مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح، ربط آیات کا بیان، احادیث صحیحہ اور اقوال و آثار صحابہ و تابعین پر مشتمل تفسیری نکات، ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید، ان کے شبہات اور جوابات کلام الٰہی کی عظمت و شوکت، اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا بیان، یہ چند خصوصیات ہیں جو معارف القرآن میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء میں اس تفسیر کی تالیف کا آغاز کیا گیا اور ابھی سورۃ صافات کے اختتام تک پہنچے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ پھر سورۃ ص سے آخر تک بطور تکملہ مولانا محمد مالک کاندھلوی نے تحریر فرمائی۔ مولانا محمد مالک صاحب نے بھی مولانا ہی کے طرز و اسلوب کا تتبع کیا ہے۔

الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی

ساتویں صدی ہجری کے مفسر قرآن قاضی ناصر الدین ابو الخیر عبد بن عمر الشیرازی البیضاوی م ۶۸۵ھ کا نام علم تفسیر میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی مرتب کردہ تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل ہمیشہ علماء مفسرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے اور اس پر متعدد تعلیقات کی گئیں اور بہت سی شروح لکھی گئیں۔ ۲۰ شوال ۱۳۶۰ھ کو اس کتاب کی تالیف کا آغاز کیا گیا یہ تفسیر ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اور اس کا واحد مخطوطہ ادارہ اشرف التحقیق میں موجود ہے۔

بیضاوی کی توضیح اور اس کے ادق نکات کی تشریح میں یہ کتاب ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ طوالت واطناب سے گریز کیا گیا ہے اور نہ اس قدر اختصار سے کام لیا گیا کہ بیضاوی کے دقیق نکات وضاحت طلب رہ جائیں۔ اس مسودہ کی تدوین کے بعد اگر موزوں سائز پر طبع کرایا جائے تو تقریباً چار ہزار صفحات اس کی ضخامت ہوگی۔

مقدمۃ التفسیر

اصول وتاریخ تفسیر پر ایک جامع اور مفصل رسالہ ہے جو ابھی تک مخطوط شکل میں ہے۔

علم حدیث: تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری

بخاری کے مشکل مقامات خصوصاً تراجم ابواب جو امام بخاری کی ایک امتیازی شان ہے، کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ اس کے تین اجزاء طبع ہو چکے ہیں جبکہ بقیہ اجزاء ابھی طبع نہیں ہو سکے۔

التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح

ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب کی کتاب مشکوٰۃ المصابیح مجموعہائے حدیث میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ علماء نے اس کتاب کی جس قدر شروح لکھی ہیں، شاید کسی اور کتاب کو یہ سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔ مولانا نے اس کتاب میں مشکوٰۃ کی عمدہ اور آسان زبان میں بلیغ پیرایہ میں توضیح وتشریح کی ہے۔ مولانا کی حیات میں اس کتاب کے چار اجزاء دمشق اور باقی چار اجزاء پاکستان میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد یہ کتاب از سر نو سات جلدوں میں مکمل طبع ہوئی ہے۔

حجیت حدیث

حدیث کی قطعیت، اس کی حجیت اور اس کا مصدر شرعی ہونا اس پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں دلائل عقلیہ ونقلیہ سے بڑی بھرپور بحث کی ہے اور یہ کتاب منکرین حدیث کے لئے ایک مسکت جواب ہے

❊ ❊ ❊

علم عقائد و کلام، الکلام الموثوق فی ان کلام اللہ غیر مخلوق قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور کلام الٰہی کے غیر مخلوق اور قدیم ہونے پر مولانا نے اس رسالہ میں بھرپور علمی، تحقیقی اور مدلل گفتگو کی ہے اور معتزلہ و فلاسفہ کے غلط نظریات کی تردید کی ہے۔

احسن الحدیث فی ابطال التثلیث عیسائیت کے نظریۂ تثلیث کی تردید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بشریت پر ایک عظیم تحقیق ہے عیسائیت کے خلاف مولانا کے متعدد رسائل ہیں جن کو تدوین و تعلیق کے بعد شائع کیا جائے اور قوم کے ان بدنصیبوں کو پڑھایا جائے جو عیسائی مشنری سکولوں میں پڑھ کر اپنے ایمان و اسلام کو ضائع کر رہے ہیں۔

عقائد اسلام دین اسلام کے بنیادی و اساسی عقائد جن میں توحید و رسالت، قیامت اور ملائکہ پر ایمان شامل ہیں، پر مشتمل اردو زبان میں ایک منفرد کتاب ہے جو اس مسئلہ میں علمی بحث پر مشتمل ہے۔

علم الکلام مذہب اسلام کی خصوصیات، احوال قیامت، جنت و جہنم عالم برزخ، حوض کوثر کے وجود پر مدلل و محکم بحث پر مشتمل ہے۔

دستور اسلام اسلامی نظام حکومت کے بیان پر مشتمل ایک عمدہ کتاب ہے جس میں اسلامی نظام انتخاب، اقتصادی نظام اور تعلیمی نظام پر بحث کی گئی ہے اور نظام حکومت کی بنیادوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

خلافت راشدہ صحابہ کی عظمت پر ایمان، عقائد اسلامی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، مولانا نے اپنی اس کتاب میں خلافت راشدہ پر علمی بحث کی ہے۔

سیرۃ المصطفٰے مولانا کی خدمات دینی و علمی میں سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ایک تابندہ ستارہ کی مانند ہے۔ آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ قبولیت عامہ سیرۃ المصطفٰے کو حاصل ہوئی۔

اس کتاب کے متعلق مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں "جو شخص اردو کی ضروری استعداد رکھتا ہو کتاب مذکور کے مطالعہ یا درس سے محروم نہ رہے"۔ ان کتب کے علاوہ مولانا کی بہت سی دیگر مؤلفات ہیں جن کو خوف طوالت سے ترک کر دیا گیا

محمد سعد صدیقی

حضرت کاندھلویؒ کے دست مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ

وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ

اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ

الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا

لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ

حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا

عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ

حضرت کاندھلویؒ کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

لطائف و معارف

اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق کی جو فضیلت نکلتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے واقعی واقعۂ غار میں انکی جان نثاری قابل صد آفرین ہے یارِ غار کی مثل جو دنیا میں مشہور ہے وہ یہیں سے چلی ہے حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابوبکر مجھے صرف غار کی فضیلت دیدیں اور مجھ سے تمام عمر کی عبادت اور نیکیاں لے لیں تو میں اسپر راضی ہوں

امت مرحومہ کا [strikethrough] اسپر اتفاق ہے کہ اسوقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار صرف حضرت صدیق تھے حتیٰ کہ مخالفین بھی اس کے مقر اور معترف ہیں پس یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو حضرت صدیق کی شان عظمت کو واضح کر رہی ہے اور اگر عند اللہ آپکو شرف قبولیت حاصل نہ ہوتا تو آپکی اس فضیلت

معارف القرآن اور اسکے مؤلف کے بارے میں

زیرِ نظر تفسیر (جس کی پہلی جلد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ کے ہاتھوں میں ہے) حضرت مولانا حافظ محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ کے علمی جلالتِ شان واخلاص کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تفسیر اور صاحبِ تفسیر کے بارے میں میرا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھلانے والی بات ہے تاہم تفسیر ہٰذا میں غور کرنے والوں کو علوم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آئے گا۔ اس بات کا اندازہ اہلِ علم حضرات مطالعہ کے بعد کر سکیں گے۔ اس بارے میں اگر مختصراً یوں کہا جائے تو جامع تبصرہ ہوگا کہ یہ تفسیر سلف صالحین اور علماءِ متاخرین کے علوم ومعارف کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ اسمیں ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شامل کیا ہے۔ لفظی ترجمہ کے بعد رواں ترجمہ ہے جس میں ضروری تشریحات کی گئی ہیں۔

حضرت مولف رح کو آیات اور سورتوں میں ربط کا خاص ذوق تھا اس ذوق کو اپنی تفسیر میں پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے آیات کی ضروری تشریح کے بعد فائدہ کے عنوان سے اسرار ونکات بیان کیئے ہیں اور جا بجا فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی ہے حضرت مولف رح جہاں ایک طرف حافظ ابن کثیر، امام قرطبی، امام فخرالدین رازی اور علامہ سید محمود آلوسی رحمہم اللہ کے اقوال نقل کرتے ہیں وہاں شیخ محی الدین ابن عربی، حضرت حسن بصری رح اور مولانا روم رح کے صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی نقل کرتے ہیں۔ نیز جا بجا شکوک وشبہات کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں تمام کتب تفسیر آپ کے پیشِ نظر ہیں اور مختلف ائمہ تفسیر اور مفسرین کے اقوال نقل کرکے آخر میں قول راجح بیان کرتے ہیں ماخذ میں سب سے زیادہ علامہ آلوسی رح کی روح المعانی اور امام رازی رح کی تفسیر کبیر پر بھروسہ کیا ہے۔

حضرت مولف رح کی تفسیر وحدیث اور علم کلام میں گرانقدر تصانیف اس بات کا بین اور واضح ثبوت ہیں کہ ہر فن میں آپ کا مقام بہت بلند تھا لیکن اپنے شیخ ومربی حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح تفسیر قرآن کریم اور علوم کتاب اللہ کی شرح وتحقیق کا رنگ سب پر غالب تھا اسی جذبہ وشوق میں تفسیر معارف القرآن شروع فرمائی جو اپنے موضوع پر ایک بے مثال تفسیر ہے اور تمام متقدمین کے علوم ومعارف کا ایک جامع خزانہ ہے۔ اس تفسیر کے ساتھ حضرت مولف رح کے قلبی لگاؤ اور شغف کا یہ عالم تھا کہ اخیر حیات میں جب کہ ضعف ونقاہت کی کوئی حد نہیں رہی تھی حتیٰ کہ اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ تھی لیکن اس ضعف کے باوجود بھی تفسیر کا سلسلہ برابر جاری رہا دن رات یہی فکر تھی کہ کسی طرح تفسیر مکمل کر لوں وفات سے کچھ عرصہ قبل کی بات ہے کہ جب مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مولف کے صاحبزادے) رمضان المبارک میں عمرہ کے لیئے جا رہے تھے تو ان کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں والہانہ انداز میں تکمیل تفسیر کے لیئے دعا کا ذکر فرماتے ہوئے یہ الفاظ تحریر فرمائے تھے "میرا دل ازحد پریشان ہے سوائے تفسیر کے کسی چیز میں دل نہیں لگتا اس لیئے سب سے فارغ اور یکسو ہونا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تفسیر اور شرح بخاری کو جلد مکمل فرمادیں اور اس کی طباعت کا غیب سے انتظام

فرماویں" اللہ تعالیٰ حضرت مؤلفؒ کی اس عظیم خدمت کو قبول فرماویں آمین

حضرت مولفؒ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ کو بھوپال شہر میں (جب کہ آپ کے والد صاحبؒ وہاں مقیم تھے) پیدا ہوئے آپ کا اصل وطن کاندھلہ تھا آپ کے والد صاحب کا نام مولانا محمد اسمٰعیل کاندھلوی صدیقی ہے۔ والد کی طرف سے آپ کا شجرۂ نسب خلیفۂ اول یارِ غار سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔

آپ نے ۹ برس کی عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا اور ۱۹ برس کی عمر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور (انڈیا) سے سند فراغ حاصل کی اور پھر دوسری مرتبہ دار العلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کر کے سند حاصل کی۔

ایک سال مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس رہے پھر ۱۹۲۲ء میں دار العلوم دیوبند میں مدرس ہوئے اور پھر بعض وجوہات کی بنا پر وہاں سے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ دار العلوم دیوبند میں بحیثیت شیخ التفسیر آپ کا تقرر ہوا عرصہ دس سال آپ اس منصب پر فائز رہے قیام پاکستان کے بعد جب آپ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تو جامعہ عباسیہ بھاولپور میں بحیثیت شیخ الجامعہ (پرنسپل) آپ کا تقرر ہوا وہاں کے ماحول میں آپ جو توقعات لے کر گئے تھے جب وہ پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو آپ نے اسے بھی خیرباد کہہ دیا اور پھر مستقل طور پر جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور تشریف لائے یہاں تک کہ جب ۷۴ برس کی عمر میں جولائی ۱۹۷۴ء کو آپ نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی تو آپ مدرسہ ہٰذا کے روحِ رواں اور شیخ الحدیث والتفسیر تھے۔

غرض حضرت مولفؒ اس صدی کے مایہ ناز محدث و شیخ الحدیث والتفسیر تھے آپ کی تمام زندگی ہی علم اور دین کی خدمت میں گذری علوم اسلامیہ میں شغف وانہماک اور تصنیف وتالیف ہمیشہ سرمایۂ حیات رہی۔ حضرت مؤلف کی علمی جلالتِ شان کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب آپ اپنی مشہور ومعروف کتاب "التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح" کی طباعت کے سلسلہ میں دمشق تشریف لے گئے اور وہاں ایک سال قیام کیا تو شام وعراق اور مصر کے اکابر علماء نے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا اور اپنی تحریرات میں خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا کہ آپ عرب وعجم کے ایک مایہ ناز محدث ومفسر ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ حافظ قرآن تھے، مجود تھے، مفسر وشارح تھے اسرار وارد ہونے والے شکوک وشبہات کے جواب دینے والے تھے، واعظ تھے، صوفی تھے، آخر میں اس قطعہ پر بات ختم کرتا ہوں۔

قطعہ:

علم میں تھے شاہِ انورؒ فکر میں اشرف علیؒ
اللہ اللہ کیا شؤں تھے حضرت ادریسؒ میں

درسِ قرآں میں وہ بیضاویؒ پہ سبقت لے گئے
علم کے دریا رواں تھے آپ کی تدریس میں

عبدالمنان

خادم الافتاء والتدریس دار العلوم حسینیہ شہداد پور سندھ پاکستان

۲۶ شعبان ۱۴۱۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدٍ عَبۡدِہٖ وَرَسُوۡلِہٖ سَیِّدِ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ وَعَلٰۤی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَاَزۡوَاجِہٖ وَذُرِّیَّاتِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ وَعَلَیۡنَا مَعَہُمۡ یَاۤ اَرۡحَمَ الرّٰحِمِیۡنَ

حمد بے حد اور سپاس بے قیاس خاص تیرے ہی لئے ہے اے خداوند ذوالجلال کہ تونے ہم کو وجود عطا کیا اور ایمان اور اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا اور سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہم کو پیدا کیا اور قرآن سکھایا تاکہ دل روشن ہو اور اظہار مافی الضمیر اور بیان کے لئے زبان عطا کی تاکہ تیرا کلام پڑھ سکیں اور تیرا نام لے سکیں اور تیرے حکموں کو گاتے اور بجاتے پھر سکیں۔ اور ہزاراں ہزار صلاۃ وسلام ہو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کے ذریعہ ہم نابکاروں اور ناہنجاروں کو تیرا پیغام پہونچا اور جن کے ذریعہ ہم گم گشتگان راہ کو تجھ تک پہونچنے کا راستہ معلوم ہوا اور ہزاراں ہزار رحمتیں اور برکتیں ہوں حضور پرنور کے آل واصحاب پر جنہوں نے بلاکم وکاست نہایت امانت ودیانت اور کمال حفاظت کے ساتھ تیرے کلام کو اور تیرے پیام اور تیرے دین کو اور تیرے رسول کی شریعت کو لوگوں تک پہونچایا اور دنیا میں تیرے دین کا ڈنکا بجایا اور تیرے دشمنوں سے جہاد وقتال کیا اور تیری راہ میں اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کو پانی کی طرح بہایا اور اپنے اہل وعیال کو تجھ پر اور تیرے رسول پر قربان کیا حتی کہ تیرے دین کو سربلند کیا اور کفر کو سرنگوں کیا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

اور ہزاراں ہزار رحمتیں ہوں ان علمائے دین پر جنہوں تیرے عطا کردہ نور فہم اور نور تقویٰ سے کتاب وسنت کے حقائق ودقائق کو اور شریعت کے لطائف ومعارف کو ایسا روشن کیا کہ جس کو دیکھ کر دنیا حیران ہے اور کسی امت میں یہ جرأت نہیں کہ وہ امت محمدیہ جیسے مفسرین اور محدثین اور فقہاء ومتکلمین اور اولیاء اور عارفین کے مقابلہ میں توریت وانجیل کا مفسر اور محدث اور فقیہ اور متکلم اور صوفی اور مفتی پیش کرسکے کہ وہ علماء اسلام کی طرح توریت وانجیل کی تفسیر کرتا ہو اور توریت وانجیل کی روشنی میں اپنے ہم مذہبوں کو فتوے دیتا ہو اور حلال وحرام سے انکو آگاہ کرتا ہو۔ یہود اور نصاریٰ میں اگر کچھ ہمت ہے تو کرۂ ارضی کے کسی گوشہ میں توریت اور انجیل کا کوئی پکا کچا حافظ یا چھوٹا موٹا مفسر اور محدث اور مفتی ہو تو نکال کر

لائیں اور دنیا کو دکھلائیں۔

اے اللہ تو اپنی رحمت اور عنایت سے اس نابکار و نا ہنجار حرف نگار کو ان علماء ربانیین کے زمرہ میں داخل فرما جنہوں نے تیرے کلام کی خدمت کی اور اس کی تفسیریں لکھیں اور میرے والدین پر بھی رحمت فرما جنہوں نے اس ناچیز کو قرآن کریم حفظ کرایا اور دین کا علم سکھایا ؎

روح پدرم شاد کہ می گفت باستاد

فرزند مرا عشق بیاموز و دگر ہیچ

اور اے اللہ مجھ کو اور میری اولاد کو اور اولاد الاولاد کو اپنے علم کا صحیح وارث بنا اور ہمارے ظاہر و باطن کو اپنے دین کے رنگ سے رنگین فرما اور صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃً کا صحیح مصداق بنا آمین یارب العالمین۔

اما بعد

بندۂ ناچیز حافظ محمد ادریس بن مولانا حافظ محمد اسمٰعیل کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جو نسباً صدیقی اور مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی ہے۔ اہل اسلام کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیئے سرور عالم سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا پس عام بندوں پر اس کا سمجھنا اور علماء پر اس کا سمجھانا فرض ہوا تاکہ خدا تعالیٰ کے حکموں اور اس کی اتاری ہوئی ہدایتوں پر عمل کر کے فریضۂ بندگی بجا لاسکیں جو بندہ خدا تعالیٰ کے حکموں کو نہ جانے اور بندگی نہ بجا لائے تو وہ بندہ نہیں بلکہ وہ گندہ ہے۔ قرآنِ کریم عربی زبان میں اُترا جس کا ہندوستان کے عوام کو سمجھنا بہت مشکل تھا اس لئے ہندوستان میں سب سے پہلے عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ۱۱۵۰ھ میں کلام اللہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جس کا نام "فتح الرحمٰن" رکھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان بکثرت فارسی زبان سمجھتے تھے اور خط و کتابت اکثر و بیشتر فارسی میں ہوتی تھی اور سرکاری مراسلے سب کے سب فارسی میں ہوتے تھے اس لئے شاہ صاحبؒ نے لوگوں کی سہولت کے لیئے فارسی میں ترجمہ کیا بعد ازاں فارسی کا رواج کم ہوتا چلا گیا اور ضرورت اس کی ہوئی کہ اردو زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا جائے چنانچہ شاہ ولی اللہ کے ترجمہ کے پچپن سال بعد ۱۲۰۵ھ میں ان کے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر دہلوی نے اردو میں قرآنِ کریم کا بامحاورہ ترجمہ کیا مگر اس کا پورا پورا لحاظ رکھا کہ محاورہ۔ مدلولِ قرآنی کے تابع رہے ایسا نہ ہو کہ مدلولِ قرآنی کو محاورۂ زبان پر قربان کر دیا جائے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا ترجمہ تھا جو نہایت عمدہ ہے اور بے مثال

علہ والد صاحب مرحوم یعنی مولانا حافظ محمد اسمٰعیل نے بتاریخ ۱۹ شوال شب جمعہ ۱۳۶۱ھ بمقام قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر انتقال فرمایا اور جمعہ کی نماز کے بعد عیدگاہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ ربنا اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب آمین

اور بے نظیر ہے اور ہر طرح سے قابل اطمینان اور قابل وثوق واعتماد ہے اور علماء ربانیین کے نزدیک مستند اور معتمد ہے شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے علاوہ ترجمہ کے مختصر اور ضروری فوائد بھی لکھے ہیں جو مشکلات میں مشعل راہ کا کام دیتے ہیں اور جن مشکل مقامات میں اکابر علماء کا قلم خاموش نظر آتا ہے وہاں شاہ عبدالقادر کا قلم بولتا ہے اور بالبداہت اس شعر کا مصداق نظر آتا ہے ؎

بینی اندر خود علوم اولیاء ٭ بے کتاب و بے معید و اوستا

اور اس ترجمہ کا نام "موضح القرآن" رکھا جو اس کی صفت بھی ہے اور تاریخ بھی۔ شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۲۳۰ھ میں بمقام دہلی وفات پائی۔[1]

دوسرا اردو ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحبؒ دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ نے کیا مگر شاہ رفیع الدین کا ترجمہ تحت اللفظ تھا کہ جو ترتیب الفاظ قرآنی کی ہے وہی ترتیب اردو ترجمہ کے الفاظ کی رہے تاکہ کم استعداد والے کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کس لفظ کا ترجمہ ہے اسی امر کو ملحوظ رکھ کر شاہ رفیع الدین نے لفظی ترجمہ فرمایا اور یہ امر ایک درجہ میں بہت مشکل ہے کہ اردو ترجمہ میں الفاظ قرآنی کی ترتیب بھی ملحوظ رہے اور تاحد امکان اردو زبان کی فصاحت بھی ملحوظ رہے الغرض اس مصلحت کی بناء پر شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ لفظی تھا اور شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بامحاورہ تھا تاکہ قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے اور مطلب بخوبی ذہن میں آجائے اس لیے کہ جو سہولت فہم بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے وہ لفظی ترجمہ سے حاصل نہیں ہو سکتی اگرچہ تحت اللفظ ترجمہ کرنا اور ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یہ بھی بہت بڑا کمال ہے لیکن آسانی سے مطلب سمجھنا جو بامحاورہ ترجمہ سے ممکن ہے وہ تحت اللفظ ترجمہ سے ممکن نہیں غرض یہ کہ شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ ترجمہ کیا جو عجب شان رکھتا ہے کہ جس کے الفاظ۔ فصاحت و بلاغت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کے تحت معانی کا ایک سمندر موجزن ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر قرآن اردو زبان میں نازل ہوتا تو انہی محاورات اور الفاظ کے لباس میں نازل ہوتا جو شاہ عبدالقادر نے استعمال کیے ہیں

اسی عرصہ میں شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز نے ۱۲۰۸ھ میں فارسی زبان میں ایک مبسوط تفسیر لکھنی شروع کی جو حقائق و معارف میں بلاشبہ امام رازی کی تفسیر کبیر کا نمونہ تھی کاش کہ مکمل ہو جاتی مگر افسوس کہ مکمل نہ ہو سکی ایک حصہ میں صرف پارہ الٓمّٓ اور پارۂ سیقول کی آیت وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ تک تفسیر آئی اور دوسرے حصہ میں پارۂ تبارک الذی اور پارۂ عم کی تفسیر آئی۔ درمیان قرآن کی تفسیر نہ ہو سکی اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو بسیط ارض پر اس تفسیر کی نظیر نہ ہوتی جیسا کہ تفسیر عزیزی کے موجودہ حصہ کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے دقیق اور عمیق علوم کسی اور تفسیر میں نظر نہیں آتے۔

---

[1] مرآۃ التفسیر صفحہ ۶۴ مصنفہ مولانا ذوالفقار احمد میں شاہ عبدالقادر کی تاریخ وفات ۱۲۳۰ھ لکھی ہے اور صاحب حدائق الحنفیہ نے یہ لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی اور منظور الٰہی تاریخ وفات ہے۔ دیکھو حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷ واللہ اعلم

شاہ عبدالعزیزؒ[عله] نے ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی نمازِ جنازہ بیرونِ شہرِ دہلی ادا کی گئی۔ اطراف واکناف سے آنے والوں کے ہجوم کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا پچپن مرتبہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اور دہلی کے ترکمان دروازہ کے باہر اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں فارسی اور اردو میں ترجمہ اور تفسیر لکھنے کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ کے وقت سے شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ ۱۱۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵۰ھ میں فارسی میں قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا جس کا نام "فتح الرحمٰن" رکھا اور ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ "مقتدائے دقیقہ شناس" تاریخِ وفات ہے۔

تفسیر قرآن کا پہلا وہ بنیادی پتھر اس کا وہ صحیح ترجمہ ہے جو قواعدِ عربیت اور قواعدِ شریعت کے پورا پورا مطابق ہو ہندوستان میں تفسیر قرآن کا یہ سنگِ بنیاد یعنی صحیح ترجمۂ قرآن۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں رکھا گیا اور ہندوستان میں یہ خیر کثیر (ترجمۂ قرآن کریم) اس مبارک باپ اور مبارک بیٹوں کے ہاتھوں سے جاری ہوئی اور یہی تین ترجمے اردو زبان میں تفسیر قرآن کے لئے سنگِ بنیاد بنے اور ہندوستان میں کوئی عالم ان ترجموں سے بہتر ترجمہ نہ کر سکا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ بعن الاسلام وسائر المسلمین خیرا آمین یارب العالمین۔

غرض یہ کہ یہ حضرات ترجمۂ قرآن کے بانی اور امام ہیں اور علومِ دینیہ میں تمام ہندوستان کے استاد ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اگر یہ تین ترجمے نہ ہوتے تو ہر کس وناکس کو ترجمہ کا حوصلہ بھی نہ ہوتا اس لیے کہ کسی کے کلام اور مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ترجمہ ہے اور یہ کام نہایت دشوار ہے جب تک مترجم دونوں زبانوں کے لغات اور محاورات اور استعارات وکنایات اور حقیقت ومجاز اور اسالیبِ کلام سے پورا واقف نہ ہو تو ترجمہ نہیں کر سکتا ہر کس وناکس کا تو کیا ذکر ہے۔ اگر ان حضرات کے یہ تراجم نہ ہوتے تو بڑے سے بڑے علماء کو ترجمہ دشوار ہو جاتا اور شاید بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کے بعد بھی ایسا ترجمہ نہ کر سکتے۔ ان حضرات جیسا نورِ فہم اور نورِ تقویٰ کس کے پاس ہے جو ان جیسا ترجمہ کر سکے۔ ان تین ترجموں کے بعد جس کسی نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا سو اس نے شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کی مدد اور سہارے سے کیا۔ حق جل شانہ نے اپنے کلام پاک کی اس خدمت یعنی ترجمہ کے لیے سرزمینِ ہند سے شاہ ولی اللہ اور اس کے بیٹوں کو منتخب فرمایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

بحمدہٖ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ پہلی منزل یعنی ترجمہ کی منزل گذر گئی اور ہندوستان کے مسلمان

عله شاہ عبدالعزیزؒ کا تاریخی نام غلام حلیم ہے جس سے ۱۱۵۹ھ نکلتا ہے یہی آپ کا سن ولادت ہے۔ تحفۂ اثنا عشریہ کے دیباچہ میں غلام حلیم کے نام سے اپنے کو مؤلف کتاب ظاہر کیا ہے علوم وفنون اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ سے حاصل کیے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے نوّے سال کی عمر میں وفات پائی۔

کے ہاتھوں میں ان تین علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کے تین نہایت صحیح اور بے مثال ترجمے پہونچ گئے تو اب اس منزل کے طے ہو جانے کے بعد ضرورت اس کی تھی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے جس میں فقط حل مطالب اور ربط آیات کا خاص اہتمام کیا جائے اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی طرح اقوال مختلفہ میں سے ارجح الاقوال پر اکتفاء اور اقتصار کیا جائے اور لطائف او رنکات اور مذاہب باطلہ کی تردید کی تفصیل سے گریز کیا جائے تاکہ خاص و عام اس سے نفع اٹھا سکیں ۔

یہ خدمت اور یہ سعادت من جانب اللہ حکیم الامت حضرت مولانا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہٗ کے حصہ میں آئی اور بیان القرآن کے نام سے ۱۳۲۵ھ میں ایک تفسیر لکھی جو اپنی افادیت اور جامعیت اور مقبولیت میں ثریٰ سے ثریا تک پہونچ گئی ۔

اور اسی زمانہ میں "بیان القرآن" سے کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے "فتح المنان" کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور رہے جس میں مختصر حل القرآن و توضیح مطالب کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید پر بھی کلام فرمایا اور فلسفہ قدیم وجدید کے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات دیئے یہ تفسیر بھی بحمدہ تعالیٰ بہت مقبول ہوئی اور گم گشتگان راہ کے لیے مشعل ہدایت بنی مگر تفسیری حیثیت سے مطالب قرآنیہ کی بالاستیعاب توضیح اور مسلسل تشریح اور ربط آیات اور حل مشکلات اور بیان معانی میں جو نرالی شان "بیان القرآن" کو حاصل ہوئی وہ اردو زبان میں کسی اور تفسیر کو حاصل نہیں ہوئی وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۔

اور اسی طرز پر ایک نہایت مختصر اور جامع تفسیر جو جدید شبہات کے قلع قمع کے لیئے کافی اور شافی ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی قدس اللہ سرہٗ نے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی ۔ اور فصاحت و بلاغت اور حسن تعبیر کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے ۔

بحمدہ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ دو منزلیں اور طے ہو گئیں اول صحیح ترجمہ دوم مختصر اور جامع تفسیر جس سے قرآن کریم کے مطالب اور معانی بخوبی و آسانی سمجھ میں آسکیں تو اب ضرورت اس کی ہوئی کہ بیان القرآن کے طرز پر ایک ایسی تفسیر لکھی جائے جو مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح اور ربط آیات کے علاوہ قدرے احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہ و تابعین پر اور بقدر ضرورت لطائف و معارف اور نکات اور مسائل مشکلہ کی تحقیقات اور ملاحدہ و زنادقہ کی تردید اور ان کے شبہات اور اعتراضات کے جوابات پر بھی مشتمل ہو تاکہ کلام خداوندی کی عظمت و شوکت اور اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا کچھ نمونہ نظروں کے سامنے آجائے پھر یہ کہ وہ ترجمہ اور تفسیر سلف صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر ہٹا ہوا نہ ہو عہد نبوت اور عہد صحابہ و تابعین سے لے کر اس وقت تک امت کے علماء ربانیین اور راسخین فی العلم نے جس طرح قرآن کریم کا مطلب سمجھا ہے اسی طرح اس امانت کو بلا کسی خیانت کے مسلمانوں تک پہونچا دیا جائے اور کسی جگہ بھی اپنی رائے اور خیال اور نظریہ کو قرآن کے بہانہ سے پیش کر کے مسلمانوں کو دھوکہ اور فریب نہ دیا جائے جیسا کہ

آج کل آزاد منشوں کا یہ طریقہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیریں لکھ کر اس لیے شائع کر رہے ہیں کہ تاویل و تحریف کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو مغربی تہذیب و تمدن کے مطابق کر دیں ان آزاد مفسروں کی ہمہ تن یہ کوشش ہوتی ہے کہ لفظ تو عربی ہوں اور معنی مغربی ہوں اور یورپ کے ملحدین کے خیالات باطلہ کو قرآن کے نام سے مسلمانوں میں پھیلایا جائے۔ غرض یہ کہ یہ گروہ قانونِ خداوندی کو مسخ کر رہا ہے اور اپنے حسب منشاء قرآن کے معنی گھڑ کر لوگوں میں شائع کر رہا ہے۔ اللھم احفظنا منھم۔

اے مسلمانو! خوب سمجھ لو یہ گروہ قرآن کریم کا مترجم اور مفسر نہیں بلکہ یورپ کے نفسانی تمدن کا مترجم اور مفسر ہے ان سے بچتے رہنا ناچیز نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے یہ تفسیر لکھنی شروع کی کہ جیسا مطلب قرآن کریم کا اللہ کے رسول نے اور صحابہ و تابعین نے سمجھا ہے وہی مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ لوگ صحیح طور پر قرآن کو سمجھ سکیں اور صحیح طور پر اس پر عمل کر سکیں بغیر علم صحیح کے عمل صحیح ناممکن ہے یہ ناچیز سلف صالحین کے اتباع کو سعادت سمجھتا ہے اور سلف کے مسلک سے ہٹ کر تفسیر کو ضلالت اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت سمجھتا ہے۔

تو مباش اصلاً کمال اینست و بس تو در و گم شو وصال اینست و بس

بحمدہ تعالیٰ اس فقیر و حقیر نے اسی التزام کے ساتھ تقریباً ۱۳۶۰ھ میں تفسیر لکھنی شروع کی مگر دیگر مشاغل کی بنا پر پابندی نہ ہو سکی جب موقعہ ملا کچھ لکھ لیتا۔ اور ارادہ یہ کیا کہ جس طرح صحابہ و تابعین اور سلف صالحین نے قرآن کریم کو سمجھا ہے بعینہٖ اسی طرح اس کو مسلمانوں تک پہونچا دیا جائے مغربیت اور عصریت کے نفسانی تقاضوں سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کے مدلول اور مفہوم کو نہ بدلا جائے۔

اور "مَعَارِفُ الْقُرْآن" اس تفسیر کا نام رکھا جو اس رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ میں سورۂ نساء کے ختم تک پہونچی و للہ الحمد والمنۃ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور عنایت سے باقی کی تکمیل فرمائے اور قبول فرمائے۔ آمین

اس حقیر و فقیر کی یہ تفسیر گداگروں کی جھولی کی طرح ہے جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے نوالوں سے لبریز ہے اور فقیروں کی گدڑی کی طرح ہے جس میں ناظرین کو رنگ برنگ کے پیوند نظر آئیں گے۔ اگر کوئی اس گدائے بے نوا سے پوچھے کہ تیرے پاس یہ قسم قسم کے کھانے اور رنگ برنگ کے اطلس و کمخواب کے ٹکڑے کہاں سے میسر آئے تو یہ ناچیز جواب میں یہ عرض کرے گا کہ میں تو گدائے بے نوا ہوں مگر بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہوں وہاں سے بھیک میں جو کھانے مل جاتے ہیں وہ لا کر دوستوں کے سامنے رکھ دیتا ہوں جس کو جو لقمہ اور نوالہ خوش ذائقہ معلوم ہو نوش جان کرے اور جو مرغوب طبع نظر آئے وہ تناول کرے یہی حال اس علم کے گدائے بے نوا کا ہے کہ اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے وہ سب کا سب خسروانِ علم و حکمت کے دروازوں سے ملی ہوئی بھیک ہے جو ایک دریوزہ میں جمع کر دی گئی ہے اور اکثر و بیشتر ان دروازوں کے نام بھی بتلا دیئے ہیں جہاں سے یہ فقیر بھیک مانگ کر لایا ہے تاکہ جسے اور کچھ مانگنا اور لینا ہو تو وہ خود ان دروازوں پر پہونچ جائے اس اظہار

حقیقت کے بعد امید ہے کہ احباب کرام اس ہیچمداں کو اس تالیف میں ایک دستر خوان بچھانے والے سے زیادہ نہ سمجھیں گے۔ اور گاہ بگاہ اس سُفرہ چین کو جو غرق معصیت ہے دعاء مغفرت سے نواز دیا کریں گے۔ آخر جو خادم دستر خوان بچھائے اور اس پر کھانے لاکر چنے اس کا بھی کچھ حق ہے۔ علمی سُفرہ چین کا حق یہ ہے کہ اس کے لیے یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازیں اور آخرت کی ذلت اور ندامت سے محفوظ رکھیں۔ آمین

عرض حال کے بعد اب یہ ناچیز اپنے خدائے پروردگار سے بصد ہزار عجز و نیاز ملتجی ہے کہ اس تفسیر کو اس فقیر و حقیر کے ہاتھ سے تکمیل کو پہونچائے اور اس کو قبول فرمائے۔ **آمین ثم آمین**۔ اور میرے لیے اور میرے والدین کے لیے اور میری اولاد جسمانی اور روحانی کے لیئے خصوصاً اور عام مسلمانوں کے لیے عموماً مفید اور نافع اور مشعل ہدایت بنائے آمین۔ اور اس تحریر سراپا تقصیر کو اس فقیر و حقیر کے لیے زاد معاد اور توشۂ آخرت اور ذخیر جاری اور ذریعۂ مغفرت اور سرمایۂ سعادت بنائے آمین یارب العالمین

ع ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

در قیامت ہر کسے در دست آرد نامۂ — من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

بندۂ ناچیز

محمد ادریس کان اللہ لہ وکان ہو للہ ووفقہ لما یحب ویرضاہ وجعل آخرتہ خیراً من اولاہ۔ آمین

۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ھ ہجری

جامعہ اشرفیہ لاہور
پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجازت نامہ

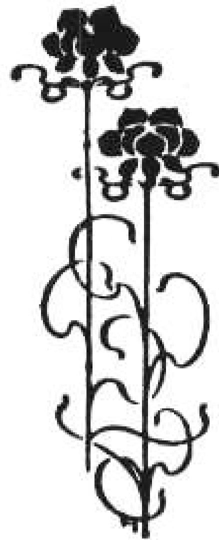
برائے اشاعت تفسیر معارف القرآن

قرآن پاک معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب جو کہ دارالعلوم الحسینیہ (رجسٹرڈ) شہداد پور والے حضرات نے خود دوبارہ لکھوایا ہے اور چھاپا ہے۔

ہماری طرف سے اجازت ہے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں کہ وہ اسکو چھپوائیں اور فروخت کریں۔

[illegible]

27/1/99


بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین جلد اوّل تفسیر "معارف القرآن"

سورۂ فاتحہ و بقرہ

آیاتہا ۷ — ۱: سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ : ۵ — رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۳

سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا¹ بہت مہربان نہایت رحم والا

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۴ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ

مالک انصاف کے دن کا تجھ ہی کو ہم بندگی کریں اور تجھ ہی سے

نَسْتَعِيْنُ ۝۵ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۶

مدد چاہیں چلا ہم کو راہ سیدھی

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ

راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے۔

سُورۂ فاتحہ کی تفسیر

سورۂ فاتحہ جمہور علماء کے نزدیک مکّی ہے بعض علماء اس کے مدنی ہونے کی طرف

¹ مترجم گوید یعنی عالم انس و عالم جن و عالم ملائکہ و علیٰ ہذا القیاس۔ فتح الرحمٰن

گئے ہیں مگر یہ قول شاذ ہے۔ ابتداء بعثت میں سب سے پہلے اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الخ چند آیتیں نازل ہوئیں جیسا کہ صحیحین میں ہے اور چند روز کے بعد پوری سورۃ فاتحہ مع بسم اللہ کے نازل ہوئی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور ابونعیم اور بیہقی کی دلائل النبوت میں عمرو بن شرجیلؓ سے مرسلاً مروی ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے یہ فرمایا کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو غیب سے کچھ آوازیں سنتا ہوں خدا کی قسم مجھ کو اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ نے فرمایا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کبھی آپ کے ساتھ ایسا نہ کرے گا۔ خدا کی قسم آپ امانتیں ادا کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت ابوبکر آ گئے۔ حضرت خدیجہ نے کہا اے ابوبکر تم محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ساتھ لیکر ورقہ کے پاس جاؤ اور یہ واقعہ بیان کرو۔ چنانچہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا ہاتھ پکڑ کر ورقہ کے پاس لے گئے۔ ورقہ نے آپ سے حال دریافت کیا اس پر آپ نے یہ فرمایا۔

فقال اذا خلوت وحدی سمعت نداء خلفی یا محمد یا محمد فانطلق ھاربا فی الارض فقال لا تفعل اذا اتاک فاثبت حتی تسمع ما یقول ثم ائتنی فاخبرنی فلما خلا ناداہ یا محمّد قل بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ. الحمد للّٰه ربّ العٰلمین حتی بلغ و لا الضالین قال قل لا الٰه الا اللّٰه فاتی ورقۃ فذکر ذلک له فقال له ابشر ثم ابشر فانی اشهد انک الذی بشر به ابن مریم و انک علی مثل ناموس موسی و انک نبی مرسل الحدیث (تفسیر درمنثور ص ۲ ج ۱ و تفسیر قرطبی ص ۱۱۵ ج ۱)

کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے غیبی آواز یا محمد یا محمد کی سنتا ہوں، جس کی دہشت سے بھاگنے لگتا ہوں۔ ورقہ نے کہا ایسا مت کرو ٹھہر کر اس کی بات سنو اور پھر جو کہے۔ اس کی آ کر مجھ کو خبر دو۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ایک جگہ تنہا تھے۔ کہ آواز آئی۔ اے محمد یہ پڑھئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین الی آخر السورۃ اس کے بعد کہا لا الٰہ الا اللہ کہو آپ یہ سب سن کر ورقہ کے پاس آئے اور سارا واقعہ ذکر کیا۔ ورقہ نے کہا اے محمد تم کو بشارت ہو اور پھر بشارت ہو۔ تحقیق میں گواہی دیتا ہوں کہ تم بلاشبہ وہی نبی ہو کہ جن کی مسیح بن مریمؑ نے بشارت دی ہے اور تمہاری شریعت موسیٰ کی شریعت کے طرز کی ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم یقیناً نبی مرسلؐ ہو۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سورت ابتداء بعثت کے چند روز بعد اتری ہے کہ جب خدیجۃ الکبریٰ اور ابوبکر صدیق مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اور ورقہ بن نوفل ابھی بقید حیات تھے۔ ابتداء بعثت میں نزولِ وحی کی شدت اور اس کی عجیب و غریب کیفیت کی وجہ سے جو اس سے پہلے نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی تھی آپ پر ایک خاص خشیت اور دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جب آدمی پر کوئی خاص کیفیت اور شدت طاری ہوتی ہے تو دل کی تسلی اور تشفی کے لیے اپنے محرم خاص اور محب با اختصاص سے ذکر کرتا ہے تاکہ دل کو سکون اور اطمینان ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہؓ سے ذکر کرنا اور ورقہ کے پاس جانا محض اس لیے تھا کہ یہ محرم راز اور ہمدم و ہم ساز ہیں۔ حبیب اور لبیب ہیں۔ ہوشمند اور دانش مند ذی علم اور ذی فہم ہیں ان سے مل کر تسلی ہو گی۔ معاذ اللہ آپؐ کو اپنی نبوت و رسالت میں کوئی شبہ اور تردد نہ تھا اور نہ ورقہ سے کوئی تعلیم و تلقین مقصود تھی۔ ورقہ تو صرف توریت اور انجیل کے ایک عالم تھے۔ اور حضرت تو اوتیت علم الاوّلین والآخرین کے مصداق تھے حضور ورقہ سے کیا علم اور فیض حاصل کرنے جاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ورقہ اگرچہ عالم تھے مگر صاحبِ حال اور صاحب کیفیت نہ تھے آپکے قلب مبارک پر جو وحی کی کیفیت گزر رہی تھی۔ اس کی حقیقت اور اس کی لذت کی کیفیت تو آپ ہی کو معلوم تھی۔ ورقہ ذوقی طور پر نہیں جانتے تھے۔ بلکہ محض علمی طور پر اتنا جانتے تھے کہ حضرات انبیاء پر نزولِ وحی کے وقت یہ کیفیات گزرتی ہیں۔ اس لیے وہ آپ کی تسلّی کرتے تھے اور ایسے وقت میں تسلی اور تشفی وہی کر سکتا ہے کہ جس پر یہ حالت اور یہ کیفیت نہ گزر رہی ہو اور کچھ اجمالی طور پر اس قسم کی چیزوں سے واقف اور باخبر ہو۔ جیسے تیمار دار بیمار کی تسلی کرتا ہے۔ ورنہ جس پر یہ کیفیت گزرے گی اور جس پر یہ حالت طاری ہو گی وہ خود ہی خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو جائے گا۔ اسے اپنی ہی خبر نہ رہے گی۔ دوسرے کی کیا تسلی اور کیا تشفی کرے گا۔ اور عقلاً یہ ضروری نہیں کہ تسلی دینے والا صاحبِ حال سے افضل اور اکمل یا اعلم اور افہم ہو۔ فافہم ذلک واستقم۔ ورقہ بن نوفل کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ انجیل متی کے باب سوم میں یوحنا حواری کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا مذکور ہے۔ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا جائے۔

چونکہ سب سے پہلے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ کا نزول ہوا جس میں یہ حکم تھا کہ اللہ کے نام سے پڑھو اس لیے اس کے چند روز بعد بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا نزول ہوا یعنی ہم اسی حکم سابق کے مطابق اللہ ہی کے نام سے پڑھتے ہیں۔

بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ مگر صحاح ستہ

کی تمام روایتوں میں سورۂ اقراء کی ابتدائی آیتوں کا سب سے پہلے نازل ہونا مذکور ہے اور یہی جمہور کا قول ہے۔ عجب نہیں کہ ان بعض علماء کی مراد یہ ہو کہ سب سے پہلے پوری سورت جو نازل ہوئی وہ سورۂ فاتحہ ہے اور سورۂ اقراء ابتداءً پوری نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی چند آیتیں اتریں اور بقیہ سورت بعد میں نازل ہوئی اور سورۂ فاتحہ پہلی ہی مرتبہ میں پوری نازل ہوئی جیسا کہ روایت مذکورہ سے ظاہر ہے۔

اسماء سورۂ فاتحہ

اس سورت کے بہت سے نام ہیں مشہور نام فاتحہ[1] ہے اس لئے کہ قرآن شریف اسی سے شروع ہوتا ہے اور سورۃ الحمد[2] ہے۔ اس لیے کہ ابتداء میں یہ لفظ حمد واقع ہے اور اس سورۃ کو فاتحۃ الکتاب[3] اور فاتحۃ القرآن[4] بھی کہتے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا آغاز اور شروع اسی سورت سے ہوتا ہے اور اسکا ایک نام ام الکتاب[5] بھی ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال۔
حسن بصری رحمہ اللہ تعالےٰ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کی ہدایت کے لیے ایک سو چار کتابیں مختلف انبیاء و رسل علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام پر اتاریں اور تمام علوم اور حکمتوں کو ان میں ودیعت رکھا اور پھر ان سب کا خلاصہ توریت وانجیل وزبور وقرآن حکیم میں درج فرمایا اور پھر ان سب علوم کو قرآن حکیم میں بھر دیا اور پھر قرآن کے تمام علوم کو مفصل میں اور علوم مفصل کو فاتحۃ الکتاب میں ودیعت فرمایا اور فاتحۃ الکتاب کے علوم کو اپنی حکمت بالغہ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں بھر دیا۔

کہتی ہے سو زبان سے قرآن کی خامشی
لاریب ذات پاک کی سچی کتاب ہوں
مجھ میں بھرے جہاں کے علوم وفنون ہیں
قرآن میرا نام ہے اُم الکتاب ہوں

اور اس سورۃ کا نام سورۃ الکنز[6] بھی ہے۔ یعنی یہ علوم الٰہی کا ایک عظیم خزانہ ہے ایک حدیث میں ہے کہ یہ سورت ایک خزانہ سے نازل ہوئی ہے جو عرش کے نیچے ہے اور چونکہ اس سورت میں حق جل شانہٗ نے بندوں کو اپنی بارگاہ میں عرض ومعروض کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے اس لیے اس سورۃ کا نام تعلیم المسئلہ[7] بھی ہے یعنی جب ہمارے دربار میں حاضر ہوا کرو تو اس طرح معروض کیا کرو کہ اپنی التجاء پیش کرنے سے پہلے خدا کی حمد و ثناء کرو اور اسکی عظمت اور طاقت اور اسکی قدرت اور ربوبیت کا دل اور زبان سے اعتراف کرو اور پھر اسکے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرو اور اسی کو اپنی حاجتوں کا برلانے والا اور معین ومددگار سمجھو اور یہ دعا مانگو کہ اے اللہ

ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تیرا فضل و کرم ہو چکا ہے نہ ایسے لوگوں کا راستہ جن پر تیرا قہر و غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا راستہ۔ سبحان اللہ کیسی دعا ہے جو دین و دنیا کی ایسی تمام نعمتوں کو شامل ہے جو قہر و غضب اور گمراہی سے پاک صاف ہوں یعنی سعادت عطا فرما اور شقاوت سے بچا۔ مطلب یہ ہے کہ اہل انعام کی طرح ہم کو فضائل سے آراستہ فرما اور اہل غضب اور اہل ضلال کے ذمائم اور رذائل سے ہم کو بچا تاکہ نابکار و ناہنجار بندے تیرے مقبول بندوں کی صف میں کھڑے ہو کر تیرے انعام و اکرام سے بہرہ یاب ہو سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

اہل عقل غور کریں کہ کیا اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہو سکتی ہے جو لاکھوں امیدوں اور آرزوں کو اپنے اندر لیے ہوتے ہو۔ اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الشفاء اور سورۂ شافیہ بھی ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ سورۃ فاتحہ ہر مرض کے لیے شفاء ہے اور ایک نام اسکا کافیہ اور وافیہ بھی ہے کہ خیرات و برکات کے لیے کافی اور وافی ہے اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الصلاۃ بھی ہے کہ نماز میں اسکا پڑھا جانا ضروری ہے جاننا چاہیئے کہ اس سورت کا نماز میں پڑھا جانا ضروری ہے۔ مگر ہر نمازی کے لیے نہیں بلکہ جو امام ہو یا منفرد ہو یعنی اپنی تنہا نماز پڑھتا ہو۔ اس کے لیے نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سننا اور خاموش رہنا فرض و لازم ہے مقتدی کو امام کے پیچھے کچھ پڑھنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حق تعالٰے شانہٗ کا ارشاد ہے وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو نہایت غور اور توجہ کے ساتھ امام کی قرأت کی طرف کان لگا کر سنو اور بالکل خاموش رہو۔ امید ہے کہ اگر تم نے امام کی قرأت کو سنا اور خاموش کھڑے رہے اور امام کے ساتھ قرآن میں کوئی منازعت اور مخالجت نہ کی تو تم پر رحم کیا جائے گا۔ یعنی مقتدیوں سے رحمت خداوندی کا وعدہ استماع اور انصات کے ساتھ مشروط ہے ورنہ پھر یہ وعدہ نہیں اور یہ آیت بالاجماع قرأت خلف الامام کے بارہ میں نازل ہوئی جیسا کہ امام بیہقی اور زرقانی نے اس کی تصریح کی ہے اور احادیث صحیحہ مشہورہ میں ہے کہ اذا قرأ فانصتوا (جب امام پڑھے تو خاموش رہو) اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ لاصلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی۔ سو امام احمد بن حنبل اور سفیان بن عیینہ سے ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ یہ حکم امام اور منفرد کا ہے۔ احادیث دو قسم کی ہیں ایک وہ قسم ہے کہ جس میں امام اور منفرد کے احکام وارد ہوئے ہیں ان میں یہ آیا ہے کہ نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور دوسری قسم احادیث کی وہ ہے کہ جس میں مقتدی کے احکام آئے ہیں ان تمام احادیث میں صرف یہی حکم آیا ہے اذا قرأ فانصتوا کہ جب امام پڑھے تو خاموش رہو امام کے احکام الگ ہیں اور مقتدی کے احکام الگ اپنی اپنی جگہ دونوں ٹھیک ہیں امام پڑھے اور مقتدی خاموش رہے دونوں میں کوئی تعارض نہیں

استعاذہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

پناہ پکڑتا ہوں اور حمایت ڈھونڈتا ہوں خدا تعالٰی کی بہکانے اور پھسلانے سے شیطان مردود کے

جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ تلاوت قرآن کی ابتداء سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا سنت ہے جس کے معنی ہیں کہ میں شیطان مردود کے فتنہ سے اللہ کی پناہ میں آنے کی درخواست کرتا ہوں۔ کما قال تعالیٰ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ اس لیے کہ استعاذہ شیطان کے مکر اور شر سے بچنے کے لیے تریاق کا حکم رکھتا ہے۔ کما قال تعالیٰ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ اور عطاء یہ کہتے ہیں کہ ہر قراءت کے شروع میں استعاذہ واجب ہے خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں استعاذہ کی حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے جال میں پھنسنے سے محفوظ ہو جائے اور بسم اللہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی رحمت میں داخل ہو جائے اسلئے استعاذہ۔ بسم اللہ پر مقدم ہوا۔ کیونکہ دفع مضرت۔ جلب منفعت پر مقدم ہے۔ نیز قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کی تلاوت سے پہلے زبان اور قلب کی طہارت ضروری ہے۔ اس لیے تلاوتِ قرآن سے پہلے استعاذہ کا حکم دیا گیا تاکہ زبان اور قلب کو ایک گونہ طہارت حاصل ہو جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ ہی کے نامِ نامی[۱] اور اسمِ گرامی کی اعانت اور امداد سے کہ جو بیحد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ اس کے کلام کو شروع کرتا ہوں اور اسکے کلمات قدسیہ کے انوار و تجلیات اور ظاہری اور باطنی ثمرات و برکات کا امیدوار ہوں۔

---

[۱] نام نامی۔ یہ ترجمہ اسم کی اصل کی طرف اشارہ کے لیے کیا گیا ہے اس لیے کہ اسم کی اصل سمو ہے جو علو اور رفعت پر دلالت کرتی ہے اور شروع کرتا ہوں اخیر تک بسم اللہ کے متعلق کی طرف اشارہ ہے کہ تقدیر کلام اس طرح سے ہے بسم اللہ اشرع کلام اللہ وارجو برکۃ اسمہ انوار کلماتہ القدسیہ وتجلیاتہ اور اس طرف اشارہ ہے کہ جار مجرور کی تقدیر مؤخراً مناسب ہے تاکہ فائدہ حصر اور اختصاص کا حاصل ہو اور اسی حصر کے ظاہر کرنے کے لیے ترجمہ میں "ہی" کا لفظ بڑھایا اللہ ہی کے نام نامی الخ

بِسۡمِ اللّٰهِ بعض علماء کے نزدیک سورۂ فاتحہ اور ہر سورت کا جزو ہے اور امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سوائے سورۂ نمل کے کسی سورۃ کا جزو نہیں دو سورتوں میں محض فصل کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ تبرکاً ہر سورت کے ابتداء میں اسکو لکھا جاتا ہے۔

سنن ابی داؤد میں باسناد صحیح ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ان رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم کان لا یعرف فصل السورۃ حتی ینزل بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتوں میں فصل نہ جانتے تھے یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی۔

اسی وجہ سے بسم اللہ الخ کو نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ جہراً نہیں پڑھا جاتا تاکہ جزو فاتحہ ہونے کا واہمہ نہ ہو۔ اور اسی لیے بسم اللہ الخ کو کسی سورۃ کے ساتھ ملا کر نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ سورۃ سے علیحدہ دو خطوں کے درمیان میں لکھتے ہیں تاکہ جزو سورت ہونے کا شبہ نہ ہو مگر سورۂ نمل میں بسم اللہ بالاتفاق سورت کا جزو ہے اس لیے اس کو مثل دیگر آیات کے ملا کر لکھا جاتا ہے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور خلفائے راشدین کی مستمرہ سنت یہ تھی کہ بسم اللہ کو نماز میں آہستہ پڑھتے تھے۔ (ابن کثیر۔ ترمذی۔ زاد المعاد)

امام ابوبکر رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کی خوب تفصیل فرمائی ہے اور امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک کا خوب مدلل اور مبرہن ہونا ثابت کیا ہے حضرات اہل علم اسکی طرف مراجعت فرمائیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو با ہے بعض علماء کے نزدیک وہ مصاحبت اور الصاق کے لیے ہے اور بعض علماء کے نزدیک استعانت کے لیے ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس صورت میں ابتداء ہی سے اپنی عبودیت اور عجز و استکانت کا اظہار اور پہلے ہی وہلہ میں اپنی حول اور قوۃ سے تبری کا اعلان ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اعانت اور توفیق سے ہم شروع کرتے ہیں۔ حاشا اپنی حول اور قوۃ سے نہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی اسی کو مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل ہی کا اظہار ہو۔ اور ادعاء مصاحبت نہ ہو۔ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً اور یہی معنی اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے زیادہ مناسب ہیں اور یہی معنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے مرادف ہونے کی وجہ سے کَنۡزٌ مِّنۡ کُنُوۡزِ الۡجَنَّۃِ (یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ) کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور بسم اللہ کی با کا کسرہ بھی انکسار اور ذل عبودیت ہی کی طرف مشیر ہے۔

اَللّٰہ اس ذات واجب الوجود کا علم ہے جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب اور نقص کے شائبہ اور واہمہ سے بھی پاک اور منزہ ہے اور اسی وجہ سے لفظ جلالت ہمیشہ موصوف

ہی واقع ہوتا ہے اور اسماء حسنیٰ کو بطور صفت اس اسم عظیم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے کما قال تعالیٰ
هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ
هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ
الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ
الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ۔

اور یہ اسم عظیم رب اعلیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اسکا اطلاق ہمیشہ سے صرف اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات پاک کے لیے ہوا ہے۔ جس طرح کوئی اس کی ذات اور صفات میں اسکا شریک وسہیم نہیں۔ اسی طرح اس اسمِ عظیم میں بھی اُسکا کوئی قسیم نہیں۔ اسی وجہ سے تمام اولیاء اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اسم ذات ہی اسم اعظم ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی لفظ اللہ ہی کو اسمِ اعظم فرمایا ہے جیساکہ امام طحاوی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔

حدثنا محمد بن الحسن عن ابی حنیفة قال اسم اللّٰه الاکبر هو اللّٰه قال محمد الاتری ان الرحمٰن اشتق من الرحمة والرب من الربوبیة وذکر اشیاء نحو هذا واللّٰه غیر مشتق من شیئ۔	محمد بن حسن نے روایت کیا امام ابوحنیفہؒ سے کہ اسم اعظم وہ لفظ اللہ ہے کہا محمد بن حسن نے اس لیے کہ رحمٰن مشتق ہے رحمت سے اور رب مشتق ہے ربوبیت سے اور اس قسم کی مثالیں ذکر فرمائیں اور لفظ اللہ کسی شیٔ سے مشتق نہیں۔
(مشکل الآثار ص۶۲ ج۱)	(مشکل الآثار)

خود چہ شیریں ست نام پاک تو
خوشتر از آب حیات ادراک تو

نام تو چوں بر زبانم میرود
ہر بُنِ موازعسل جوئے شود

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام
شیر وشکر می شود جانم تمام

اللہ اللہ ایں چہ نام خوش مذاق
حرف حرفش میدہد جان را رواق

اسم اعظم ہست اللہ العظیم
جانِ جان و محی عظم رمیم

(خاتمہ مثنوی از مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس اللہ سرہٗ)

اسم اللہ کے بعد تمام اسماء حسنیٰ میں اسمِ رحمٰن کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ
قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو
بظاہر اسی وجہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے

زیادہ محبوب یہ دو نام ہیں. عبداللہ اور عبدالرحمٰن ۔ عبداللہ میں عبد. اسم اعظم کی طرف مضاف ہے اور عبدالرحمٰن میں اسم رحمٰن کی طرف مضاف ہے جسکا مرتبہ اسم اعظم کے بعد ہے اسی وجہ سے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کو پہلے ذکر فرمایا اور عبدالرحمٰن کو بعد میں ۔

رَحمٰن اور رَحِیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اختلاف اس میں ہے کہ کس میں مبالغہ زیادہ ہے جمہور کا قول یہ ہے کہ رحمٰن میں بہ نسبت رحیم کے زیادہ مبالغہ ہے اس لیے کہ لفظ رحمٰن اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم اللہ تعالےٰ کے ساتھ مخصوص نہیں. قرآن کریم میں رحیم کا اطلاق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی آیا ہے. کما قال تعالےٰ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. پس رحمٰن کے معنی ایسا انعام کرنے والا کہ کوئی اس جیسا انعام نہ کرسکے اور یہ معنی حق تعالےٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور رحیم مطلق منعم کو کہتے ہیں خواہ دوسرا اس جیسا انعام کرسکے یا نہ کرسکے اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہم معنی ہیں جیسے ندمان اور ندیم تاکید کے لیے دونوں کو جمع کردیا ہے ۔ اور ان صفتوں کا اطلاق حق جل و علاء پر ایسا ہی حقیقی ہے جیسا علیم و قدیر اور سمیع و بصیر کا اطلاق اس پر حقیقی ہے. اور جس طرح اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں اسی طرح اسکی رحمت بھی ہماری رحمت کے مماثل نہیں ۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ. — کوئی شے اُس کے مثل نہیں وہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے

وہ اپنے سننے اور دیکھنے میں اور ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں ۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ. — اللہ ہی ہر طرح سے بے نیاز ہے اور تم ہی ہر طرح سے اسکے محتاج ہو۔

اسی طرح وہ اپنی صفت رحمت میں بھی نہ رقت قلب کا محتاج ہے ۔ اور نہ انفعال نفس کا جیسے اُس کی ذات بے چون و چگون ہے اسی طرح اس کی صفت علم و قدرت اور صفت رأفت و رحمت وغیرہ بھی بے چون و چگون ہے ۔

اُسکی بے چون و چگون رحمت حقیقیہ. علماء کی مجاز و تاویل اور استعارہ و تمثیل کی ذرہ برابر محتاج نہیں ۔

اے برون از وہم و قال و قیل من — خاک بر فرق من و تمثیل من

صفات باری تعالیٰ میں صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین کا یہی مسلک تھا اور وہ حضرات اس لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے اسماء حسنیٰ میں تاویل کو بدعت سمجھتے تھے۔

امام ابوالحسن اشعری نے اخیر عمر میں متکلمین کے طریق تاویل و تمثیل کو چھوڑ کر مذہب سلف

ہی کی طرف رجوع فرمایا جیسا کہ امام موصوف نے اپنی آخری تصنیف کتاب الابانہ میں اُسکی تصریح کی ہے قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ رحمت کے حقیقی معنی رقت قلب کے ہیں۔ باری تعالیٰ کی شان میں رحمت کا اطلاق مجاز ہے حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ سبحان اللہ جہاں رحمت حقیقی تھی وہاں تو مجاز بنا دیا اور جہاں مجاز سر تا پا مجاز تھا وہاں حقیقت بنا دی یعنی حقیقت کے اعتبار کو دیکھا جائے تو رحمت بارگاہ خداوندی میں حقیقت ہے اور بندہ میں سراسر مجاز مگر ارباب تاویل نے معاملہ برعکس کر دیا۔

اور ابتداء کے لیے ان تین ناموں کو یعنی اللہ اور رحمٰن اور رحیم کو اس لیے خاص فرمایا کہ انسان پر تین حالتیں گزرتی ہیں۔ اوّل اُسکا عدم سے نکل کر وجود میں آنا۔

دوم۔ اس کا باقی رہنا اور جس قدر خلاق علیم نے اُس کے لیے مدۃ بقا مقرر فرمائی ہے اس کو پورا کرنا جسکو عرف میں حیاتِ دنیا اور زندگی کہتے ہیں۔

سوم اس نشاۃ دنیا کے ختم ہونے کے بعد حیاتِ دنیویہ پر ثمرات کا مرتب ہونا۔ عمل نیک پر جزاء اور عمل بد پر سزا پانا۔

پس ابتداء میں تین نام ذکر فرمائے تاکہ تینوں حالتوں کی جانب اشارہ ہو جائے لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لیے کہ تخلیق و تکوین بارگاہِ الوہیۃ سے متعلق ہے اور لفظ رحمٰن سے دوسری حالت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے جو اس جگہ ٹھیک راستہ پر چلا اس کے لیے آخرت کی تمام منزلیں آسان ہیں۔ شیطان اور نفس امارہ ہر وقت اس کی تاک میں ہے اس لیے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہا رحمت کا محتاج ہے۔

اور لفظ رحیم کو تیسری حالت یعنی نشاۃ آخرت کے یاد دلانے کے لیے ذکر فرمایا۔

دارِ دنیا چونکہ مومن و کافر سب کے لیے باعث رحمت ہے۔ مومن کے لیے تو ظاہر ہے کافر کے حق میں دنیا اس لیے رحمت ہے کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کر سکتا ہے اور اگر سوء اختیار سے توبہ بھی نہ کرے تو فی الحال اسکا عذاب جہنم سے رہا رہنا ہی بہت بڑی رحمت ہے نیز بعثت انبیاء اور ارسال رسل اور انزالِ کتب ایک ایسی عظیم رحمت ہے کہ جو مومن اور کافر سب کے لیے ہے یہ امر آخر ہے کہ کوئی اس رحمت سے متمتع اور منتفع ہوا اور کوئی نہ ہوا۔ الحاصل دارِ دنیا مومن اور کافر سب کے لیے باعث رحمت ہے اور دارِ آخرت صرف مومنوں کے لیے باعثِ رحمت ہے اور کافروں کے واسطے باعث عذاب و نقمت۔ کما قال تعالیٰ۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ عَلَى الْكَافِرِينَ

جب صور پھونکا جائیگا تو وہ دن کافروں پر نہایت سخت اور دشوار ہوگا۔ کسی قسم

غَيْرُ يَسِيْرٍ۔ کی اس میں آسانی نہ ہوگی۔

اس لیے نشأۃ دنیا کے یاد دلانے کے لیے لفظ رحمٰن ذکر فرمایا کہ جس میں بہ نسبت رحیم کے زائد مبالغہ ہے اور نشأۃ آخرت کے یاد دلانے کے لئے رحیم کا لفظ استعمال فرمایا اس لیے کہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے اور عموم رحمت کا محل صرف دار دنیا ہے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا اور دارِ آخرت صرف مومنوں کی رحمت کے لیے ہے۔

نیز رحمٰن فعلان کا وزن ہونے کی وجہ سے کچھ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ کلام عرب میں وزن فعلان اکثر صفاتِ عارضہ اور اوصافِ متجددہ اور حادثہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسے عطشان اور غضبان اور ریّان اور لہفان وغیرہ لہٰذا لفظ رحمٰن سے اس دار حدوث و تجدد اور دار فانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔ اور لفظ رحمٰن چونکہ عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے اس لیے قرآن کریم میں استواء علی العرش کو صفتِ رحمٰن کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اس لیے کہ عرش تمام مخلوقات کو محیط ہے۔ جیسا کہ اسکی رحمت تمام مخلوق کو محیط اور واسع ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ پس اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى سے یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ وسیع مخلوق یعنی عرش پر سب سے زیادہ وسیع صفت رحمٰن کے ساتھ استوار فرمایا ہے اور صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے قضائے خلق کے بعد ایک کتاب میں یہ لکھ کر ان رحمتی تغلب غضبی۔ یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ اپنے قریب عرش پر رکھا۔ حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ سبقت رحمتی غضبی مراحم خسروانہ کا قانون ہے جو عرش پر آویزاں ہے۔

رحیم صفت مشبہ کا صیغہ ہے یا اسکے ہم وزن ہونے کی وجہ سے دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے فعیل کا وزن کلامِ عرب میں معانی ثابتہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ علیم و حکیم و جمیل، لہٰذا لفظ رحیم سے دارِ باقی اور عالم جاودانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔ علامہ آلوسی کے کلام سے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن سے عام رحمت مراد ہے خواہ بالواسطہ یا بلا واسطہ صورۃً اور معنیً ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہو یا فقط معنیً اور باطناً رحمت ہو۔ اگرچہ صورت اور ظاہر کے لحاظ سے وہ عذاب ہو۔ جیسے مریض کو تلخ دوا کا پلانا صورۃً ایلام اور تکلیف ہے مگر معنیً سراسر رحمت ہے پس رحمٰن سے ایسی ہی عام رحمت مراد ہے کہ جو ان تمام انواع و اقسام کو شامل ہو۔ یہ دار فانی اسی قسم کی رحمت کا محل ہے اسکی رحمت راحت و انعام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مصائب و آلام کی شکل میں۔ کما قال تعالیٰ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا

شَیۡئًا وَّ ھُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اور رحیم سے وہ رحمت مراد ہے جو بلا واسطہ ہو۔ اور ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہی رحمت ہو۔ دارِ آخرت میں اسی قسم کی رحمت ہوگی کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے بلا واسطہ بھی ہوگی اور کسی قسم کا اس میں شائبہ رنج والم کا بھی نہ ہوگا۔

خُلاصہ

یہ کہ لفظ اللہ میں جس کے معنی یہ ہیں کہ جو ذات تمام صفات کمال کی جامع اور تمام نقائص وعیوب سے پاک اور منزہ ہے۔ تمام مباحث الہیات کی طرف اشارہ ہے۔

اور لفظ رحمٰن میں مباحث نبوت و شریعت کی طرف اشارہ ہے کہ جنکے بغیر خدا کی مرضی کے موافق ایک لمحہ گزارنا محال ہے۔

اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امور آخرت کی طرف اشارہ ہے اور یہی وہ تین امر ہیں کہ جو تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم کا لباب اور عطر ہیں۔ اور تفتازانی اور جرجانی انہیں تین مقاصد اور مواقف کی شرح میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علامہ تفتازانیؒ اور علامہ جرجانیؒ اور تمام متکلمین کو تمام اہل اسلام کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ کہ دین کے مقاصد اصلیہ کو خوب واضح فرمایا اور امت کے لیے صحیح مؤقف کو خوب واضح اور روشن کر دیا۔ آمین۔ یارب العالمین۔

سورۂ فاتحہ میں بھی انہی تین باتوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ میں صفات الٰہیہ کو بیان فرمایا ہے اور مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔ سے احوال آخرت کی طرف اشارہ فرمایا اور اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ الخ سے مباحث نبوت و رسالت۔ ایمان اور کفر۔ سعادت اور شقاوت۔ ہدایت اور ضلالت کے فرق کی جانب اشارہ فرمایا۔

اور تمام قرآن انہیں مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے جو سورۂ فاتحہ میں اجمالاً ذکر فرمائے اسی وجہ سے اس سورت کا نام ام الکتاب ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال اور چونکہ کتاب الٰہی کی ہر سورت انہی مضامین ثلثہ کی تفصیل ہے جو اجمالاً بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ میں درج ہیں۔ اس لیے ہر سورت کی ابتداء میں بسم اللہ کا لکھنا اور پڑھنا مسنون قرار دیا گیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

حقیقی ستائش[1] اللہ ہی کے لیے مخصوص[2] ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنیوالا ہے

۱۔ جو فعل علم اور اختیار اور قدرت اور ارادہ سے صادر ہو اس کی واقعی خوبی بیان کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ مدح میں نہ فعل کا اختیاری ہونا ضروری ہے اور نہ اس خوبی کا واقعی ہونا لازمی ہے اسی وجہ سے مدح کسی وقت ممنوع بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

احثوا التراب وجوه المداحين   مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو۔

مگر حمد سے کسی وقت منع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس میں واقعی خوبی کا اظہار ہوتا ہے بعض علماء نے تعریف حمد سے قید اختیار کو حذف کر دیا ہے اس لیے کہ اس قید کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہ کی صفات ذاتیہ کی ثناء کو حمد کہنا دشوار ہو گا۔ اس لیے کہ صفات ذاتیہ جیسے علم و قدرت افعال خداوندی کی طرح اختیاری نہیں۔ اگرچہ یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ یہ صفات اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر انکے ثمرات ضرور اختیاری ہیں یا ان کے موصوف کا فاعل مختار ہونا حمد کے لیے کافی ہے۔ حمد اور مدح میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حمد انہی صفاتِ کمال پر ہو سکتی ہے جن کا صفات کمال ہونا قطعی اور یقینی ہو۔ اور اُن میں کسی قسم کے نقص اور عیب کا شائبہ بھی نہ ہو بخلاف مدح کے کہ اس میں نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت قطعاً اور یقیناً صفت کمال ہو، ظناً بھی صفت کمال ہونا مدح کے لیے کافی ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ صفت کمال شائبۂ نقص سے پاک ہو، بلکہ اگر اس میں کچھ نقص بھی ہو تب بھی مدح ہو سکتی ہے۔

نیز حمد میں یہ ضروری ہے کہ محاسن و کمالات کا ذکر محبت اور اجلال کے ساتھ ہو اور مدح میں یہ ضروری نہیں۔ مطلقاً محاسن اور کمالات کے بیان کرنے کو خواہ وہ محبت اور اجلال سے ہو یا نہ ہو مدح کہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک برابر والا دوسرے برابر والے کی مدح کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ لفظ حمد سے جو تعظیم و تفخیم مترشح ہوتی ہے وہ لفظ مدح سے نہیں ہوتی اس لیے کہ حمد کا اکثر اطلاق اس غنی حمید ہی پر ہوتا ہے۔ نیز حمد زندہ ہی کی ہوتی ہے اور مدح زندہ اور غیر زندہ دونوں کی ہوتی ہے اور حمد کے بعد سب سے پہلے اسم ذات کو ذکر فرمایا اور اس کے بعد پھر دیگر اسماء صفات و افعال کو ذکر کیا، تاکہ ذاتاً اور صفۃً اور فعلاً ہر طرح سے اس کا مستحق حمد و ثناء ہونا معلوم

---

[1] قوله حقیقی ستائش اشارة الى ان الاولى ان يكون لام التعريف فى الحمد للجنس والحقيقة كما اختاره جار الله العلامة وهو ابلغ من الاستغراق. كما لا يخفى على ارباب الذوق فافهم ذلك واستقم

[2] قوله مخصوص ہے. هذه ترجمة لام الاختصاص ــــــ فى لله.

ہو جائے۔

۲۔ ربوبیت بمعنی پرورش کرنا اور کسی شئ کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا تربیت اگرچہ والدین سے بھی ظہور میں آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ اور یہ دعا مانگ کہ اے اللہ میرے ماں باپ پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے خورد سالی میں مجھ کو پالا۔

مگر والدین کی تربیت نورِ آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی خانہ زاد نہیں بلکہ نورِ زمین کی طرح مستعار اور عطار غیر ہے۔ جس طرح نورِ زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیۂ الٰہی ہے۔

نیز حقیقی تربیت جب ہو سکتی ہے کہ کسی شئے کو نیست سے ہست کیا جائے۔ اور پھر اس کے تمام اسبابِ تربیت کو پیدا کیا جائے۔ اور پیدا کرنے کے بعد انتفاع کے تمام موانع دور کر دیئے جائیں۔ تب تربیت مکمل ہو سکتی ہے۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں مگر نہ اولاد ان کی مخلوق ہے اور نہ وہ سامان تربیت کی خالق ہیں بلکہ سب کا سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے نیز والدین کی تربیت چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہے۔ تمام عالم کے لیے عام اور محیط نہیں اور حق تعالیٰ شانہ کی تربیت غیر محدود اور عام اور محیط ہے پس قابل ستائش وہی ربوبیت ہو سکتی ہے۔ جو اصلی اور ذاتی ہو۔ مستعار اور عطار غیر نہ ہو۔ ہر طرح سے کامل اور مکمل ہو کسی قسم کا اس میں نقص نہ ہو۔ تمام عالمین کے لیے عام اور محیط ہو اس لیے ارشاد ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

یعنی حقیقی[1] ستائش خدا تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے کہ جس کی ربوبیت اصلی اور ذاتی اور کامل ہونے کے علاوہ تمام جہانوں کے لیے عام اور محیط ہے اسی وجہ سے جب فرعون نے کہا۔

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ ربّ العالمین کیا چیز ہے

تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا۔ یعنی رب وہ ہے کہ جس کی تربیت سبع سموات اور سبع ارضین اور کل عالم کو محیط ہے۔

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ الحمد کا لام تعریف۔ لام حقیقت اور لام جنس ہے یعنی حمد کی حقیقت اور جنس ہی اللہ کیلئے مخصوص ہے اور جن علماء نے لام کو استغراق کیلئے لیا ہے انہوں نے اس طرح ترجمہ کیا کہ سب تعریف واسطے اللہ کے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے اس ارشاد کے بعد شاید فرعون کو یہ تردد ہوا ہو کہ تربیت کو صرف ذات خداوندی میں منحصر کر دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم والدین اور آفتاب اور ماہتاب کی تربیتوں کا بھی روزانہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اس لیے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دوبارہ جواب کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ۔ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے آباؤ واجداد کا۔

یعنی تمہارے آباؤ اجداد کی تربیت اصلی اور ذاتی نہیں بلکہ عطیۂ الٰہی ہے، تمہارا اور تمہارے تمام آباء اولین کا حقیقی رب اور پروردگار وہی ہے اور تیسری بار یہ فرمایا۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ط۔ وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور انکے درمیان کا اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔

یعنی آفتاب اور ماہتاب کو اپنی کھیتوں کا مربی سمجھنا غلط ہے اس لیے کہ خود آفتاب و ماہتاب اور ان کے نور کو اسی رب العالمین نے پیدا کیا ہے۔

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا۔ اسی نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا۔

اگر وہ رب العالمین شمس و قمر کو روشنی نہ بخشتا یا کھیتیاں پکانے کی خاصیت ان میں نہ رکھتا تو کہاں سے کھیتیاں پکاتے۔

رب العالمین میں ربوبیت خداوندی کا تمام اجناس وانواع اور تمام افراد واشخاص کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پہلی آیت یعنی رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اس کی ربوبیت کا تمام امکنۂ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ اور دوسری آیت رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ۔ میں اس کی ربوبیت کا ماضی اور حال اور مستقبل اور تمام اوقات اور ازمنۂ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا اور تیسری بار رب المشرق والمغرب فرما کر اس کی ربوبیت کا تمام اوضاع اور حالات تمام تغیرات اور کیفیات کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تعالےٰ کی ربوبیت کسی شخص اور کسی زمان کسی مکان اور کسی حالت اور وضع کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سب کو عام اور محیط ہے اس لیے وہی لائق عبادت اور مستحق حمد و ثنا ہے۔

حضرات صوفیۂ کرام قدس اللہ اسرارہم فرماتے ہیں کہ ارواح کے کانوں میں سب سے پہلے وصف ربوبیت ہی کا نغمۂ جانفزا پہنچا ہے اور اسی وصف سے اوّل خدا کو پہچانا ہے۔ کما قال تعالےٰ۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اس وقت کو یاد کرو کہ تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے انکی ذریت کو نکالا

اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓی اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۔
اور خود انکو انکی جانوں پر گواہ بنایا کیا میں تمہارا رب نہیں سب نے کہا بے شک آپ ہمارے رب ہیں ۔

حق تعالیٰ شانہ نے سب سے پہلے اسی اسم رب کے ساتھ ارواح کو مخاطب کیا اور اسی نام سے اُن سے عہد اور میثاق لیا اور بظاہر یہی وجہ ہوگی کہ اوّل الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و مرسلین اور عباد مخلصین کی جو دعائیں حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں ذکر فرمائی ہیں ۔ وہ اکثر و بیشتر کلمۂ رَبَّنَا سے وارد ہوئی ہیں اور ایک مقام پر یعنی رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا ۔ الخ ان آیات میں کلمہ رَبَّنَا سے دعا کرنے والوں کو اولوا لا لباب فرمایا ہے ۔

(۳) عالم اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہو ۔ عَالَمۡ علامت سے مشتق ہے ۔ عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ علامت ہے اسماء الٰہی اور صفات خداوندی کے لیے عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کے کسی اسم کا مظہر اور آئینہ ہے مؤمن و کافر اس کی شان اور انعام اور انتقام کے مظہر ہیں ۔ صاحب عزت اور صاحب ذلت اس کی شان تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ کے آئینہ میں ہیں ۔ عالم غیب اور عالم شہادت اُسکے نام نامی ہوالظاہر والباطن کے لیے آئینہ ہیں ۔

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔

بے حد مہربان ۔ نہایت رحم والا

عجب نہیں کہ بسم اللہ میں وہ شان رحمت مراد ہو کہ جو تکوین اور تربیت عالم کے لیے باعث ہوئی ۔ اور الحمد میں الرحمٰن سے وہ رحمت مراد ہو جو خاص حالت تربیت میں مبذول ہوتی ہے اگر یہ رحمت روک لی جائے تو تربیت اور پرورش ناممکن ہو جائے ۔

اور الرحیم سے وہ رحمت مراد ہو کہ جو تربیت اور پرورش کے بعد جزاء اور سزا کی شکل میں ظاہر ہوگی ۔ اس لیے کہ تربیت اور تکمیل کے بعد آثار اور ثمرات کا نہ مرتب ہونا اس تربیت کے ضائع کرنے کے مرادف ہے ۔

کھیتی پک جانے کے بعد اگر اس پر درانتی نہ چلائی ۔ گندم اور بھوسہ الگ الگ نہ کیا جائے تو کھیتی کو ضائع کرنا ہے ۔

اسی طرح اگر اس عالم کی تربیت ختم ہو جانے کے بعد مؤمن اور کافر ۔ سعید اور شقی کو جدا جدا نہ کیا جائے ۔ تو عالم کی تربیت کا ضائع اور بیکار ہونا لازم آئے گا ۔ اور آئندہ آیت یعنی مالک یوم الدین میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۔

امام رازی فرماتے ہیں ۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ کا تکرار اسکی رحمت کے مکرر اور مضاعف ہونے کی طرف مشیر ہے لیکن مبادا رحمت کی یہ فراوانی کہیں بندوں کو مغرور نہ بنا دے اس لیے

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ کا اضافہ فرمایا تاکہ رغبت کے ساتھ رہبت کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے جیسے۔ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ کے بعد شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۔ کی صفت کا ذکر فرمایا۔ اھ کلامہ

اور عجب نہیں کہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے پہلے ذکر کرنا سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ کی جانب مشیر ہو۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

روزِ جزاء کا مالک

یعنی اللہ تعالیٰ قیامت اور جزاء کے دن کا مالک ہے جس میں فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی جزاء کا فیصلہ فرمائیگا۔ اس لیے کہ نیکی اور بدی اور فرمانبردار اور نافرمان اور موافق اور مخالف میں فرق کرنا عقلاً و نقلاً ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۔ وَ قال تعالٰی لِيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اَسَاۤءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِىَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى وقال تعالیٰ۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۔ نیز دنیا میں کوئی ظالم ہے اور کوئی مظلوم اور مظلوم کا ظالم سے انتقام عین عدل اور عین حکمت ہے اور دنیا میں یہ انتقام نہیں لیا گیا تو آخرت میں لامحالہ لیا جائے گا۔

اس آیت میں دو قراءتیں ہیں اور دونوں صحیح اور متواتر ہیں ایک مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی روز جزاء کا بادشاہ اور دوسری قراءت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ یعنی روز جزاء کا مالک۔ اور اسی مالکیت اور ملکیت یعنی بادشاہت کے لیے روز جزاء کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اسکے جلال و جمال کا بلاواسطہ ظہور علی وجہ التمام و الکمال۔ عالم کے ہر ہر فرد کے لیے ایک ہی آن میں صرف اسی روز ہوگا۔ دنیا میں بھی وہی حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ ہے مگر دنیا میں اس کی مشیت اور حکمت سے کچھ مجازی بادشاہت اور مجازی مالکیت نظر آتی ہے۔ قیامت کے دن سارے مجاز ختم ہو جائیں گے اور صرف حقیقت ہی حقیقت رہ جائے گی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں قراءتوں میں سے کون سی قراءت افضل ہے بعض علماء مَلِكِ بمعنی بادشاہ کی قراءت کو راجح قرار دیتے ہیں۔ اور وجہ ترجیح یہ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کہ ملکیت یعنی بادشاہت میں جو عظمت ہے وہ وصفِ مالکیت میں نہیں۔ مالک تو ہر ایک ہوتا ہے مگر بادشاہ ہر ایک نہیں ہوتا۔

۲۔ مالک کا حکم فقط اپنے مملوک پر چلتا ہے اور بادشاہ کا حکم تمام ملک اور تمام رعایا پر جاری اور نافذ ہوتا ہے۔

۳۔ بادشاہ کی اطاعت سب پر واجب ہے اور مالک کی اطاعت فقط اسکے مملوک پر واجب ہے۔
۴۔ نیز لفظ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ بھی مالکیت پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر ملک کے بجائے مالک پڑھا جائے تو تکرار لازم آتا ہے۔
۵۔ قرآنِ کریم کی آخری سورت میں مَلِكِ النَّاسِ آیا ہے لہٰذا قرآن کی پہلی سورت میں بھی مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ پڑھنا چاہیئے تاکہ اوّل قرآن اور آخر قرآن ایک دوسرے کے مناسب اور ہم رنگ ہو جائے۔

اور جو حضرات علماء مٰلِكِ کی قرارت کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ وجوہ بیان کرتے ہیں۔
۱۔ کہ ملکیت یعنی بادشاہت انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور مالکیت انسان اور غیر انسان سب کو شامل ہے۔
۲۔ مالک اپنی مملوک کو فروخت کرسکتا ہے۔ بادشاہ رعایا کو فروخت نہیں کرسکتا۔
۳۔ رعیت بادشاہ کے ملک اور سلطنت سے بھاگ کر نکل سکتی ہے اور مملوک بھاگ کر مالک کی ملکیت سے نہیں نکل سکتا۔
۴۔ غلام پر مولیٰ کی خدمت واجب ہے۔ رعایا پر بادشاہ کی خدمت واجب نہیں۔
۵۔ غلام بغیر آقا کی اجازت اور اذن کے کوئی تصرّف نہیں کرسکتا اور رعیت بغیر بادشاہ کی اجازت کے کام کرسکتی ہے۔ اور مملوک چونکہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کو سوائے مولیٰ کے کسی چیز سے تعلق بھی نہیں ہوتا۔ غلام کے پیشِ نظر ہر وقت آقا کی خوشنودی رہتی ہے رعایا چونکہ اپنی چیزوں کی مالک بھی ہوتی ہے اس لیے ان کو بادشاہ سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔
۶۔ غلام کو آقا سے توقع رحم و کرم کی ہوتی ہے اور رعیت کو بادشاہ سے عدل و انصاف کی امید ہوتی ہے۔ اور بندہ رحم و کرم کا زیادہ محتاج ہے۔
۷۔ بادشاہت میں ہیبت زیادہ ہے اور مالکیت میں شفقت اور عنایت زیادہ ہے۔
۸۔ بادشاہ کے سامنے جب لشکر پیش ہوتا ہے تو ضعیفوں اور کمزوروں اور بیماروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور مالک ضعیف اور کمزور غلاموں پر اور مزید توجہ کرتا ہے اور ان کی اعانت اور خبر گیری میں مشغول ہوتا ہے۔
۹۔ مالک کو مملوک سے تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ بادشاہ کو رعایا سے اتنی محبت اور تعلق نہیں جتنا کہ آقا کو غلام سے ہوتا ہے اور عاشقوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مژدۂ جانفزا نہیں کہ محبوب کو ہم سے محبت اور تعلق ہے۔

۱۰۔ مٰلِكِ میں مَلِكِ سے ایک حرف زیادہ ہے۔ لہٰذا مٰلِكِ کی قرأت میں ثواب بھی زیادہ ہو گا۔ اس لیے کہ ایک حرف کے زیادہ ہونے کی وجہ سے دس نیکیاں اور زیادہ ہوں گی۔ فَتِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

(خاص تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے ہر کام میں مدد چاہتے ہیں اس لیے کہ بغیر تیری اعانت اور امداد کے کچھ نہیں ہو سکتا)

یعنی اجسام علویہ اور سفلیہ اور کواکب اور نجوم اور نور اور ظلمت کسی کو تیرا شریک نہیں ٹھہراتے ہیں ہر خیر و شر اور سعادت و نحوست کا تجھے ہی مالک سمجھتے ہیں پہلی آیت میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت کو بیان کیا اور معرفت ربوبیت کے بعد معرفت عبودیت کا درجہ ہے۔ اس لیے اس کے بعد عبادت کا ذکر کیا گیا۔

۱۔ کسی کی نہایت درجہ تعظیم کے لیے دل و جان سے غایت درجہ کا تذلل اختیار کرنا اسکا نام عبادت ہے لہٰذا جو تذلل اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری یعنی بلا اختیار کے ہو وہ عبادت نہیں کہلائے گا اور اسی طرح جو تذلل کسی کے جبر اور قہر اور زور سے ہو وہ بھی عبادت نہ کہلائے گا اور جس تذلل سے تعظیم مقصود نہ ہو وہ استہزار اور تمسخر کہلائیگا اور لائق عبادت اور مستحق بندگی وہی ذات ہوگی، جو غایت درجہ کی عظمت اور جلال اور نہایت درجہ خوبی اور کمال اور انتہائی انعام و اکرام اور انتہائی جود و نوال کے ساتھ متصف ہو کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی درجہ اور مرتبہ عقل اور خیال میں نہ آ سکے۔ اور جو انتہائی عظمت و جلال کے ساتھ موصوف نہ ہو اسکے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنا سراسر بے موقع اور بے محل ہے اسی وجہ سے قرآن کریم نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اور کسی چیز کو بے محل رکھنے ہی کا نام ظلم ہے۔ خداوند ذوالجلال کو اگرچہ کسی کی عبادت اور بندگی کی ذرہ برابر حاجت نہیں۔ مگر مقتضائے حکمت یہ ہے کہ صاحب نقصان صاحب کمال کے سامنے تذلل اور پستی اختیار کرے ورنہ کمال اور نقصان کی مساوات لازم آئے گی جو سراسر خلاف حکمت ہے ابتدائے آفرینش عالم سے اس وقت تک دنیا کے تمام عقلاء اور عالم کے تمام حکماء اس پر متفق رہے ہیں کہ ہر صاحب کمال کی تعظیم اور اسکا احترام عقلاً واجب اور فرض ہے یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ناقص کامل کی تعظیم کو اس لیے ضروری نہ سمجھے کہ اس ناقص کو اپنے زعم میں اس کامل کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ احتمال خداوند ذوالجلال میں جاری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مخلوق کا خالق سے مستغنی ہونا ناممکن اور محال ہے۔ ممکن کا وجود ہی واجب الوجود کے سہارے سے ہے۔ ؎

پناہ بلندی و پستی توئی ⁂ ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص وجود باری یا توحید باری کا منکر ہو وہ ناجی نہیں

بلکہ ناری ہے۔ اگرچہ اُسکو کسی نبیؑ کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ وجود باری اور توحید باری کا مسئلہ فطری اور عقلی اور بدیہی ہے اور عقلاء عالم کا اجماعی ہے۔ بعثت انبیاء پر موقوف نہیں حجت پوری ہو چکی ہے لہٰذا اب کوئی عذر مسموع نہیں۔

اور اسی وجہ سے کہ عبادت اختیاری تذلل کا نام ہے حضرات فقہاء نے عبادت کے لیے نیّت کا ہونا بالاجماع شرط قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ کمال محبت کے ساتھ کمال اطاعت کا نام عبادت ہے۔ کمال عظمت کے ساتھ کمال محبت بھی عبادت کے مفہوم میں داخل ہے۔ جس درجہ کی محبت اور عظمت ہوگی اسی درجہ کی عبادت ہوگی۔ عظمت کے ساتھ جبتک محبت نہ ہو عبادت نہیں کہلائے گی اور اِیَّاکَ جو نَعۡبُدُ کا مفعول ہے اسکی تقدیم حصر کے لیے ہے یعنی خاص تیری بندگی کرتے ہیں کسی اور کی نہیں نیز تقدیم مفعول میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عابد کی نظر اپنی عبادت پر نہ ہونی چاہیئے بلکہ معبود پر ہونی چاہئے۔ نیز عبادت سے فقط معبود کی رضا اور خوشنودی مقصود و مطلوب ہونی چاہیئے۔

خلاف طریقت بود کا ولیا ؛ تمنا کنند از خدا جز خدا

گر از دوست چشمت براحسان اوست ؛ تو در بند خویشی نہ در بند اوست

اور نَعۡبُدُ صیغہ جمع ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ ہم سب تیری بندگی کرتے ہیں بجائے اَعۡبُدُ کے صیغۂ جمع لانے میں التزام جماعت کی طرف اشارہ ہے نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بندگی کرنے والا اپنی عبادت پر ناز نہ کرے۔ بلکہ یہ سمجھے کہ عبادت کرنے والا صرف وہی ایک نہیں بلکہ بے شمار بندگی کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ابتداء سورت میں طرزِ کلام غائبانہ تھا۔ اور اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں بجائے غائبانہ کے حاضرانہ طرزِ کلام اختیار کیا گیا اور اس طرح غَیۡبَتۡ سے خطاب کی طرف انتقال کیا گیا وجہ اس کی یہ ہے

۱۔ کہ شروع سورت میں حمد اور ثناء کا ذکر تھا اور تعریف اور ثناء غائبانہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ غائبانہ حمد زیادہ اخلاص کی علامت ہے اور اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت اور خدمت حضوری میں ہوتی ہے۔

۲۔ نیز نمازی نے جب نماز شروع کی تو شروع نماز میں بمنزلہ اجنبی کے آکر کھڑا ہو گیا اور خداوند ذوالجلال کی غائبانہ حمد و ثناء شروع کی یعنی اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ کہا یعنی اسم ظاہر کے ساتھ اس کی حمد و ثناء کی اور اسم ظاہر حکم میں غائب کے ہے اور جب حمد و ثناء حدِ کمال کو پہنچی تو جو حجابات درمیان میں تھے وہ اٹھ گئے اور بُعد، قرب سے اور اجنبیت یگانت سے بدل گئی اور یہ شخص اس قابل ہو گیا کہ خداوند ذوالجلال کے حضور بصیغۂ خطاب عرض معروض کر سکے۔

۳۔ نیز اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے بعد ہدایت کے سوال کا ذکر ہے اور سوال اور درخواست حضوری ہی میں زیادہ بہتر اور مناسب ہوتی ہے اس لیے کہ جب سخی کے سامنے سوال کیا جائے تو سخی

اور کریم اُس کے رد کرنے سے شرماتا ہے۔
اور اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے بعد اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کو اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت پر قوت اور قدرت بدون اس کی اعانت اور توفیق کے حاصل نہیں ہوسکتی اور توفیق کا طلب کرنا یہی استعانت ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت کے لیے بندہ کی حول اور قوت کافی نہیں جب تک خدا کی اعانت حاصل نہ ہو۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ غرض یہ کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے بعد اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا ذکر کرنا عُجب (گھمنڈ) کو زائل کرتا اور نخوت اور کبر کو فنا کرتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں فرقہ جبریہ کے رد کی طرف اشارہ ہے۔ جبریہ۔ بندہ کو جماد کی طرح مجبور محض بناتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے کیونکہ عبادت کے معنی اختیاری تذلل کے ہیں۔ فی الجملہ بندہ کے لیے اختیار ثابت ہوا اور جبر محض کی نفی ہوئی اور اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں فرقہ معتزلہ کے رد کی طرف اشارہ ہے۔ ارباب اعتزال بندہ کو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل قرار دیتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے اس لیے کہ مطلب یہ ہے کہ بندہ اگرچہ عبادت اور بندگی اپنے اختیار سے کرتا ہے لیکن جماد کی طرح مجبور محض اور اختیار سے عاری اور کورا نہیں مگر ایسا فاعل مستقل بھی نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی اعانت سے مستغنی اور بے نیاز ہو جائے بندہ فاعل مختار ضرور ہے مگر اپنے اس خداداد اختیار میں مختار نہیں ہر لمحہ اور ہر لحظہ اسکی اعانت اور امداد کا محتاج ہے۔ فافهم ذلك فانه دقيق و لطيف وسيأتي تفصيل ذلك انشاء اللہ تعالیٰ۔

(سوال) دربارۂ استعانت بغیر اللہ

اس آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگی جائے حالانکہ قرآن وحدیث میں جابجا اس کا ذکر ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو۔ بیمار ہو تو علاج کرو۔ آخر یہ طبیب اور دوا سے استعانت اور استمداد نہیں تو اور کیا ہے لہذا یہ بتلایا جائے کہ وہ کون سی استعانت ہے جو غیر اللہ سے جائز ہے اور کون سی کفر اور شرک ہے۔

جواب

جاننا چاہیئے کہ غیر اللہ سے مطلقاً استعانت حرام نہیں استعانت بغیر اللہ بعض صورتوں میں کفر اور شرک ہے اور بعض صورتوں میں جائز ہے۔ ضابطہ اس کا یہ ہے کہ اگر سوائے خدا تعالیٰ

کے کسی کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھ کر یا بعد عطاء الٰہی اور تفویض خداوندی اس کو قادر مختار جان کر اس سے مدد مانگے تو بلاشبہ کفر اور شرک ہے یا اس شئی کو تاثیر اور فاعلیت میں مستقل بالذات یا مستقل بالعرض تو نہیں سمجھتا لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا نہیں کرتا لیکن دوسروں کو اسکے استقلال کا توہم ہوتا ہے تو یہ استعانت بالغیر ناجائز اور حرام ہوگی۔ اور بعض صورتوں میں کفر اور شرک کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا۔

پہلی صورت جبکہ غیر اللہ کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھے اسکے شرک ہونے میں تو کسی کو بھی کلام نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر کو قادر بالذات تو نہیں سمجھتا لیکن قادر بعطائے الٰہی سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قدرت اور اختیار عطاء کیا ہے کہ جو امور طاقت بشری سے باہر ہیں۔ ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جسکو چاہے دے اور جسکو چاہے نہ دے جیسے بادشاہ اپنے وزراء اور حکام کو کچھ اختیارات عطاء کر دیتا ہے اور وہ بعد عطائے اختیارات مستقل سمجھے جاتے ہیں۔ اور پھر بادشاہ کے علم اور ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح معاذ اللہ۔ خدا تعالیٰ نے بھی کچھ اختیارات انبیاء اور اولیاء کو عطاء کیے ہیں اور وہ بعد عطاء الٰہی مستقل اور مختار ہیں۔ مشرکین عرب۔ ملائکہ اور اصنام کے متعلق بعینہ یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ یہ مشرکین انکو مستقل بالذات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ انکو فاعل مستقل بعطاء الٰہی سمجھتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا دیا ہے قرآن کریم میں جابجا اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا کما قال تعالیٰ۔ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وقال تعالیٰ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ۔ یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ خدائی اور خدائی اختیارات کا کسی طرف منتقل ہونا یا عطاء کیا جانا نہ اختیاراً ممکن ہے اور نہ اضطراراً۔ کفار بغیر عطاء الٰہی کسی چیز پر انکو قادر نہیں سمجھتے تھے۔ و قال تعالیٰ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا و قال تعالیٰ قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ان آیات میں بالذات نفع اور ضرر کے مالکیت اور اختیار کی نفی نہیں اس لیے کہ نہ کوئی نفع اور ضرر کے بالذات مالک اور مختار ہونے کا مدعی تھا اور نہ کوئی عاقل اسکو تسلیم کر سکتا ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نفع اور ضرر کا بالذات مالک ہو۔ مشرکین بھی اسکے قائل تھے۔ اصل مالک اور خالق وہی اللہ ہے۔

تیسری صورت کہ جب اس غیر کو نہ مستقل بالذات سمجھے نہ مستقل بالعرض لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا کرے۔ مثلاً اسکو یا اسکی قبر کو سجدہ کرے یا اسکے نام کی نذر مانے تو یہ بھی حرام اور شرک ہے لیکن یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ عملی ہے۔ اسکا مرتکب حرام کا مرتکب سمجھا جائیگا۔ دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہوگا۔ چوتھی صورت کہ جب استعانت بالغیر میں اس غیر کے استقلال کا ایہام

ہوتا ہو جیسے روحانیات سے مدد مانگنا۔ اگرچہ یہ شخص مستقل نہ سمجھتا ہو لیکن مشرکین چونکہ ارواح کو فاعل مستقل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اس لیے ارواح سے مدد مانگنا قطعاً حرام ہوگا۔ حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں تردد اس میں ہے کہ اس شخص کو دائرۂ اسلام سے خارج کیا جائے یا نہیں یہ فعل چونکہ شرک کا مظہر اتم ہے اس لیے دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے خلاصہ کلام یہ کہ اوّل کی دو صورتیں قطعاً کفر اور شرک ہیں اور ان کا مرتکب دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور اخیر کی دو صورتیں قطعاً حرام ہیں تردد اس میں ہے کہ ایسے شخص کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج مانا جائے یا نہیں لیکن اگر ایسی شئے سے مدد مانگے کہ جس سے مدد مانگنا کفار اور مشرکین کے شعائر سے ہو۔ تو ایسی صورت میں اگر کوئی فقیہ اور مفتی زُنّار باندھنے والے کی طرح اس پر بھی ظاہر کے اعتبار سے کفر اور شرک کا فتویٰ دے اور کافر ہونے کا حکم لگائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ چونکہ وہ شئے شعار کفر اور شرک سے ہے اس لیے اس کی نیت کا اعتبار نہ کیا جائیگا البتہ امور عادیہ جو طاقت بشریہ کے تحت داخل ہوں اور کارخانۂ عالم اسباب ان کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو اور کسی شخص کو ان کے فاعل مستقل ہونے کا توہم بھی نہ ہوتا ہو۔ جیسے روٹی کی امداد سے بھوک دفع کرنا اور پانی کی امداد سے پیاس دفع کرنا تو یہ استعانت بالغیر جائز ہے بشرطیکہ اعتماد محض اللہ پر ہو اور غیر کو محض ایک ذریعہ اور وسیلہ اور عونِ الٰہی کا ایک مظہر سمجھے جیسے نل محض پانی کے آنیکا راستہ ہے اسی طرح اسباب فیض خداوندی کے راستے ہیں اصل دینے والا وہی ہے اور مشرک یہ سمجھتا ہے کہ یہ نل ہی مجھ کو پانی دے رہا ہے۔ اس لیے نل ہی سے پانی مانگتا ہے اور نل ہی کی خوشامد کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص دوا کو محض ایک وسیلہ سمجھے اور طبیب کو محض معالج جانے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن اگر دوا کو مستقل مؤثر سمجھے اور طبیب کو صحت بخشنے والا جانے تو یہ شرک ہوگا جاننا چاہیئے کہ اسباب شرعیہ کا بھی وہی حکم ہے کہ جو اسباب عادیہ کا حکم ہے صرف فرق اتنا ہے کہ اسباب عادیہ کا اسباب ہونا عادۃً سے معلوم ہوا اور اسباب شرعیہ کا سبب ہونا شریعت سے معلوم ہوا۔ پس جس طرح اسباب عادیہ سے استعانت اور استمداد جائز ہے اسی طرح اسباب شرعیہ مثل دعا اور رقیہ صبر اور نماز وغیرہ سے بھی استعانت جائز ہے اس لیے کہ ان امور کا اسباب ہونا شریعت سے معلوم ہوا۔ اور امور غیر عادیہ میں اگرچہ غیر کو مظہر عونِ الٰہی سمجھے اور اصل اعتماد بھی اللہ ہی پر ہو مگر چونکہ امور غیر عادیہ کا سبب نہ عادۃً ثابت ہے۔ نہ من جانب اللہ اور بالفرض اگر ثابت بھی ہو تو قطعی اور دائمی نہیں اسلیئے امور غیر عادیہ میں استعانت بغیر اللہ کفر اور شرک تو نہ ہوگی۔ مگر بدعت وضلالت ضرور ہوگی حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرّہٗ فرماتے ہیں

دریںجا باید فہمید کہ استعانت از غیر بوجہے	اس جگہ جاننا چاہیئے کہ غیر اللہ سے استعانت
کہ اعتماد بر آن غیر باشد و اورا مظہر عون	اس وقت حرام ہے کہ جب اعتماد اور
الٰہی ندانہ حرام است واگر التفات	بھروسہ اس غیر پر ہو اور اس غیر کو امداد
محض بجانب حق است و اورا یکے	الٰہی کا مظہر نہ سمجھے۔ اور اگر التفات اور

از مظاہر عون دانستہ و نظر بکارخانہ اسباب و حکمت او تعالیٰ در آں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید دور از عرفان نخواہد بود و در شرع نیز جائز و رواست و انبیاء و اولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند و در حقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لاغیر۔
(فتح العزیز صفحہ ۸)

اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

استعانت یا بچیزے است کہ توہم استقلال آں چیز در وہم و فہم ہیچ کس از مشرکین و موحدین نمے گزرد۔ مثل استعانت بحبوب و غلات در دفع گرسنگی و استعانت بآب در دفع تشنگی و استعانت برائے راحت بسایۂ درخت و مانند آں و در دفع مرض بادویہ و عقاقیر و در تعیین وجہ معاش بامیر و بادشاہ کہ در حقیقت معاوضہ خدمت بمال است و موجب تذلل نیست یا باطباء و معالجان کہ بسبب تجربہ و اطلاع زائد از نہا طلب مشورہ است و استقلالے متوہم نمی شود پس ایں قسم استعانت بلا کراہت جائز است زیرا کہ در حقیقت استعانت نیست و اگر استعانت است استعانت بخدا است و یا بچیزے نیست کہ توہم استقلال در مدارک مشرکین جا گرفتہ مثل استعانت

نظر صرف خدا پر ہو۔ اور اس غیر کو اعانت الٰہیہ کا محض مظہر جان کر کارخانۂ اسباب پر نظر کرتے ہوئے اس غیر سے ظاہری طور پر مدد چاہے تو خلاف عرفان نہیں اور شریعت میں بھی جائز ہے اور حضرات انبیاءؑ اور اولیاء نے بھی غیر اللہ سے اس قسم کی استعانت کی ہے اور چونکہ نظر صرف حق تعالیٰ پر ہے اس لیے یہ استعانت بالغیر نہیں بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

استعانت اور استمداد یا تو ایسی چیز سے ہے کہ موحدین اور مشرکین کو بھی اس کے مستقل ہونے کا شبہ نہیں ہوتا جیسے بھوک دفع کرنے کے لیے غلہ اور اناج سے مدد حاصل کرنا اور پیاس دفع کرنے کے لیے پانی اور شربتوں سے مدد حاصل کرنا اور راحت آرام حاصل کرنے کیلئے درخت کے سایہ سے مدد حاصل کرنا اور بیماری دفع کرنے کیلئے دواؤں اور بوٹیوں سے مدد حاصل کرنا معاشی امور میں امیر اور بادشاہ سے مدد چاہنا کہ جو درحقیقت معاوضہ خدمت ہے موجب تذلل نہیں۔ یا اطباء اور معالجین سے اُن کے تجربہ اور زیادتی واقفیت کی بناء پر مشورہ لینا ان صورتوں میں استقلال کا وہم بھی نہیں ہوتا پس اس قسم کی استعانت بلا کراہت جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ استعانت حقیقۃً نہیں محض ظاہری استعانت ہے حقیقۃً استعانت خدا تعالیٰ سے ہے۔ یا ایسی چیز کے ساتھ استعانت ہے کہ جس کا مستقل بالتاثیر ہونا مشرکین کے ذہنوں

بارواح و روحانیات فلکیہ یا عنصریہ یا ارواح سائرہ مثل بہوانی و شیخ سدو و زین خاں وایں نوع استعانت عین شرک است و منافی ملت حنفی (فتح العزیز ص۲۷)

میں جگہ لیے ہوئے ہے جیسے ارواح سے یا روحانیات فلکیہ اور عنصریہ سے استعانت کرنا یا ارواح سائرہ یعنی چلنے پھرنے والی ارواح سے مدد طلب کرنا جیسے بہوانی اور شیخ سدو اور زین خاں اس قسم کی استعانت عین شرک ہے اور ملت حنفیہ اسلامیہ کے بالکل منافی اور مباین ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔

ہم کو راہِ راست دکھا اور اس پر چلا اور منزلِ مقصود تک پہنچا

۱- ہدایت کے معنی لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں اسی وجہ سے یہ لفظ حقیقۃً ہمیشہ خیر ہی کے موقعہ پر مستعمل ہوتا ہے اور فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ۔ میں بطور تہکم اور بطریق استہزاء آیا ہے۔

۲- ہدایت کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے اگر ہدایت سے کسی شئی کی نشان دہی اور رہنمائی مراد ہو تو لفظ الیٰ کے ساتھ متعدی ہو گا۔ اور اگر ہدایت سے منزلِ مقصود تک پہنچنا مراد ہو تو لام کے ذریعے سے متعدی ہو گا۔ اور اگر راستہ کا قطع کرانا اور منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہو تو بلا واسطہ متعدی ہو گا جیساکہ اس آیت میں بلا واسطہ متعدی ہے۔ اس لیے ہم نے اس کے ترجمہ میں دکھانا اور چلانا اور پہنچانا تینوں چیزوں کا ذکر کیا۔

۳- حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں۔ جس میں پانچ باتیں پائی جائیں۔

۱- مستقیم یعنی سیدھا ہو۔ (۲) اور موصل الی المقصود ہو یعنی مقصد تک پہنچانے والا ہو (۳) اور سب سے زیادہ قریب اور نزدیک ہو۔ (۴) اور وسیع اور کشادہ ہو۔ (۵) اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔ جس راستہ میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں اسکو صراط کہتے ہیں جب تک یہ پانچ باتیں نہ پائی جائیں اس وقت تک صراط کا اطلاق نہیں کیا جائیگا۔

اس جگہ صراط کی صفت مستقیم ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے سب سے قریب راستہ یہی ہے اس لیے کہ اقلیدس کا قاعدہ ہے کہ جب دو نقطوں میں مختلف اور متعدد خطوط ملائے جائیں تو تمام خطوط میں سب سے قریب اور سب سے چھوٹا خط ہی خطِ مستقیم ہو گا اور سیدھا ہی راستہ منزل مقصود تک پہونچاتا ہے نیز خطِ مستقیم متغیر نہیں ہوتا اور غیر مستقیم متغیر ہو جاتا ہے اور اسی ایک راستہ کا تمام عالم کے مرور اور عبور کے لیے کافی ہونا اس کے وسیع ہونیکی دلیل ہے اور خدا

تک پہنچنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کما قال تعالیٰ

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا	اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی
فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ	راستہ پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ	مبادا تم کو خدا کے سیدھے راستہ سے نہ ہٹا دیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اے پروردگار میں عاجز اور ناتواں ہوں مجھکو قریب اور سیدھے راستہ سے اپنے تک پہنچا دے ٹیڑھے راستہ پر پڑجانے سے خطرہ ہے کہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچوں اور دور کے راستہ میں مشقت ہے۔

۴۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ صِرَاطَ مُسْتَقِيْم سے دین اسلام مراد ہے اور بعض احادیث صحیحہ سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے اسلام مراد ہے جو ما بین السّماء والارض سے بدرجہا زائد وسیع ہے۔ محمد بن الحنفیہ فرماتے ہیں کہ صراطِ مستقیم سے اللہ کا دین مراد ہے جسکے سوا اور کوئی دین مقبول نہیں (ابن کثیر)

۵۔ اس آیت میں صراط کو اہل انعام کی طرف مضاف فرمایا اس لیے کہ سیدھے راستہ پر چلنے والے یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص انعام فرمایا اور متعدد آیات میں صراط کو اللہ کی طرف مضاف فرمایا کما قال تعالیٰ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ صِرَاطِ اللّٰهِ۔ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ۔ اس لیے کہ وہ صراط مستقیم اللہ ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ قادیان کے دہقان یوں کہتے ہیں کہ نبیؐ کے راستہ پر چلنے سے آدمی نبی بن جاتا ہے۔ اللہ اکبر اگر یہی قاعدہ ہے تو پھر خدا کے راستہ پر چلنے سے خدا بن جانا چاہیئے اور تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۹ میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے ملائکہ اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین سب مراد ہیں لہٰذا قادیانیوں کے نزدیک فرشتوں کے راستہ پر چلنے سے فرشتہ بن جانا چاہیئے۔

۶۔ استقامت کے معنی توسط اور اعتدال کے ہیں جو ٹھیک افراط اور تفریط کے درمیان میں ہے حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت پر قدم کا ٹھیک جم جانا کہ اب ڈگمگانے کا احتمال نہ رہے اس کا نام استقامت ہے اور استقامت کا مقام نہایت بلند ہے اسی وجہ سے حضرات عارفین استقامت کو کرامت سے فوق اور برتر سمجھتے ہیں۔

۷۔ ہدایت اور استقامت کے مراتب نہایت مختلف اور متفاوت ہیں۔ ہدایت اور استقامت کا کوئی مرتبہ ایسا نہیں کہ اس کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ اور افضل مرتبہ نہ ہو۔ اور صراط مستقیم اگرچہ ایک ہے لیکن وسیع ہونے کی وجہ سے اور سالک کے سریع اور بطی ہونے کی وجہ سے اس میں بھی قرب اور بعد کا تفاوت ہوسکتا ہے اس لیے طلب ہدایت کا ہر شخص مامور ہے۔ طالب کو اگر ہدایت و استقامت کے بعض مراتب حاصل بھی ہوں تب بھی وہ ہدایت کے اعلیٰ مراتب سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

؎ اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروے میرسی بروے بایست

علاوہ ازیں ہدایت پر قائم اور ثابت رہنے کے لیے ہر لمحہ اور ہر لحظ اسکی اعانت اور توفیق کی حاجت ہے جیساکہ یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا۔ اے ایمان والو ایمان لاؤ۔ اس آیت میں ایمان داروں کو پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے اسلام پر ثابت اور مستقیم رہنا مراد ہے۔ اسی طرح اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ میں مزید ہدایت کی طلب اور ثابت قدمی اور استقامت کی دعا تعلیم کرنا مقصود ہے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۠[1]

یعنی ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تو نے اپنا ایسا خاص انعام فرمایا کہ اسی خاص انعام اور خاص فضل کی بنا پر وہ نہ تیرے مغضوب اور معتوب ہیں بلکہ تیرے مقرب اور محبوب ہیں۔ تیری رضا اور خوشنودی کا تمغہ اور پروانہ حاصل کیے ہوئے ہیں اور نہ وہ گمراہ ہیں۔ صحیح راستہ انکو معلوم ہے منزلِ مقصود سامنے ہے بصد ذوق و شوق خطِ مستقیم کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ یمین و یسار کی طرف التفات بھی نہیں کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پروردگارِ عالم ہم نابکاروں کو انعام اور اہلِ انعام کی راہ پر چلا اور دار الانعام میں پہنچا اور غضب اور ضلال کی راہ سے محفوظ اور دور رکھ اور اپنی توفیق اور اعانت کو ہمارا ہادی اور معین اور دستگیر بنا اور انبیاء و صدیقین و شہداء و صالحین کو رفیق طریق بنا تاکہ انکی معیت اور رفاقت میں اُفتاں و خیزاں تیری بارگاہ میں پہنچ سکیں آمین۔

پس قول اللہ تعالےٰ۔ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور قولہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

• ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ۔ سے ملائکہ اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین مراد ہیں۔ جن کو حق تعالےٰ نے اپنی اطاعت اور عبادت کی نعمت سے سرفراز فرمایا (ابن کثیر) اور انعام کی خاص نوع اور کسی خاص قسم کو نہ ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اے اللہ ہم پر ہر قسم کا انعام فرما اور وہ تمام الطاف و کرم اور وہ تمام آلاء و نعم

[1] غَیْرِ المغضوب علیہم چونکہ الذین انعمت کی صفت ہے اس لیے ہم نے ترجمہ میں اسکا لحاظ رکھا ہے کہ ترجمہ ہی سے اسکی صفت ہونا معلوم ہو جائے اور بعض نے اس طرح ترجمہ کیا ہے نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپکا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہوئے۔ انتہی یہ ترجمہ بتقدیر المضاف ہے۔ کما قال ابو حیان وقدر بعضهم فی غیر المغضوب محذوفا قال التقدیر غیر صراط المغضوب علیهم واطلق هذا التقدیر فلم یقیده بجر غیر ولا نصبه وهذا لا یتاتی الا بنصب غیر فیکون صفة لقوله الصراط وهو ضعیف الخ کذا فی البحر المحیط جلد ۱ ص ۳۰

جو تو نے اپنے تمام انعام والے بندوں پر متفرقاً نازل فرمائے وہ ہم پر مجتمعاً نازل فرما۔ آمین
نیز لفظ صراط کو اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۔ کی طرف مضاف کرنے میں سالکین راہِ حق اور راہروانِ منزلِ آخرت کے لیے ایک عظیم الشان تسلیہ ہے کہ وہ سفر اور راستہ کی تنہائی سے ہرگز نہ ڈریں نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین انکے رفیق سفر ہیں۔ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا۔
نیز مقامِ سوال میں منعم کے انعامات و احسانات کا تذکرہ۔ اجابت اور قبول میں خاص اثر رکھتا ہے اسی طرح سوالِ ہدایت کے وقت حق جل و علا کے انعامِ عام کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اے ربّ العالمین اور اے ارحم الراحمین تو نے اپنی رحمت واسعہ سے بہت بندوں پر ہدایت کا انعام فرمایا ہم کو بھی اس نعمت عظمٰی سے سرفراز اور اس پر استقامت نصیب فرما۔ اور ہم گنہگاروں کو بھی اپنے لطفِ عمیم سے اہلِ انعام کے زمرہ میں داخل فرما۔ آمین۔
مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے وہ فریق مراد ہے جو دیدہ و دانستہ راہِ راست کو چھوڑ دے اور علمِ صحیح کے باوجود ہوائے نفس کی پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے۔ اس نوع کے کامل ترین افراد یہود بے بہبود ہیں کہ باوجود تورات کے عالم ہونے کے کتمانِ حق اور استکبار اور اتباع ہویٰ جیسے امراض میں مبتلا رہے۔
انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہمیشہ معاندانہ رویہ رکھا، جان بوجھ کر قتلِ انبیاء اللہ کے مرتکب ہوئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر اب تک ذلت و مسکنت کی مہر لگا دی گئی۔ غضب اور لعنت کا طوق انکی گردنوں میں ڈالدیا گیا۔ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ۔
اور ضَآلِّیْنَ سے وہ گروہ مراد ہے جو سواء السبیل سے بھٹک کر غلط راستہ پر جا پڑا۔ اس نوع کے کامل ترین افراد نصاریٰ ہیں۔ کما قال تعالیٰ۔

وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔ بہتوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

یہود اور نصاریٰ کے کامل ترین افراد ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغضوب علیہم کی تفسیر یہود سے اور ضالین کی تفسیر نصاریٰ سے فرمائی۔ اسکا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مغضوب علیہم اور ضالین کے مصداق صرف یہود اور نصاریٰ ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان دو قسموں کے تحت میں ہر قسم کے گمراہ اور کافر اور فاسق و فاجر عاصی اور مبتدع علی اختلاف المراتب داخل ہیں مگر یہود مغضوب علیہم کے کامل ترین فرد اور نصاریٰ ضالین کے اولین مصداق ہیں۔ سلف صالحین یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امت کے علماء میں سے جو بگڑا وہ یہود کے مشابہ ہوا اس لیے کہ وہ اپنی اغراض کی وجہ سے کلمات الہیہ کی تحریف اور کتمانِ ما انزل اللہ اور تلبیس الحق بالباطل اور اہل علم و فضل کے حسد میں گرفتار ہوا۔ کہ یہود کے اخلاق ہیں اور اس امت کے عباد اور زہاد سے جو بگڑا وہ

نصاریٰ کے مشابہ ہوا۔ اس لیے کہ اس نے اپنی عبادت میں بجائے شریعت غراء اور سنّت بیضاء کے ہوائے نفس کا اتباع کیا اور نصاریٰ کی طرح تعظیم مشائخ میں اس درجہ کا غلو کیا کہ اعتقاداً نہ سہی عملاً تو ضرور ان کو رب اور ان کی قبور کو مساجد بنا لیا۔ بعض مرتبہ چونکہ نعمت ہی علم وعمل کے فساد کا باعث ہوتی ہے اکثر عیش اور تنعم ہی میں پڑکر انسان خدا کو بھول جاتا ہے، احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے اس لیے الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کے بعد غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ کا اضافہ مناسب ہوا کہ اے رب العالمین اپنی نعمتوں پر حمد وشکر کی توفیق عطا فرما خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ تیرے انعام کے بعد غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر سیدھے راستہ سے بہک جائیں اور تیری لعنت وغضب کے مستحق بنیں۔ اپنی نعمت کو اطاعت کا ذریعہ بنا معصیت کا سبب نہ بنا۔

آیت موصوفہ میں صرف انعام کو اپنی جانب منسوب فرمایا۔ غضب اور ضلال کو اپنی جانب منسوب نہیں فرمایا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ انعام محض اسکا فضل ہے بلا کسی استحقاق کے بندوں پر مبذول فرماتا ہے۔ مگر غضب ابتداءً نازل نہیں فرماتا۔ بلکہ ان کی نافرمانی اور دیدہ ودانستہ عدول حکمی کے بعد اور علیٰ ہذا گمراہ جب ہوتے ہیں کہ جب صراط مستقیم کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

نیز ادبِ الٰہی کا اقتضاء یہ ہے کہ جب افعال احسان ورحمت کا ذکر ہو تو صراحتہً اللہ جل جلالہٗ کی طرف اُس کی اسناد ہونی چاہیئے۔ اور جب افعال جزاء اور عقوبت کا ذکر ہو تو پھر فاعل کا حذف اور فعل کا مبنی للمفعول لانا مناسب ہے مثلاً ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَهُوَ یَهۡدِیۡنِ وَالَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ۔

جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھ کو راہ دکھاتا ہے اور وہی مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

خلق اور ہدایت اور اطعام اور اسقاء اور شفاء ان تمام افعال کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ مگر مرض کو شئی مکروہ ہونے کی وجہ سے ادباً اپنی جانب منسوب کیا اور یہ کہا۔

وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ۔

جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفاء دیتا ہے۔

اور یہ نہیں کہا

وَ اِذَا اَمۡرَضَنِیۡ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِیۡ

کہ جب وہ مجھ کو بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو وہی مجھ کو شفاء دیتا ہے۔

اور مؤمنین جن نے کہا۔

وَ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ۔ — اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا یا انکے رب نے ان کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔

میں ارادۂ شر کو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب نہیں کیا اور صیغۂ مجہول کے ساتھ اس کو ذکر کیا۔ یعنی شَیْءٌ اُرِیْدَ کہا اور اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا۔ میں ارادۂ رشد کو رب العزت کی جانب منسوب کیا۔

اور علیٰ ہذا خضر علیہ السلام نے فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا (میں نے ارادہ کیا اس کشتی کو عیب دار بنا دوں) عیب اور ارادۂ عیب دونوں کو اپنی جانب منسوب کیا اور۔

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ یَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ — تیرے رب نے ارادہ کیا وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں۔ اور خدا کی مہربانی سے اپنا خزانہ نکالیں۔

اس آیت میں ارادۂ رحمت کو ربُّ العالمین کی جانب منسوب کیا اور وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا) کہہ کر اس کو اور مؤکد کر دیا۔

اور اسی طرح

اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ — روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مخالطت تمہارے لیے حلال کر دی گئی۔
اور اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ — ان محرمات کے سوا اور عورتیں تمہارے لیے حلال کر دی گئیں۔

میں اس خاص اِحلال کو چونکہ اللہ جل جلالہٗ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب تھا۔ اس لیے دونوں جگہ اُحِلَّ کو مبنی للمفعول ذکر کیا گیا۔

اور اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا میں یہ مانع نہ تھا۔ اس لیے اس تحلال اور تحریم کی اسناد صراحۃً اللہ کی طرف کی گئی۔

نیز منعم حقیقی صرف وہی تبارک وتعالےٰ ہے کما قال تعالےٰ۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ اس لیے انعام کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا۔ اور غضب خدا کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ملائکہ اور انبیاء اور عباد صالحین کی طرف سے بھی خدا کے نافرمان اور سرکش بندوں پر ہو سکتا ہے۔

نیز مغضوب علیہم کے فاعل کا حذف اہل غضب کی تحقیر اور تذلیل کی طرف مشیر ہے اور انعام کے فاعل کی تصریح اہل انعام کے تشریف و تکریم کی طرف مشیر ہے۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا ھٰذا

الذی اکرمہ السلطان و خلع علیہ (بادشاہ نے اس شخص کا اکرام کیا اور اس کو خلعت عطا کیا) بہ نسبت ھذا الذی اُکرِم وَخُلِعَ عَلَیْہِ (اس شخص کا اکرام کیا گیا اور اس کو خلعت دیا گیا) کے بدرجہا بلیغ ہے اور ذکر فاعل کی وجہ سے یہ پہلا کلام جس قدر ممدوح کی مدح و ثناء اور تشریف و تکریم پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرا کلام اس دلالت میں اس کے پاسنگ بھی نہیں۔

نیز حذف فاعل کچھ اعراض اور ترک التفات پر دلالت کرتا ہے جو اہل غضب کے مناسب ہے، اہل انعام کے مناسب نہیں اس لیے انعام کا فاعل ذکر کیا گیا اور غضب کا فاعل حذف کیا گیا اور چونکہ انعام کی ضد غضب ہے۔ ضلال انعام کا مقابل نہیں بلکہ رشد اور ہدایت کا مقابل ہے اس لیے اہل انعام یعنی اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ کے بعد متصلاً ہی اہل غضب یعنی غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ۔ کا ذکر فرمایا اور اہل ضلال کو بعد میں ذکر کیا۔ کیونکہ ایک ضد کے بعد دوسری کا ذکر کلام میں ایک خاص شان اور خاص تناسب پیدا کر دیتا ہے۔

اور اہل غضب کی تقدیم کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ یہود بہ نسبت نصاریٰ کے اسلام سے زیادہ دور ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے صرف ایک نبی یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور یہود نے دو پیغمبروں کی یعنی مسیح بن مریمؑ اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی حق تعالیٰ شانہٗ نے غیر المغضوب علیہم کو لفظ غیر کے ساتھ ذکر فرمایا اور حرف لا کے ساتھ یعنی لا المغضوب علیھم نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ حرف لا فقط ما قبل کی نفی کے لیے آتا ہے اس صورت میں کلام کے یہ معنی ہوئے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا نہ اہل غضب کا۔ اور لفظ غیر ما قبل کی نفی اور مغایرت دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ مغایرت پر صراحۃً اور نفی ما قبل پر ضمناً۔ اس صورت میں یہ معنی ہونگے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا جن کا راستہ اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے بالکل مغایر اور مباین ہے خود اہل انعام اور انکا راستہ غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکلیہ پاک ہے۔ اہل فہم غور کریں کہ یہ معنی بہ نسبت پہلے معنی کے کس قدر لطیف ہیں اور کیا یہ لطافت بجائے لفظ غیر کے حرف لا، لانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کلّا، ہرگز نہیں۔

نیز لفظ غیر کے لانے میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا یہ زعم کہ ہم ہی اہل انعام ہیں جیسا کہ وہ کہتے تھے۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ۔ غلط ہے بلکہ اہل انعام ان کے سوا اور غیر ہیں۔ کما قال تعالیٰ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔	آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں حرف عاطف یعنی واؤ کے ہوتے ہوئے حرف لا کا اس لئے اضافہ

فرمایا تاکہ اہل انعام کے راستہ کا اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے فرداً فرداً اور علیحدہ علیحدہ مغائر ہونا معلوم ہو جائے وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے اگر حرف لا کو حذف کر کے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ الضَّآلِّيْنَ کہا جائے تو مجموعۂ فریقین کے راستہ سے اہل انعام کے راستہ کا مغایر ہونا مفہوم ہو گا۔ اہل انعام کے راستہ کا ہر واحد سے علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم نہ ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ مجموع من حیث المجموع کی مغایرت ہر واحد کی مغایرت کو مستلزم نہیں۔ ہاں ہر واحد کی مغایرت مجموع من حیث المجموع کی مغایرت کو بالاولویت مستلزم ہے فافھم ذلک واستقم۔

اسرارِ مجموعۂ سورت

۱۔ اس سورت میں دس چیزیں مذکور ہیں۔ پانچ چیزیں خدا تعالیٰ کے متعلق ہیں اور پانچ بندوں کے متعلق ہیں۔ خدا تعالیٰ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں۔ الوہیت۔ ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت بندہ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں۔ عبادت۔ استعانت۔ طلب ہدایت۔ طلب استقامت طلب نعمت۔

بندہ کی یہ پانچ صفتیں اسی ترتیب سے خدا تعالیٰ کی پانچ صفتوں سے متعلق ہیں اور معنی کلام یہ ہیں کہ اے خدا تعالیٰ ہم خاص تیری عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ تو ہمارا اللہ یعنی معبود ہے اور خاص تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اس لیے کہ تو ہی تمام جہانوں کا مربی اور پرورش کرنے والا ہے اور تجھ ہی سے ہدایت کی درخواست کرتے ہیں۔ اس لیے کہ تو رحمٰن ہے تیری رحمت اور مہربانی عام ہے اور تجھ ہی سے استقامت کی التجا کرتے ہیں اس لیے کہ تو رحیم ہے۔ تیری خاص رحمت خاص اہل ایمان اور اہلِ ہدایت ہی پر مبذول ہے اور تجھ ہی سے انعام کے امیدوار ہیں۔ اس لیے کہ تو ہی جزاء اور سزا کا مالک ہے ایسی کامل نعمت ہم کو عطاء فرما کہ جو غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکل پاک ہو (تفسیر کبیر ص ۱۵۱ جلد ۱)

۲۔ نیز بندہ جب مقامِ مناجات میں کھڑا ہوا اور خدا کی صفاتِ کمال بیان کرتا ہوا مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک پہنچا تو بے اختیار سیر الی اللہ کا شوق دامنگیر ہوا۔ ارادہ سفر کا مصمم کیا تو سفر کے لیے عبادت کا توشہ لیا۔ اور استعانت اور امداد خداوندی کی سواری پر سوار ہوا۔ زاد اور راحلہ کے مکمل ہو جانے کے بعد راستہ معلوم کیا۔ جب سیدھا راستہ معلوم ہو گیا تو رفقاء طریق کی فکر ہوئی کہ جن کی رفاقت اور معیت سے راستہ سہولت سے قطع ہو اور راہزنوں یعنی اہلِ غضب اور اہلِ ضلال کا کوئی خدشہ اور دغدغہ باقی نہ رہے۔ (تفسیر عزیزی ص ۴۸)

۳۔ جن علوم کی حضرات انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعوت دی۔ وہ تین علم ہیں۔ علمِ شریعت۔ علمِ

طریقت۔ علم حقیقت اور پھر علم شریعت کی دو قسمیں ہیں۔ اول علم عقائد۔ دوم علم احکام۔ سو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں الٰہیات یعنی خدا تعالےٰ کی ذات وصفات کا بیان ہے اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ الخ میں ہدایت اور ضلالت سعادت اور شقاوت کا بیان ہے اور چونکہ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے انبیاء و صدیقین شہداء اور صالحین مراد ہیں اس لیے اس آیت میں مباحث نبوت و امامت کی طرف اشارہ ہے اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں علم احکام کی طرف اشارہ ہے علم طریقت جس میں نفس اور قلب کے امراض اور معالجات سے بحث کی جاتی ہے۔ اسکے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ توحید فی العبادۃ ہے کہ سوائے خدا تعالےٰ کے کسی کی عبادت نہ کرے۔ دوسرا مرتبہ توحید فی الاستعانت ہے یعنی سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگے۔ تیسرا مرتبہ استقامت ہے یہ سلوک کا اعلیٰ مرتبہ ہے کہ طریق عبودیت اور جادۂ اخلاص ومحبت پر قدم ایسا ٹھیک جم جائے کہ ذرہ برابر ادھر اُدھر ہٹنے نہ پائے ان مراحل اور مقامات کے طے ہو جانے کے بعد درجہ ہے مکاشفات اور تجلیات کا کہ قلب پر سحائب الہام کی بارش ہونے لگے اور علوم اور معارف اسرار اور لطائف منکشف ہونے لگیں۔ یہ علم حقیقت ہے اللہ تعالےٰ جس پر چاہے اپنا انعام فرمائے۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ میں اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ

اس سورت کے ختم پر آمین کہنا مسنون ہے اور لفظ آمین اسم فعل ہے یعنی یہ کلمہ دراصل تو اسم ہے مگر معنی میں فعل کے ہے یعنی افعل (ایسا ہی کر) کے معنی میں ہے جیسے رُوَیْدَ اور حَیَّھَلْ اور ھَلُمَّ۔ اسماء افعال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ جو ہم نے تجھ سے مانگا ہے وہی کر دے یعنی اہل انعام کے راستہ پر چلا اور اہل غضب اور اہل ضلال سے ہم کو الگ رکھ اور لفظ آمین بالاتفاق سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں بلکہ جس طرح عام دعاؤں کے بعد آمین کہنا سنت ہے اسی طرح الحمد کے بعد بھی آمین کہنا بالاتفاق سنت ہے۔ اختلاف صرف اسمیں ہے کہ آمین آہستہ کہنا بہتر ہے یا آواز سے جمہور صحابہؓ وتابعین کا یہی مذہب ہے کہ آہستہ کہنا بہتر ہے اور یہی امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ کا قول ہے کیونکہ آمین دعا ہے اور دعا کے آہستہ مانگنے کا حکم قرآن کریم میں صراحۃً موجود ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ اور صحیح حدیثوں میں قولوا آمین یعنی آمین کہنے کا حکم آرہا ہے جس سے جہر ثابت نہیں ہوتا ورنہ قولوا التحیات للّٰہ الخ اور قولوا ربنا لك الحمد (متفق علیہ) میں بھی جہر کا قائل ہونا پڑے گا حالانکہ امت کا کوئی عالم اس کا قائل نہیں دلائل کی تفصیل شرح بخاری اور شروح ہدایہ میں دیکھیں۔

صلوٰۃِ مسلمین اور صلوٰۃِ نصاریٰ کا تقابل

کلام الٰہی کے دقائق و اسرار کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے۔ بڑے سے بڑے فہیم اور ذکی اور صاحب فہم ثاقب کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔ یہ مختصر سورت یعنی سورہ فاتحہ جس کے معارف و لطائف کا ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اس کے وہ اسرار و معارف جو اللہ رب العزت کے علم میں ہیں وہ تو درکنار، علمائے اسلام اور حضرات مفسرین نے جو اس مختصر سورت کے حقائق و معارف بیان فرمائے ہیں۔ ہم انہیں کے استیعاب اور استقصاء سے عاجز اور درماندہ ہیں جسکی تصدیق علماء اسلام کے تفاسیر سے بخوبی ہوسکتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ سورۂ فاتحہ جیسی سورت نہ توریت میں اتاری گئی اور نہ زبور میں اور نہ انجیل میں (اخرجہ الترمذی وصححہ)

اسی وجہ سے ہر نماز میں اس سورت کا پڑھنا لازم قرار دیا گیا۔ اس وقت ہم انجیل کی وہ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس کو نصاریٰ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ تاکہ دونوں کے موازنہ اور مقابلہ سے اہل اسلام کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہو اور نصاریٰ کے لیے اگر وہ خدا سے ڈریں اور غور و فکر سے کام لیں تو اُن کے لیے موجب ہدایت ہو۔

انجیل متی باب ششم آیت نہم میں ہے کہ اس طرح نماز پڑھا کرو۔

اَبُوْنَا الَّذِیْ فِی السَّمٰوٰتِ لِیَتَقَدَّسْ اِسْمُكَ لِتَاْتِ مَلَكُوْتُكَ

اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک ہو۔ تیری بادشاہت آنی چاہیئے تیری

لِتَكُنْ مَشِیْئَتُكَ كَمَا فِی السَّمَآءِ عَلَى الْاَرْضِ خُبْزَنَا كَفَافَنَا اَعْطِنَا

مشیت جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ایسے ہی زمین پر بھی ہو ہماری روز کی روٹی

الْیَوْمَ وَاغْفِرْ لَنَا خَطَایَانَا كَمَا نَغْفِرُ نَحْنُ لِمَنْ اَخْطَأَ اِلَیْنَا۔ وَلَا تُدْخِلْنَا

آج ہمیں دے اور ہماری خطاؤں کو معاف کر جیسا کہ ہم اپنے خطاکاروں کی خطائیں معاف

فِی التَّجَارِبِ لٰكِنْ نَجِّنَا مِنَ الشِّرِّیْرِ اٰمِیْنَ۔

کرتے ہیں اور ہم کو آزمائش میں نہ لا بلکہ بُرے لوگوں سے بچا آمین۔ یعنی قبول فرما۔

ارباب فہم و بصیرت اگر سورۂ فاتحہ کے بعد اس عبارت پر ایک نظر ڈالیں تو انکو بخوبی منکشف ہوجائیگا کہ اس عبارت کو سورۂ فاتحہ کیساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو ثریٰ (خاک) کو ثُریّا سے ہے صیغۂ امر سے تقدیس اسم اور اتیانِ ملکوت کو طلب کرنا محض لاطائل اور تحصیل حاصل ہے وہ ہمیشہ سے قدوس اور سلام اور ملیک مقتدر اور عزیز و حکیم ہے اُس مالک الملکوت اور قدوس و حکیم کی شان میں یہ لفظ

کہنا کہ چاہیئے کہ تیرا نام پاک ہو اور تیری بادشاہت آئے سراسر خلاف ادب ہے
اور علیٰ ہذا یہ کہنا (لتکن مشیتک کما فی السّماء علی الارض) چاہیئے کہ تیری مشیت جیسے آسمان میں ہے ویسے ہی زمین میں بھی ہو۔ یہ بھی سراسر خلاف ادب ہے کیا اس کی مشیت سبع سمٰوات اور سبع ارضین میں جاری اور ساری نہیں ؟ اور کیا کوئی ذرہ اس کی قدرت اور مشیت سے مستثنیٰ ہے ؟ حاشا و کلا۔ بَلٰی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔ اور علیٰ ہذا آج کی روٹی کے سوال کو ہدایت اور صراط مستقیم کے سوال (جو دنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح اور سعادت دارین کو علی وجہ الاتم شامل ہے ۔ اس سے کیا نسبت ؟ اور پھر اس غفور رحیم اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ سے یہ سوال کرنا کہ ایسی مغفرت عطا فرما جیسا کہ ہم اپنے گنہگاروں اور خطا کاروں کی مغفرت کرتے ہیں کھلی ہوئی سفاہت اور صریح گستاخی ہے اس کی کامل وعظیم اور وسیع وعمیم مغفرت کو اپنی ناقص اور محدود اور برائے نام مغفرت کے ساتھ تشبیہ دینا اور در پردہ اپنے خطا کاروں کو خدا کے خطاروں کے ساتھ مماثل بتلانا اور ضمناً اپنی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی کے ہم پلہ قرار دینا کیا یہ کھلی ہوئی گستاخی نہیں ؟

اُس رب العالمین اور اس حنان ومنان کے تمام آلاء ونعم میں سے صرف آج کی روٹی کا سوال کرنا۔ رب غفور اور ارحم الراحمین سے اپنی ناقص اور محدود مغفرت کے مماثل مغفرت طلب کرنا۔ نصاریٰ کے فہم وفراست کو خوب واضح کرتا ہے ۔ اخیر میں لفظ آمین مذکور ہے ۔ جو اہل اسلام سے سرقہ ہے سوائے اہل اسلام کے دنیا میں کوئی بھی آمین کو نہیں جانتا ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

---

۲ سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۸۷ — اٰیَاتُهَا ۲۸۶ — رُكُوْعَاتُهَا ۴۰

سورۂ بقرہ مدنی ہے اس کی دو سو چھیاسی آیتیں ہیں اور چالیس رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚۛ فِيْهِ ۚۛ

الم اس کتاب میں کچھ شک نہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُورۂ بقرہ کی تفسیر

اس سُورۃ کو سُورۂ بقرہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ذبح بقرہ کا واقعہ مذکور ہے جو حق جل وعلا کی الوہیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اس لیے کہ ایک مقتول کا محض ایک مذبوحہ گائے کا ایک ٹکڑا لگا دینے سے زندہ ہو جانا فقط اس فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ کے ارادہ اور مشیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا کسی مادہ اور طبیعت کے اقتضاء کو اس میں اصلاً دخل نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ واقعہ منکرین حشر اجساد کے لیے ایک عظیم الشان حجت ہے کہ وہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی مردوں کو اسی طرح زندہ فرمائے گا۔ جس طرح اس مقتول کو زندہ فرمایا۔ نیز یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے ایک معجزہ تھا جو اُن کی نبوت اور رسالت کی تصدیق کے لیے من جانب اللہ ظاہر کیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ بقرہ کا یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور احیاء موتیٰ اور قیامِ قیامت، تینوں کی دلیل ہے اور یہی تین امور قرآن کریم کے اعظم مقاصد ہیں۔ نیز[۲] اس واقعہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ صراطِ مستقیم کا اقتضاء یہی ہے کہ بغیر تفتیش اور تفحص کے انبیاء کرام کی اطاعت کی جائے جس چیز کا حضرات انبیاءؑ حکم دیں اس کو بے چون و چرا قبول کیا جائے۔ حضرات انبیاءؑ کے حکم کے بعد تفتیش میں پڑنا شک اور نفاق کی علامت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پر اطمینان ہوتا تو اس تفتیش کے خلجان میں نہ پڑتا

[۲] سورۂ بقرہ اور سورۂ فاتحہ کے باہمی ربط کی طرف اشارہ ہے فافہم ذلک واستقم ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ

اور حضرات انبیاء کی اطاعت سے انحراف ضلال مبین (کھلی گمراہی) ہے۔ اور ان حضرات سے حجتیں کرنا موجب غضب اور لعنت ہے اعاذنا اللہ تعالیٰ من ذلک آمین۔ نیز[۳] دنیا کی محبت ہی تمام فتنہ اور فساد کی جڑ ہے۔ جب دنیا کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو اعزہ اور اقارب کی محبت بھی دل سے نکل جاتی ہے اللہ جل جلالہٗ کی ہدایت اور انبیاء کرام کی نصیحت جب ہی نفع دیتی ہے کہ دل میں خدا کا خوف اور کچھ ڈر ہو۔ جب خدا کا خوف دل میں ہوتا ہے تب ہی صراطِ مستقیم اور راہِ حق کی تلاش اور خداوند ذوالجلال کے غضب اور لعنت سے بچنے کی فکر ہوتی ہے ورنہ جس شقی اور بدبخت کا دل خدا کے خوف سے خالی ہے اس کے حق میں انبیاء کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔ نیز[۴] سورۂ فاتحہ میں ہدایت اور صراطِ مستقیم کا ذکر تھا اور سورۂ بقرہ میں شروع ہی سے ہدایت اور صراطِ مستقیم کا ذکر فرمایا۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ۔ ابتداء ہی میں ہدایت کا ذکر فرمایا اور پھر یہ بتلایا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے۔ وہ ایمان اور تقویٰ اور اعمالِ صالحہ کی راہ ہے پھر یہ بتلایا کہ یہ ہدایت کی نعمت کس کو نصیب ہوئی۔ اور کون اس دولت وسعادت سے محروم رہا۔ هُدًى سے أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ تک اس فریق کا ذکر فرمایا جس کو ہدایت نصیب ہوئی اور جو ظاہراً اور باطناً اللہ کی ہدایت اور صراطِ مستقیم پر چلنے والے تھے۔ اور پھر اہل غضب اور اہل ضلال کے دو فرقوں کا ذکر فرمایا ایک کافرین مجاہرین جو ظاہراً اور باطناً صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے تھے۔ دوم منافقین جو ظاہراً صراطِ مستقیم پر تھے اور باطناً غضب اور ضلال کی راہ پر تھے۔ اور چوتھی قسم یعنی جو ظاہراً تو غضب اور ضلال کی راہ پر ہو اور معنیً صراطِ مستقیم پر ہو یہ قسم عقلاً اور شرعاً باطل ہے اس لیے اس قسم کو ذکر نہیں فرمایا۔ نیز[۵] سورۂ فاتحہ میں حق تعالیٰ شانہ کی ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر تھا اس لیے سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں صحیفۂ[۲] ہدایت کا ذکر فرمایا کہ جس سے بڑھ کر کوئی تربیت اور رحمت نہیں پھر كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ۔ الخ میں اس ظاہری ربوبیت اور رحمت کا ذکر فرمایا جسکا تمام نوع انسانی سے تعلق ہے اور يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا میں تمام لوگوں کو اپنی عبادت اور بندگی کا خطاب عام فرمایا۔ بعد ازاں اس خاص ربوبیت اور اس خاص رحمت کا ذکر فرمایا کہ جو دو خاص فرقوں سے متعلق تھی۔ ایک فرقہ بنی اسرائیل دوم فرقۂ بنی اسماعیل پھر مسئلہ ملت اسلام اور قبلۂ اسلام کا ذکر فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ ملتِ ابراہیمی اور قبلۂ ابراہیمی کا اتباع ہی صراطِ مستقیم ہے اور اس راہ سے اعراض سراسر سفاہت اور حماقت ہے اور آیت۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ

[۱] اسمیں بھی ربط کی طرف اشارہ ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ اور سواء علیهم أأنذرتهم أم لم تنذرهم کو مغضوب علیهم اور ضالین کے ساتھ کیا ربط ہے ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔ [۲] یعنی ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۱۲ منہ۔

وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ۔ میں جو ٹھیک سورۂ بقرہ کے نصف پر ہے صراطِ مستقیم کی تفصیل فرمائی کہ صراطِ مستقیم اللہ اور یوم آخرت اور ملائکہ اور انبیاء پر ایمان لانا ہے گویا کہ یہ آیت اَلَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ کی تفسیر ہے کہ غیب سے یہ چیزیں مراد ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں بعد ازاں اخیر سورت تک احکام کا سلسلہ چلا گیا۔ اخیر سورت میں اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ الایۃ میں پھر صراطِ مستقیم کی حقیقت اور ایمان بالغیب کی کیفیت کو واضح فرمایا اور مغفرت اور رحمت اور نصرت کی دعا پر سورت کو ختم فرمایا خلاصۂ کلام یہ کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی ہدایت اور صراطِ مستقیم اور رحمت اور ربوبیت کا ذکر فرمایا اور درمیان میں بھی اور اخیر میں بھی گویا کہ یہ تمام سورت سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور تشریح ہے۔

الٓمّٓ

اس قسم کے حروف جو سورتوں کے ابتداء میں ذکر کیے جاتے ہیں ان کو "حروفِ مقطّعات" کہتے ہیں اس لیے کہ یہ کلمات حروف تہجی کی طرح جدا جدا پڑھے جاتے ہیں اس لیے مقطعات (جدا جدا) کہلاتے ہیں انکے بارہ میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔

۱۔ خلفاء راشدین اور جمہور صحابہؓ اور تابعینؒ کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ان کی مراد معلوم نہیں۔ کما قال تعالیٰ۔

وَ مَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ — ان متشابہات کی حقیقت سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔

(۲) بعض سلف اور جمہور متکلمین اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک حروف مقطعات اُن سورتوں کے نام ہیں جنکے شروع میں یہ مذکور ہیں جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل مذکور ہیں یہ حروف مقطعات اس تفصیل کا اجمال ہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری کا نام (الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ) کتاب موصوف کے تمام مفصل مضامین کا اجمال ہے جس طرح مرکبات کلامیہ کا مفید معنی ہونا انکے اجزاء یعنی کلمات مفردہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا مفید معنی ہونا حروف ہجائیہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے جس درجہ کلام میں ترکیب ہوگی اسی درجہ معنی میں بھی ترکیب ہوگی یہی وجہ ہے کہ مرکبات اضافیہ اور مرکبات توصیفیہ کے معنی میں اتنی ترکیب نہیں جتنی کہ مرکبات تامہ خبریہ کے معنی میں ترکیب ہے ترکیب لفظی کے انحطاط سے ترکیب معنوی میں بھی انحطاط آگیا

مرکبات اضافیہ اگرچہ فی حد ذاتہا مرکبات ہیں مگر

مرکبات تامہ خبریہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں اور اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے مگر حروف ہجائیہ مادۂ کلمات ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے بسیط ہیں پس اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی انتہا درجہ کی بساطت اور غایت درجہ کا اجمال ہوگا جن کا بغیر تفہیم الٰہی اور بدون تائید غیبی کے سمجھنا ناممکن اور محال ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے "فوز الکبیر" میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے۔ علامہ آلوسی رحؒ فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کے اسرار اور رموز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد انہی حضرات پر منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ خاص طور پر علوم نبوت کے وارث بنائے گئے بلکہ کسی وقت حروف مقطعات خود بخود اُن وارثین علوم نبوت کے سامنے اپنے اندرونی اسرار اور رغوامض بولنے لگتے ہیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر سنگریزے تسبیح پڑھتے تھے اور صحابہؓ کرام اپنے کانوں سے سنگریزوں کی اس تسبیح کو سنتے تھے۔ اور گوہ اور ہرن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرتے تھے باقی ہم جیسوں کا حروف مقطعات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہنا ہرگز اس کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کہ نفس الامر اور واقع میں یہ حروف معانی اور حقائق سے عاری ہیں۔ (روح المعانی) حدیث میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظہر ہے اور ایک بطن ہے یعنی ظاہری معنی کے علاوہ اس آیت کے کچھ باطنی اور معنوی اسرار اور لطائف بھی ہوتے ہیں جنکو ارباب باطن ہی سمجھتے ہیں اور وہ باطنی اسرار۔ مدلول لفظی کے ماتحت ہوتے ہیں مخالف نہیں ہوتے ہیں بلکہ باطنی اسرار کے حق اور باطل ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ آیت کے ظاہری مدلول کے مطابق ہوں نہ کہ مخالف۔ کیونکہ شرط یہ ہے کہ وہ باطنی معنی ظاہری مدلول کے ماتحت ہوں اور ظاہر ہے کہ ماتحت ہو کر مافوق کا مخالف کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حروف مقطعات ظاہر کے اعتبار سے مجہول الکنہ اور غیر معلوم المراد ہوں اور باطن کے اعتبار سے ارباب باطن کے نزدیک معلوم المراد ہوں۔

۳۔ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات۔ حروف تہجی کے اسماء ہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کا مادہ اور عنصر یہی حروف تہجی ہیں۔ انہی سے مل کر کلام بنتا ہے۔ قرآن کریم کی بعض سورتوں کو ان حروف سے شروع کرنے میں اعجاز قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن جس کے کلام الٰہی ہونے کا تم لوگ انکار کرتے ہو وہ انہی حروف سے مرکب ہے جن سے تم اپنے کلام کو ترکیب دیتے ہو پس اگر یہ قرآن خدا کا کلام نہیں تو تم اس جیسے کلام کے بنانے سے کیوں عاجز ہو پھر اس ذاتی اعجاز کے علاوہ اس پر بھی تو نظر کرو کہ ان مقطعات کا پیش کرنے والا شخص محض امی ہے جس نے نہ کبھی کسی مکتب کا دروازہ جھانکا اور نہ کسی استاذ اور کاتب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور تم فصحاء اور بلغاء اور ادباء اور خطباء ہو اور اس نبی امی نے جن حروف کو پیش کیا ہے ان میں ایسے ایسے دقیق اور نکات کی رعایت کی گئی ہے کہ جن کی بڑے سے بڑا ادیب اور ماہر عربیت بھی رعایت

نہیں کر سکتا۔ ؎

صد ہزاراں دفتر اشعار بود ؛ پیش حرف اُمیش آں عار بود

مثلاً یہ کہ قرآن مجید کی انتیس سورتوں میں جو شمار کے اعتبار سے حروف تہجی کے برابر ہیں۔ چودہ حروف لائے گئے ہیں جو حروف تہجی کا نصف ہیں۔ نیز حروف کی تمام اقسام یعنی مہموسہ اور مجہورہ۔ شدیدہ اور رخوہ۔ مطبقہ اور منفتحہ وغیرہ وغیرہ میں سے ہر قسم کے نصف نصف حروف لائے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے کشاف اور بیضاوی کی مراجعت فرمائیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حروف مقطعات کی تفسیر میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ اس ناچیز کا گمان یہ ہے کہ یہ تمام اقوال اپنی اپنی جگہ پر سب درست ہیں حروف مقطعات لغت عربیۃ کے اعتبار سے حروف تہجی کے اسماء ہیں۔ جیسا کہ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں اور یہی خلیل بن احمد اور سیبویہ اور دیگر ائمۂ عربیت کا مذہب ہے اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے متشابہات اور خداوند ذوالجلال کے مخفی اسرار ہیں جنکے معانی سے عام طور پر لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی اور نہ ان میں اسکی استعداد ہے اس لیے ان پر ایمان لانا لازم ہوا اور ان کی تحقیق اور تفتیش کرنا ممنوع ہوا اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ جب حروف مقطعات کو سر الٰہی مانا گیا تو قرآن مفہوم المعنی نہ رہے گا تو پھر نزول سے کیا فائدہ ؟ جواب یہ کہ نزولِ قرآن کا فائدہ۔ فہم معانی میں منحصر نہیں۔ بلکہ بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جہاں مکلفین سے فقط ایمان لانا مطلوب ہے اسی طرح حروف مقطعات کے نازل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے من جانب اللہ ہونے کا یقین کریں تاکہ بندوں کا کمال انقیاد ظاہر ہو ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو ؛ نینگیختن علت از کار تو

یہ حضرات مفسرین اور محدِّثین (بکسر الدال) کا مذہب ہے اور حضرات محدَّثین (بفتح الدال یعنی جو حضرات محدَّث من اللہ اور مُلہم من اللہ ہیں ان کا مسلک یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کبھی کبھی اپنے مخصوص بندوں کو حروف مقطعات کے معانی اور اسرار سے بذریعہ الہام کے مطلع فرما دیتے ہیں۔ محدِّثین (بکسر الدال) اور محدَّثین (بفتح الدال) میں حقیقی نزاع نہیں محض لفظی نزاع ہے۔ محدِّثین۔ جو علم اور ادراک کی نفی کرتے ہیں وہ عوام کے اعتبار سے ہے اور اس نفی سے بھی علم یقینی کی نفی مراد ہے علم ظنی اور وجدانی کی نفی مراد نہیں اور محدَّثین (بفتح الدال) جو حروف مقطعات کے معانی کے علم اور ادراک کے قائل ہیں وہ خواص کے لیے قائل ہیں نہ کہ عوام کے لیے اور پھر خواص کو بھی جو علم ہوتا ہے وہ ظنی اور وجدانی ہوتا ہے قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اور عجب نہیں کہ حروف مقطعات عالم غیب میں ذوالوجوہ ہوں کسی پر کوئی معنی اور کسی پر کوئی معنی منکشف ہوں۔ مثلاً کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ حروف مقطعات اسماء الٰہی ہیں اور کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ یہ اسماء سور ہیں جس کسی نے جو کچھ کہا وہ اپنے مکاشفہ اور مشاہدہ کے لحاظ سے کہا اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم کو عربی زبان میں اتارا عربی

زبان کے اعتبار سے حروف مقطعات حروف تہجی کے اسماء ہیں۔ سورتوں کے شروع میں طرح طرح کے لطائف اور معارف اور قسم قسم اعجاز کی رعایت کے ساتھ ان کو لایا گیا ہے لہذا ائمہ عربیت اور علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی کا یہ قول محدثین اور محدّثین کے قول کے ہرگز منافی اور مخالف نہیں علامہ زمخشری اور بیضاوی کا قول لسان عربی مبین کے قواعد پر مبنی ہے اور محدِثین (بکسر الدال) کا قول کہ حروف مقطعات متشابہات سے ہیں ظاہر شریعت پر مبنی ہے اور محدّثین (بفتح الدال) یعنی اولیاء اللہ اور عارفین کا قول باطن شریعت پر مبنی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ظاہر اور ہر باطن کے لیے کچھ وجوہ ہوتے ہیں کوئی عالم کسی وجہ کو اختیار کرتا ہے اور کوئی کسی وجہ کو۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

یہی کتاب حقیقت میں کتاب ہے کہ تمام کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ کے متفرق علوم اور مضامین کی جامع ہے اور اسی وجہ سے اسکا اتباع تمام کتب سماویہ کا اتباع ہے اور اسکا انکار تمام کتب الٰہیہ کا انکار ہے کتاب کا اصل مادہ لغت میں جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے اس لیے اس کے مناسب معنی بیان کیے گئے اور ذٰلِكَ اسم اشارہ اس لیے لایا گیا کہ اس طرف اشارہ ہو جائے کہ اس کتاب کی جامعیت محسوس اور مشاہد ہے۔ ارباب معنی تو علوم اور معارف کی روشنی میں اسکی جامعیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اصحاب لفظ۔ فصاحت اور بلاغت کے آئینہ میں اسکی جامعیت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ می دارد　　برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اور بجائے لفظ هٰذا کے جو اشارہ قریب کے لیے مستعمل ہوتا ہے لفظ ذٰلِكَ کا استعمال فرمایا جو اشارہ بعیدہ کے لیے وضع ہوا ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی بے مثال جامعیت اور عجیب وغریب حقائق و معارف اور اسرار و غوامض اور دقائق اور لطائف پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نظر و فکر کی جولانگاہ سے بہت ہی دور اور بلند اور برتر ہے۔ یعنی قرآن اگرچہ باعتبار صورت کے حاضر و قریب ہے مگر اسرار و حقائق کے اعتبار سے ہمارے فہم و ادراک سے بہت بعید ہے۔ اس لیے بجائے هٰذا کے ذالك اسم اشارہ بعید لایا گیا۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ

اور اس کتاب کے کامل اور بیمثال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے تمام مطالب مدلل اور

مبرہن ہیں اس میں کسی قسم کے شک اور تردد کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ایسی جامع اور مکمل۔ اور واضح اور مدلل کتاب میں بھی اگر کسی کو کوئی شک اور شبہ پیش آئے تو وہ اسکے فہم کا قصور ہے اس کتاب میں تو کوئی شبہ نہیں یہ نافہم اپنی نافہمی سے شبہ میں پڑ گیا ہے۔ قرآن کریم کی کوئی بات بھی عقل سلیم کے خلاف نہیں۔

یہ پہلی سورت ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے نازل ہوئی۔ مگر ایک آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ۔ بالاتفاق حجۃ الوداع میں دسویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ میں اتری۔ تبّعؑ کے زمانہ سے یہود نبی آخرالزمان کے انتظار میں مدینہ منورہ آکر آباد ہوئے تھے ان آیات میں انہیں کو خطاب ہے کہ یہ وہی کتاب ہے، جس کی خبر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام دیتے چلے آئے ہیں۔ مالک بن صیف یہودی مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالتا تھا کہ یہ وہ کتاب نہیں کہ جس کی خبر اگلی کتابوں میں دی گئی ہے اور اس میں کوئی شک اور شبہ نہیں۔ علماء بنی اسرائیل میں سے جو حقیقت میں علماء تھے۔ وہ قرآن کو سنتے ہی ایمان لے آئے اور جن کے دل ثمن قلیل اور دراہم معدودہ کی محبت میں گرفتار تھے وہ اس سعادت سے محروم رہے کما قال تعالےٰ۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْلَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا۔

قرآن کو ہم نے بتفریق نازل کیا تاکہ آپ اسکو لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ پڑھیں اور بتدریج ہم نے اس کو نازل کیا آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ مگر وہ لوگ جنکو اس کے نازل ہونے سے پہلے اس کا علم دیا گیا ان کی حالت تو یہ ہے کہ جب ان پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو ٹھوڑیوں پر سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ بیشک خدا کا وعدہ (جو اس کتاب کے نازل کرنے کے متعلق تھا) وہ پورا ہو کر رہا اور گریہ و زاری کرتے ہوئے ٹھوڑیوں پر گرتے ہیں اور انکے خشوع میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

(ف ۱) اس روایت سے ذٰلک اسم اشارہ بعید لانے کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ ذٰلک کا اشارہ اس کتاب کی طرف ہے کہ جس کی انبیاء سابقین خبر دیتے چلے آئے تھے۔ یعنی یہ وہی کتاب ہے جس کی خبر کتب سابقہ میں دی گئی ہے۔

(ف ۲) یہ خصوصیت قرآن کریم ہی کی ہے کہ اسکے تمام مضامین عقل سلیم کے مطابق اور سب کے سب یقینی ہیں۔ تقلیدی اور ظنی نہیں کہیں ریب اور تردد کی گنجائش نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کتاب کے مضامین اور مطالب اس درجہ قطعی اور یقینی ہوں کہ اس میں کہیں شک اور شبہ کی گنجائش نہ ہو تو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں کیا شک اور شبہ ہو سکتا ہے توریت اور انجیل کو دیکھیئے کہ اصل ہی سے مشکوک ہے تثلیث اور الوہیت مسیح اور کفارہ کے مضامین فقط اس درجہ ہی میں نہیں کہ عقل کو ان میں کوئی شک اور تردد ہو بلکہ عقل قطعاً اُنکو لغو اور باطل سمجھتی ہے توریت میں العیاذ باللہ حضرات انبیاء کا بُت پرستی کرنا اور جھوٹ بولنا اور العیاذ باللہ حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا مذکور ہے اسکو کون عقل باور کر سکتی ہے۔ ویدا ور دساتیر میں جا بجا عناصر اور کواکب پرستی کے مضامین مذکور ہیں جن سے عقل نفرت کرتی ہے لنگ اور بھگ (فرج) کی پوجا کا ذکر ہی عقل کے لیے باعث صد عار و ننگ ہے۔ شرک اور بے شرمی کی بھی حد ہو گئی کہ شرمگاہ کو بھی پرستش سے نہ چھوڑا۔

مولانا عبدالحق صاحب حقانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ص ۶۱ ج ۲ گبن جو کہ انگلستان کا بڑا مشہور مورخ اور مقنن ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

محمد کا مذہب شکوک و شبہات سے پاک ہے مکہ کے پیغمبر نے بتوں اور انسانوں اور ستاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا ہے کہ جو شئی طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے الخ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا الخ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر یقین رکھتا ہو وہ مسلمانوں کے عقائد مذکورہ بالا کو کہہ سکتا ہے کہ وہ عقائد ہمارے ادراک اور قوائے عقلی سے بڑھ کر ہیں وہ اصل کہ جس کی بناء عقل اور وحی پر ہے محمد کی شہادت سے استحکام کو پہنچی انتہیٰ ملخصاً۔ اور سیل باوجود سخت تعصب کے اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں اقرار کرتا ہے۔ کہ تھوڑے سے دنوں میں جو محمد کا دین شرقاً غرباً روئے زمین پر پھیل گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مذہب کے جملہ امور وہ امور ہیں کہ جن کو عقل بہت جلد تسلیم کرتی ہے جو لوگ تلوار کے زور سے اس دین کا پھیلنا خیال کرتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں۔ انتہیٰ ملخصاً۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ

راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے اور درست

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝٣

کرتے ہیں نماز کو اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔

صِفاتِ مؤمنینِ مُخلِصین

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یہ کتاب ہدایت ہے متقیوں کے لیے جس درجہ کا تقویٰ ہے اس درجہ کی ہدایت ہے یہ جملہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کی دوسری دلیل ہے یعنی کتاب حقیقت میں یہی ہے اس لیے کہ اول تو اس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں دوم یہ کہ یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک نور مبین اور مشعل ہدایت ہے۔ جب تک دل میں خدا کا خوف نہ ہو اس وقت تک راہِ ہدایت نظر نہیں آتی یا یہ کہو کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ کی دلیل ہے یعنی اس جامع کتاب میں اس لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ کتاب تو مشعل ہدایت ہے لوگوں کے شبہات اور توہمات کی ظلمتوں اور تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے اتاری گئی ہے ہر بات اسکی میزان عقل میں تلی ہوئی ہے ہر بیان اسکا شافی اور کافی مدلل اور مبرہن ہے۔ اوہام پرستوں کے لیے سیف قاطع ہے۔ بھلا ایسی کتاب میں کہاں شک اور شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے چند سال میں جو لوگوں کو ہدایت کی طرف کھینچا توریت انجیل اس کی نظیر تو کیا عشر عشیر بھی نہیں پیش کر سکتی۔ چند ہی روز میں عرب جیسے وحشی ملک کو خدا پرستی کا گہوارہ بنا دیا۔ عرب کے درندے یکلخت شمع نبوت کا پروانہ بن گئے حواریین کی بے وفائی کے خود نصاریٰ معترف ہیں کہ حضرت مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہود نے تیس درہم رشوت لیکر حضرت مسیح کو گرفتار کرا دیا۔ سورۂ فاتحہ میں بندوں کی جانب سے خدا کی حمد و ثنا کا ذکر تھا۔ سورۂ بقرہ میں اسکے برعکس خدائے عزوجل کی جانب سے عباد متقین کی مدح و ثناء کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ۔ خود اپنی رحمت اور فضل سے ایمان اور تقویٰ کی صفت عطا فرمائیں اور پھر خود ہی اسکی توصیف فرماتے ہیں۔ اللھم لا نحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

لغت میں تقویٰ کے معنی صیانت اور حفاظت کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں ان چیزوں

سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے ضرررساں ہوں۔خواہ از قبیل عقائد و اخلاق ہوں یا از قبیل اقوال وافعال واحوال ہوں۔اور چونکہ ضرر کے درجات مختلف ہیں اسی اعتبار سے تقویٰ کے درجات بھی مختلف ہیں ۔

پہلا مرتبہ

یہ ہے کہ کفر سے تائب ہو کر اسلام میں داخل ہو اور اپنے کو عذاب دائمی کی مضرت سے بچالے ۔ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى میں تقویٰ سے یہی معنی مراد ہیں ۔

دوسرا مرتبہ

یہ ہے کہ اپنے نفس کو ارتکاب کبائر اور اصرار علی الصغائر کی مضرت سے محفوظ رکھے کما قال تعالٰی وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا۔ اہل شریعت کی اصطلاح میں جب تقویٰ کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا ۔۔۔ وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى

چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دے ۔ یہی تقویٰ ہے ۔

وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ۔۔۔ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى

خدا کی راہ میں اسطرح چل جسطرح کہ خاردار جنگل میں ڈر ڈر کر اور سنبھل سنبھل کر کوئی چلتا ہے

لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً ۔۔۔ اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے پہاڑ بنتے ہیں ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب سے تقویٰ کی حقیقت دریافت کی تو یہ جواب دیا کہ اے امیر المومنین کیا آپ کبھی کسی پرُ خار راستہ سے بھی گزرے ہیں فرمایا کیوں نہیں ۔ ابی بن کعبؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین پھر آپ نے اس وقت کیا کیا ۔ فرمایا کہ میں نے دامن چڑھائے بچا بچا کر قدم رکھے کانٹوں سے بچنے کے لیے اپنی تمام جدوجہد کو خرچ کر ڈالا ۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین یہی تقوی ہے یعنی حق جل[1] و علا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنی پوری

[1] یہ قید اس لیے لگائی کہ اگر دنیاوی ذلت وندامت سے ڈر کر معصیت کو چھوڑا تو وہ تقوی نہیں خدا کے ڈر سے گناہ کو چھوڑنے کا نام تقوی ہے ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ

ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینے کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ — یقیناً خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہے۔

تیسرا مرتبہ

یہ ہے کہ قلب کو ہر اس چیز سے محفوظ کر لیا جائے جو خدا تعالیٰ سے غافل کرتی ہو اور یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ۔ (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) اس آیت میں تقویٰ کا یہی مرتبہ مراد ہے۔ خدا کا خوف ہی ہدایت کا مبدا اور ہر قسم کے فوز و فلاح کا سرچشمہ ہے اسی لیے حضرت نوح اور حضرت ہود اور حضرت صالح اور حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی نصیحت فرمائی۔ اَلَا تَتَّقُوْنَ۔ کیا تم کو خدا کا خوف نہیں۔ اور فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اس لیے کہ بغیر خدا کے خوف کے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی کما قال تعالیٰ سَیَذَّكَّرُ مَنْ یَّخْشٰى۔ یعنی نصیحت وہی قبول کرے گا جو خدا سے ڈرتا ہو گا۔

حق جل و علا نے دوسرے موقعہ پر بجائے هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ، هُدًى لِّلنَّاسِ (یعنی ہدایت ہے انسانوں کے لیے) ارشاد فرمایا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں وہ درحقیقت انسان نہیں انسانیت اور آدمیت کا اقتضاء یہ ہے کہ اپنے خالق اور مالک سے ڈرے اور جو اس احکم الحاکمین سے نہیں ڈرتا وہ انسان نہیں بہائم کے مثل ہے بلکہ بہائم سے بدتر قال تعالیٰ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔

سفر آخرت کے لیے تقویٰ ہی کا توشہ اور تقوے ہی کا لباس کارآمد ہو سکتا ہے کما قال تعالیٰ

وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ — سفر کے لیے توشہ لے لو پس تحقیق سب سے بہتر توشہ تقویٰ ہے۔

جس طرح بغیر زاد راہ کے مسافر کا دنیاوی سفر ناممکن ہے۔ اسی طرح بغیر تقویٰ کے توشہ کے آخرت کا سفر ناممکن ہے اور جس طرح ایک معمولی راستہ سے برہنہ اور عریاں گزرنا خلاف حیا اور خلاف شرم ہے اسی طرح اس عظیم الشان شاہراہ سے جو ایک لمحہ کے لیے بھی بے شمار ملائکۃ اللہ سے خالی نہیں رہتی لباس تقویٰ سے برہنہ اور عریاں گزرنا کس طرح بے حیائی اور بے شرمی نہ ہو گا۔ اعاذنا اللہ من

ذلک امین

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں ایمان بالغیب متقیوں کا خاص شعار ہے یہ کلمہ المتقین کی صفت ہے یا یوں کہو کہ پرہیز گاروں کی تعریف بیان فرماتے ہیں کہ پرہیز گار وہ ہیں جو خدا پر اور خدا کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور عبادت گزار ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں المتقین میں تمام بُری باتوں کے ترک کی طرف اشارہ تھا۔ اب امور خیر کا ذکر فرماتے ہیں چونکہ اجزاء انسانی میں سب سے اعظم اور اشرف جزء قلب ہے۔ اس لیے سب سے پہلے فعل قلب یعنی ایمان کا ذکر فرمایا جو درستی اعتقاد کا نشان ہے اور آئندہ آیت وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ الخ میں اعمال بدنیہ کا ذکر فرمایا جو درستی اعمال کی نشانی ہیں۔

ایمان اور کُفر کی تعریف

لغت میں ایمان کے معنی تصدیق اور تسلیم کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں۔ ایمان اسکو کہتے ہیں کہ جو چیز۔ اللہ کا نبی۔ اللہ کی طرف سے لیکر آئے نبی کے اعتماد اور بھروسہ پر دل سے اسکی تصدیق کرنا یعنی دل سے اسکو سچا جاننا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا یہ تو ایمان ہے اور دین کی کسی ایک چیز کا نہ ماننا اور انکار کرنا کفر ہے۔

تشریحات

۱۔ تصدیق قلبی سے محض علم اور معرفت مراد نہیں۔ تصدیق اور چیز ہے اور علم اور معرفت اور چیز ہے اور علم کے معنی جاننے کے ہیں۔ اور معرفت کے معنی پہچاننے کے ہیں اور تصدیق کے معنی ماننے کے ہیں اور ایمان نام ماننے کا ہے۔ جاننے کا نام ایمان نہیں۔ کفار مکہ دلائل نبوت کو دیکھ کر جانتے تھے کہ آپ نبی ہیں اور علماء یہود آپکو خوب پہچانتے تھے کہ یہ وہی نبی آخرالزمان ہیں جن کی انبیاء کرامؑ بشارت دیتے چلے آئے آپکی جو علامتیں توریت اور انجیل میں تھیں وہ تمام علامتیں اپنی آنکھوں سے آپ میں دیکھتے تھے۔

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ — یہود اپنے بیٹوں کی طرح حضور کو پہچانتے تھے۔

مگر مانتے نہ تھے اس لیے ایمان سے بے بہرہ تھے۔ ایمان محض جاننے اور پہچاننے کا نام نہیں بلکہ اپنے اختیار اور ارادہ اور رضا و رغبت سے ماننے کا نام ایمان ہے و قال تعالٰے۔

وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا۔ آپ کی نبوت کا محض تکبر کی وجہ سے انکار کرتے ہیں مگر دل ان کے یقین کیے ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

خلاصۂ کلام یہ کہ محض علم اور ایقان۔ ایمان کی حقیقت نہیں بلکہ ایمان کی حقیقت تسلیم اور اذعان ہے یا بالفاظ دیگر۔ ایمان جاننے اور پہچاننے اور یقین کرنے کا نام نہیں بلکہ ماننے کا نام ایمان ہے

۲۔ ایمان کی تعریف میں نبیؑ کے بھروسہ اور اعتماد کی قید اس لیے لگائی گئی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ کی باتیں محض نبی کے کہنے سے اور محض نبیؑ کے اعتماد اور بھروسہ پر ماننے مثلاً کوئی شخص توحید اور رسالت دونوں کا اقرار کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ میں توحید خداوندی کا فلاسفہ کی طرح محض دلائل عقلیہ کے بناء پر قائل ہوں۔ رسول اللہؐ کے کہنے سے توحید کا قائل نہیں تو ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں اسکی توحید فلاسفۂ یونان کی توحید ہے اہل ایمان کی توحید نہیں جیسا کہ عارف جامی شواہد النبوت کے پہلے ہی صفحہ میں حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"نخستین رکن از ارکان اسلام اقرار بکلمۂ شہادت است و حقیقت ایمان تصدیق بمضمون آں و آں مشتمل بر دو امر است یکے اقرار بوحدانیت حق سبحانہ تعالٰے و گرویدن بآں و دوم اقرار نبوت و رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و گرویدن بآں۔ و امر اول وقتے معتبر است کہ مقتبس از مشکوٰۃ نبوت باشد اگر بمجرد دلائل عقلی اکتفا کنند چوں فلاسفہ و از مشکوٰۃ نبوت نگیرد مفید نجات نیست" انتہٰی کلامہ۔

۳۔ دین کی باتوں کا ماننا وہی معتبر ہے کہ جب ان کو اسی طرح مانا جائے کہ جس طرح اور جس ہیئت سے انکا دین ہونا ثابت ہوا ہے۔ مثلاً کوئی شخص نماز کا شعار اسلام اور فریضۂ دین ہونا تو تسلیم کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ سے مطلق دعا اور خشوع و خضوع مراد ہے اور نماز کی فرضیت بہ ہیئت مخصوصہ یعنی بطریق قیام و قعود اور رکوع و سجود۔ تسلیم نہیں کرتا تو ایسا شخص قطعاً دائرۂ ایمان سے خارج ہے یا مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت کو تسلیم کرے مگر یہ کہے کہ زکوٰۃ سے محض تزکیہ اور تطہیر مراد ہے بہ خاص نصاب اور مال کی خاص مقدار ضروری نہیں تو ایسا شخص مؤمن نہیں۔ ملحد اور زندیق ہے۔ اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو شریعت کے الفاظ کو بحال اور برقرار رکھے اور اس کی حقیقت کو بدل دے یہ ایمان نہیں بلکہ دین کا تمسخر اور مذاق ہے اور حق جل شانہٗ کا یہ ارشاد۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ۔ اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ یہ لوگ یعنی صحابہ ایمان لائے۔

اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان میں وہی تصدیق اور اذعان معتبر ہے جو صحابۂ کرام کے قبول اور تسلیم اور اُن کے تصدیق اور اذعان کے ہمرنگ ہو۔ یہ نہیں کہ نام تو وہی ہو اور حقیقت کچھ اور ہو۔

۴۔ اصل ایمان تو تصدیق قلبی ہے اور زبانی اقرار حقیقتِ ایمان کی حکایت ہے اگر حکایت محکی عنہ

کے مطابق ہے تو فبہا۔ ورنہ سوائے مکر و فریب کے کوئی شئے نہیں۔ محض ایک جھوٹ ہے جو صدق اور راستی کے لباس میں نمودار ہے۔

۵۔ حضرات متکلمین فرماتے ہیں کہ ایمان کی اصل حقیقت تو تصدیق قلبی ہے اور اقرار لسانی۔ دنیوی احکام کے جاری کرنے کے لیے شرط ہے کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے بغیر زبان کے دل کا حال کیسے معلوم ہو تصدیق قلبی چونکہ ایک پوشیدہ چیز ہے ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا اس لیے بطور علامت اقرار لسانی اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ ظاہری احکام جاری ہوسکیں ورنہ اگر کوئی شخص گونگا ہو یا کسی کے اکراہ اور زبردستی سے محض زبان سے کلمۂ کفر کہے اور دل میں تصدیق موجود ہو تو کافر نہیں یا تصدیق قلبی کے بعد مر جائے اور زبانی اقرار کی نوبت نہ آئے تو اس کے ایمان میں کوئی خلل نہیں۔

حضرات محدثین اگرچہ اقرار باللسان اور عمل بالارکان کو جزء ایمان قرار دیتے ہیں لیکن ایمان کی اصل اور جڑ تصدیق قلبی ہی کو بتاتے ہیں اور یہ تصریح فرماتے ہیں کہ ایمان بغیر عمل صالح کے ناقص ہے کفر نہیں یہ حضرات متکلمین اور حضرات محدثین میں محض صوری نزاع ہے حقیقی اور معنوی نزاع نہیں۔

امام غزالی قدس اللہ سرہٗ فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں ایمان اور کفر کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں

اَلْكُفْرُ هُوَ تَكْذِيْبُ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ شَيْءٍ مِّمَّا جَآءَ بِهٖ وَالْاِيْمَانُ تَصْدِيْقُهٗ فِيْ جَمِيْعِ مَا جَآءَ بِهٖ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی بھی تکذیب کر دینے کا نام کفر ہے اور تمام امور میں آپکی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔

امام غزالی قدس سرہٗ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے لیے فقط ایک دو امر کی تصدیق کافی نہیں۔ تمام امور میں رسول اللہؐ کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ ہاں کفر میں تمام امور کی تکذیب ضروری نہیں۔ ایک شئ میں بھی رسول کی تکذیب کفر ہے۔

مسئلہ تکفیر اہل قبلہ

یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں اہل ایمان اور اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام متواترات اور ضروریات دین پر ایمان رکھتے ہوں گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انکی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ فقط قبلہ کی طرف نماز پڑھنے سے اہل ایمان اور اہل قبلہ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک رسول کی تمام باتوں کی تصدیق نہ کرے

کما قال اللہ تعالےٰ۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔

نیکی اور بھلائی اس میں منحصر نہیں کہ فقط تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی جانب پھیر لو لیکن نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر اور تمام فرشتوں پر اور اللہ کی ہر کتاب پر اور تمام پیغمبروں پر

الحاصل اصطلاح شریعت میں اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام ضروریات دین کی تصدیق کرتے ہوں اور کسی امر دینی کے مُکذِّب اور منکر نہ ہوں اور ضروریات دین سے وہ امور مراد ہیں کہ جو شریعت میں ایسے معلوم اور مشہور ہوں کہ خواص و عوام سب انکو جانتے اور پہچانتے ہوں. جیسے توحید اور رسالت اور جو شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک امر کا بھی انکار کر دے کہ جسکا دین سے ہونا قطعیؔ اور بدیہی طور سے ثابت ہے تو وہ شخص قطعًا دائرۂ ایمان اور زمرۂ اہل قبلہ سے خارج ہے اگرچہ وہ شخص قبلہ رو ہو کر دن میں پچاس نمازیں ادا کرتا ہو۔ قال تعالےٰ۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ط.

کیا تم لوگ کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ ایسے شخص کی جزا سوائے اسکے کچھ نہیں کہ دنیا میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ محض بعض احکام کو مان لینا کافی نہیں جب تک تمام احکام کی تصدیق نہ کرے۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ٥ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ

ایسے ہی لوگوں نے حیات دنیاویہ کو اخروی حیات کے بدلہ میں خرید لیا ہے۔ پس ان پر سے نہ عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ انکی کوئی مدد کی جائے گی اور البتہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اسکے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریمؑ کو کھلے ہوتے نشانات دیئے اور روح القدس سے ان کی تائید کی تو پھر کیا تم ایسے ہو گئے کہ جب

ع یہ قید اس لیے لگائی کہ جن امور کا ثبوت ظنی ہے انکے انکار سے کافر نہیں ہوتا۔

اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ فَفَرِيۡقًا كَذَّبۡتُمۡ وَ فَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ○ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ط ○

کبھی کوئی رسول تمہارے پاس تمہاری خواہشات کے خلاف کچھ لیکر آیا تو تم نے سرکشی کی۔ پھر کسی کو جھٹلا یا اور کسی کو قتل کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ نہیں بلکہ اللہ نے انکے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں جس خاص کفر پر لعنت فرمائی ہے وہ یہی کفر ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام من جانب اللہ ایسی چیز لیکر آئے جو نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو یہود بے بہبود نے اس کے ماننے سے سرکشی کی اور حضرات انبیاء کی تکذیب کی۔

"امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ فلاسفہ یونان جو سمٰوات و کواکب کے فنا و فساد کے قائل نہیں وہ قطعًا کافر ہیں۔ جیساکہ امام غزالی نے اپنے رسائل میں اس کی تصریح کی ہے اس لیے کہ یہ لوگ نصوص قطعیہ اور اجماع انبیاء کرام کے منکر ہیں کما قال تعالیٰ۔ اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ[۱] وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ وَ قَالَ تعالٰی اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ[۲]۔ وَقَالَ تعالٰی وَ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ اَبۡوَابًا[۳]۔ مجدد صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

نمیدانند کہ مجرد تفوہ بکلمۂ شہادت در اسلام کافی نیست تصدیق جمیع ما علم مجیئہ من الدین بالضرورۃ باید "مکتوبات ص ۳۲۳ ج ۱"

نہیں جانتے کہ محض کلمہ شہادت پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ان تمام امور کی تصدیق ضروری اور لازمی ہے کہ جن کا دین سے ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو گیا ہو۔

البتہ جو امور ظنی طور پر ثابت ہوئے ہوں ان کی تصدیق جزء ایمان نہیں اور نہ انکار کفر کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔ ہاں جو امور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں اور تواتر کے درجہ کو نہ پہنچے ہوں ان کے انکار سے اگرچہ کفر لازم نہیں لیکن گمراہی یقینًا ہے اور کفر کا اندیشہ ہے اور یہ گمراہی کا حکم بھی اس شخص کے لیے ہے جو کسی ایسے خاص امر کا انکار کردے جو خبر واحد سے ثابت ہوا ہو اور جو شخص سرے ہی سے حدیث کا منکر ہو اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال و افعال کو حجت نہ سمجھتا ہو وہ بلا شبہ

---

[۱] یعنی جب سورج بے نور ہو جائیگا اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔ [۲] جب آسمان پھٹ جائے گا۔
[۳] اور آسمان کھل جائیگا تو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔

کافر ہے اور جو اس کے کفر میں شبہ کرے وہ بھی کافر ہے کما قال تعالیٰ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ؁

تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعضوں کو مانتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ نکالیں۔ ایسے لوگ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ اللہ پر اور اسکے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور کسی میں فرق نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالےٰ ضرور انکا ثواب عطا کریں گے اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول کے درمیان تفریق کرنا اللہ کے کلام کو حجت سمجھنا اور پیغمبر کی حدیث کو حجت نہ سمجھنا قطعاً کفر ہے اور جو شخص ایسا عقیدہ رکھے وہ پکا کافر ہے۔ وَقَالَ تعالیٰ۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ؁

قسم ہے تیرے پروردگار کی لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک کہ آپکو آپس کے جھگڑوں میں حکم اور منصف نہ بنائیں۔ اور پھر آپکے فیصلہ کے بعد ذرہ برابر قلب میں کوئی انقباض نہ پائیں اور برضا و رغبت آپکے فیصلہ کو اچھی طرح تسلیم کرلیں۔

٭ ٭ ٭

معلوم ہوا کہ ایمان محض اقرار کرنے کا نام نہیں بلکہ شرط یہ ہے کہ پیغمبر کے حکم اور فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہو اور بھر ار رضا و رغبت اسکو تسلیم کرے۔ اور اگر کسی ایک بات کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کردے تو قطعاً کافر ہے۔ کفر کے لیے یہی ضروری نہیں کہ توحید و رسالت ہی کا انکار کرے جب ہی کافر ہو۔ جو حکم بھی دین کا نبیؐ سے قطعی طور سے ثابت ہوا ہو اس کا انکار کفر ہے۔ مثلاً جس شئی کی حلت یا حرمت نص قرآنی یا حدیث متواتر سے ثابت ہو۔ جیسے زنا اور لواطت اس کا انکار بھی

کما قال تعالیٰ۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔

ان لوگوں سے ضرور جہاد و قتال کرو جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور نہ حرام سمجھتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ اور اسکے رسول نے حرام کیا ہے۔

ایمان کیلئے کفر سے براءت اور بیزاری شرط ہے

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ ونفعنا بعلومہٖ وبرکاتہ۔ آمین اپنے ایک طویل مکتوب میں جو عقائد اسلامیہ کی تحقیق میں قلم مبارک سے نکلا ہے فرماتے ہیں۔

ایمان عبارت از تصدیق قلبی است آنچہ از دین بطریق ضرورت و تواتر بمارسیدہ است و اقرار لسانی نیز رکن ایمان گفتہ اند کہ احتمال سقوط دارد و علامت ایں تصدیق تبرّی است از کفر و بیزاری از کافری و آنچہ در کافر لیست از خصائص ولوازم آں ہمچناں بستن زنار و مثل آں و اگر عیاذاً باللہ سبحانہٗ باد عوائے ایں تصدیق تبرا از کفر ننماید مصدق دینین است کہ بداغ ارتداد متسم است و فی الحقیقت حکم منافق است لا الیٰ ہٰؤلاءِ ولا الیٰ ہٰؤلاءِ پس در تحقیق ایمان از تبرّی کفر چارہ نبود و ادنائے آں۔ تبرّی قلبی است و اعلائے آں تبری قلبی و قالبی۔ و تبرّی عبارت از دشمنی است با دشمنانِ حق جل و علا، آں دشمنی خواہ بقلب

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل سے ان چیزوں کی تصدیق کی جائے جو دین سے بطرق بداہت اور تواتر ہم تک پہنچی ہیں۔ علماء نے اقرار لسانی کو بھی ایمان کا جزء اور رکن کہا ہے مگر یہ ایسا رکن ہے کہ بعض حالات میں مثلاً اجبار اور اکراہ کی حالت میں ساقط ہو جاتا ہے اور اس تصدیق کی علامت یہ ہے کہ کفر اور کافری اور کفر کے تمام خصائص ولوازم جیسے زنار باندھنا ان سب سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرے اور اگر کوئی شخص باوجود دعویٰ ایمان کے معاذاللہ کفر سے تبری اور بیزاری نہ ظاہر کرے تو وہ دو متضاد دینوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو داغ ارتداد سے داغی ہے اور درحقیقت ایسا شخص منافق کے حکم میں ہے نہ اِدھر نہ اُدھر۔ پس ایمان کے ثابت کرنے کے لیے کفر سے تبری اور

بود اگر خوفِ ضررِ ایشاں داشتہ باشد
وخواہ بقلب وقالب ہر دو در وقت عدمِ
آں خوف وآیتِ کریمہ ۔
یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ[1] جَاهِدِ
الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ
عَلَیْهِمْ ۔ مؤید ایں معنیٰ است
چہ محبت خدائے عز وجل ومحبت
رسول او علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰت
والتسلیمات ۔ بے دشمنی دشمناں
صورت نہ بندد

ع

تولّے بے تبرا نیست ممکن

ایں جا صادق است حضرت ابراہیم
خلیل الرحمٰن علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ
والسلام ایں ہمہ بزرگی کہ یافت وشجرۂ
انبیاء گشت بواسطہ
تبری از دشمنان او
تعالےٰ بودہ ۔
قال اللہ تعالےٰ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ
وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ
اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ
بَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ ۔ مکتوبات ص۳۲۵ دفتر اول مکتوب ۲۶۶

بیزاری ضروری اور لابدی ہے جسکا ادنیٰ
مرتبہ یہ ہے کہ کم از کم دل سے بیزار ہو
اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ قلب اور قالب
یعنی زبان اور قلب اور ظاہر اور باطن
دونوں سے کفر سے تبری اور بیزاری ظاہر
کرے اور تبری کے معنے یہ ہیں کہ خدا
کے دشمنوں سے دشمنی رکھے خواہ فقط
دل سے ہو اگر اظہار میں ضرر کا اندیشہ ہو
اور خواہ زبان اور دل دونوں سے اس
دشمنی کا اظہار ہو اگر کسی ضرر کا اندیشہ نہ
ہو اور یہ آیت یا ایہا النبی[1] جاھد
الکفار اسی معنی کی مؤید ہے اسلئے کہ
خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اس
وقت تک ممکن نہیں جب تک اس
کے دشمنوں سے دشمنی اور عداوت نہ
ہو (تولاّ بے تبرا نیست ممکن) دوستی
اور محبت بغیر دشمنوں سے بیزاری کے
ممکن نہیں۔ یہ مقولہ ایسے ہی موقعہ پر صادق
آتا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا
وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ جو کچھ بزرگی
پائی اور شجرۂ انبیاء ہوتے یہ سب حق
تعالےٰ کے دشمنوں سے تبری اور بیزاری
ہی کی وجہ سے انکو حاصل ہوئی۔ چنانچہ
حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں۔ اے ایمان والو
تحقیق تمہارے لیے ابراہیم اور اسکے ساتھ
ایمان لانے والوں میں اسوۂ حسنہ ہے جبکہ

[1] یعنی اے نبی کفار و منافقین سے جہاد کیجیئے اور ان پر سختی کیجیے ۔

انہوں نے اپنی قوم سے یہ کہہ دیا کہ ہم بالکل بری اور بیزار ہیں تم سے اور ان تمام چیزوں سے جن کی تم سوائے خدا کے پرستش کرتے ہو ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی ہم اللہ کے مؤمن اور تمہارے کافر ہیں اور ظاہر ہوئی ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لیے یہاں تک کہ ایمان لاؤ تم اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ پر۔"

یہ آیتیں سورۂ ممتحنہ کی ہیں۔ بظاہر یہ سورت اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے نازل ہوئی جیسا کہ اس کے شان نزول سے ظاہر ہے۔ تفصیل کے لیے اس سورۃ کی تفسیر مطالعہ کریں۔ وقال تعالیٰ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ

کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو زبان سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئی مگر باوجود اس دعوے کے حالت یہ ہے کہ اپنا مقدمہ شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انکو اللہ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ شیطان کو ہرگز نہ مانیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور اسکے رسول کی تصدیق کے بعد طاغوت کیساتھ کفر اور اس کی تکذیب بھی ضروری اور لازم ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سوتے ہوئے بیدار ہو جائے اگر وہ دس بار بسم اللہ اور دس بار سبحان اللہ اور دس بار اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَكَفَرْتُ بِالطَّاغُوْتِ۔ (تصدیق کی میں نے اللہ کی اور تکذیب کی میں نے طاغوت یعنی شیطان کی) پڑھے تو وہ ہر خوفناک چیز سے محفوظ رہے گا۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرؓ (حصن حصین ص ۶۷)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منشاء نبوی یہ ہے کہ خدائے عز وجل کی تصدیق اور اس کے دشمنوں کی دشمنی اور برارت اور بیزاری قلب میں اس درجہ راسخ ہو جائے کہ غفلت کے وقت میں بھی اس سے ذہول اور غفلت نہ ہو۔ وقال تعالیٰ۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔

پس جب ہمارے قہر کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے خدا وحدہٗ لا شریک لہٗ پر اور اس چیز کے منکر ہوئے جس کو خدا کے ساتھ شریک گردانتے تھے۔ پس یہ ایمان ان کو نفع بخش نہ ہوا کہ ہمارے قہر کو دیکھ کر ایمان لائے

معلوم ہوا کہ اگر مشاہدۂ عذاب سے پہلے شرک اور مشرکین سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرتے تو مفید اور نافع ہوتا۔ ناظرین غور کریں کہ کافروں نے مشاہدۂ عذاب کے وقت فقط ایمان پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ ایمان کے ساتھ خدا کے دشمنوں کی تکذیب اور ان سے تبری اور بیزاری کو بھی ظاہر کیا معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ کفر اور کافری سے تبری اور بیزاری بھی ضروری ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں جا بجا مہاجرین کی جو مدح اور ثناء فرمائی ہے وہ بھی اسی تبری اور کفر سے بیزاری کی بدولت ہے کہ اللہ اور اسکے رسول کی محبت میں کفر سے اس قدر بیزار ہوئے کہ اپنے وطن مالوف اور آباؤ و ابناء، بیوی اور بچے، خویش اور اقارب، دوست احباب سب ہی کو چھوڑ دیا۔ اور علیٰ ہٰذا اصحاب کہف کا سوائے ہجرت اور اعتزال عن الکفار کے کوئی اور عمل ایسا نمایاں نہیں کہ اس کی جانب اس منقبت کبریٰ کو منسوب کیا جا سکے۔ اصحاب کہف کو یہ تمام درجات و فضائل صرف دشمنان حق سے ہجرت کی بدولت حاصل ہوئے۔

غلبۂ اعداء اور ہجوم دشمن کے وقت سپاہیوں کی معمولی نقل و حرکت بھی بہت وقعت رکھتی ہے بخلاف زمانۂ امن و سکون کے کہ اس وقت کی غیر معمولی نقل و حرکت بھی کسی شمار میں نہیں۔ زمانۂ جنگ میں معمولی وفاداری کا اظہار بھی حکومت کی نظر میں غیر معمولی شمار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عنفوان شباب کی عبادت زمانۂ پیری کی عبادت سے ہزار درجہ افضل اور بہتر ہے اس لیے کہ زمانۂ شباب میں اعداء دین یعنی نفس امارہ اور شیطان لعین کا غلبہ اور ہجوم ہوتا ہے۔ شیاطین اور شہوات کا لشکر ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ دشمنان دین کے مقابلہ ہی کی وجہ سے زمانۂ شباب کی عبادت پر قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ دینے کا وعدہ آیا ہے۔

ایمان کی صورت اور اس کی حقیقت

حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ایمان کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان کی صورت ہے اور اطمینان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا یہ ایمان کی حقیقت ہے۔ اطمینان نفس سے مراد یہ ہے کہ مقتضائے شریعت، مقتضائے طبیعت بن جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ	تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی طبعی خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔

اس حدیث میں ایمان سے یہی اطمینان نفس مراد ہے یعنی نفس اس درجہ مطمئن ہو جاتے کہ اللہ اور اس کے

رسول کا ہر حکم اس کو لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت اور نافرمانی کا ادنیٰ سا خیال اور معمولی سا وسوسہ بھی آگ میں جلنے سے بدرجہا زائد اس پر شاق و گراں ہو۔ ایمان کی اس کیفیت اور حالت کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ذاک صریح الایمان (یہی کھلا ہوا ایمان ہے) فرمایا ہے ۔

حاشا و کلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ معصیت کا وسوسہ صریح ایمان ہے ورنہ ہم نالائقوں کے ایمان کا صحابہ کے ایمان سے زیادہ صریح اور جلی ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ ہمارے نفوس تو ہر وقت وساوس کی جولان گاہ بنے رہتے ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب قلب میں کفر اور فسوق اور عصیان کی کراہت اور ناگواری اس درجہ راسخ ہو جائے کہ معصیت کا وسوسہ اور خیال بھی اس قدر شاق اور گراں ہو کہ آگ میں جلنا اس سے آسان معلوم ہوتا ہو تو اس کیفیت اور حالت کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے صریح ایمان فرمایا۔

اور علیٰ ہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک " اذا زنی العبد خرج منه الایمان " (بندہ جب زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے۔ اس حدیث میں ایمان سے اسی یقین اور اطمینان کا زائل ہونا مراد ہے اور حق تعالے شانہٗ کے اس ارشاد میں ۔ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا" (اے ایمان والو ایمان لاؤ) ایمان اوّل سے تصدیق قلبی مراد ہے اور دوسرے ایمان سے ایمان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا مراد ہے ۔ کما قال اللہ تعالیٰ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۔

حق سبحانہٗ و تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایمان بمعنی اطمینان نفس کو مدار نجات نہیں قرار دیا بلکہ اپنی بے پایاں رحمت سے ایمان کی صورت یعنی تصدیق اور اقرار لسانی ہی کو قبول فرما کر عذاب جہنم سے نجات اور دخول بہشت کا وعدہ فرمایا۔ ہاں تقرب اور وصول الی اللہ کا مرتبہ بغیر اطمینان نفس اور یقین کامل کے حاصل نہیں ہو سکتا ۔

ایمان صوری اور ظاہری اگرچہ ایمان حقیقی کے لحاظ سے بہت معمولی اور ادنیٰ شئے ہے مگر کفر اور شرک کے اعتبار سے بہت اعلیٰ وارفع ہے ۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود		لیک بس عالی ست پیش خاک تود

اسی وجہ سے حدیث میں ہے مَنْ قال لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دخل الجنة و ان زنی و ان سرق۔ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا اگرچہ زنا اور چوری کرے معاذ اللہ

ؔ اشارۃ " الی قوله تعالیٰ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (فائدہ) عجب نہیں کہ خلفاء راشدین اس معنی کی بنا پر پر کہا جاتا ہو۔ فافہم واستقم۔ ؔ اے نفس مطمئنہ تو اپنے خدا کی طرف لوٹ جا کہ تو خدا سے راضی اور خدا تجھ سے راضی۔

اس حدیث سے زنا اور سرقہ کی اجازت مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے اے لوگو تم کسی طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر کفر اور شرک کے دائرہ سے نکل آؤ۔ زنا اور سرقہ اگرچہ فی حد ذاتہٖ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں مگر کفر اور شرک کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ بخار اور زکام اگرچہ فی حد ذاتہٖ مرض اور بیماری ہے مگر سل اور جذام کے مقابلہ میں عافیت ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ بخار کی طرح زنا اور سرقہ کا مرض ہونا بیان فرمایا وہاں یہ ارشاد فرمایا۔ لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن اور اذا زنی العبد خرج منہ الایمان اور جس جگہ زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے لحاظ سے ذکر فرمایا وہاں یہ ارشاد فرمایا من قال لَا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق۔ یعنی زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے ساتھ وہی نسبت ہے جو بخار اور زکام کو سل اور جذام کے ساتھ ہے۔

ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حالات دریافت کیے تو اس میں یہ بھی دریافت کیا کہ کوئی شخص آپ پر ایمان لانے کے بعد آپکے دین سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا نہیں۔ اس پر ہرقل نے کہا

و کذلک الایمان حین تخالط بشاشتہ القلوب۔	ایمان کی یہی خاصیت ہے کہ جب اس کی مسرت دلوں میں رچ جاتی ہے تو وہ پھر کسی طرح نکل نہیں سکتی۔

⁂ ⁂ ⁂

اس جگہ بشاشت سے وہی اطمینان نفس اور انشراح صدر مراد ہے جسکا ہم ذکر کر چکے ہیں یہی حقیقی ایمان ہے کہ جسکے بعد مرتد ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ حضرات صوفیہ کا ارشاد ہے۔ اِنَّمَا رَجَعَ مَنْ رَّجَعَ مِنَ الطَّرِیْقِ۔ جز این نیست کہ جو شخص واپس ہوتا ہے وہ راستہ ہی سے واپس ہوتا ہے۔ منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد واپسی ناممکن ہے اور اس دعاء ماثورہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا لَّا یَرْتَدُّ۔ (اے اللہ تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں کہ جس کے بعد ارتداد نہ ہو سکے) میں اسی ایمان کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ ایمان صوری کے بعد مرتد ہونا ممکن ہے۔ وہ ایمان جس کے بعد ارتداد ناممکن ہو وہ یہی ایمان ہے کہ جس سے نفس مطمئن ہو جاتے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ اِیْمَانًا لَّا یَرْتَدُّ وَ یَقِیْنًا لَّیْسَ بَعْدَہٗ کُفْرٌ اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ے حالت ایمان میں زانی زنا نہیں کرتا۔ ے جب بندہ نے زنا کیا تو اس سے ایمان نکل گیا۔

ایمان کے وجودی مراتب

علامہ نیسابوری تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین وجود ہیں۔ ایک وجود عینی دوسرا وجود ذہنی تیسرا وجود لسانی۔ اصل ایمان وجود عینی یعنی وجود خارجی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان حجابات مرتفع ہو جائیں تو اس وقت مومن کے دل میں ایک نور حاصل ہوتا ہے۔ یہی نور، ایمان کا وجود عینی ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔	اللہ تعالیٰ دوست ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔

جب کوئی جدید حجاب مرتفع ہوتا ہے اتنا ہی یہ نور کامل اور قوی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے متعلق اس کو شرح صدر ہو جاتا ہے اور نبی کریم اور تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا صدق اس کے نزدیک آفتاب سے زیادہ روشن اور جلی ہو جاتا ہے۔ وقال تعالیٰ۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔	جسکا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک نور پر ہے۔

اور یہی نور قیامت کے دن پل صراط پر اہل ایمان کی رہنمائی کرے گا۔ کما قال تعالیٰ۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔	ان کا نور سامنے اور دائیں جانب دوڑتا ہو گا۔

ایمان کا نور علی نور ہونا اہل ایمان قیامت کے دن آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اور جو شخص دنیا میں نور ایمان سے محروم رہا وہ قیامت کے دن بھی نور ایمان سے محروم رہے گا۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔	جسے اللہ نے نور نہیں دیا پھر اس کے لیے کہیں نور نہیں۔

قیامت کے دن تو سب ہی کو ایمان کا نور ہونا معلوم ہو جائے گا لیکن اس دار دنیا میں بھی جب کبھی کسی عارف اور صاحب بصیرت کو رویائے صالحہ یا کشف سے ایمان مکشوف ہوا تو وہ نور ہی کی شکل میں منکشف ہوا۔

اور اس نور کا مطالعہ اور تصور یہی ایمان کا وجود ذہنی ہے اور زبان سے توحید و رسالت کا اقرار یہ ایمان کا وجود لسانی ہے یاد رکھنا چاہیئے کہ ایمان کا محض لسانی وجود بغیر نور کے مفید اور

کارآمد نہیں جیسا کہ پیاسے کے لیے آب زلال کا فقط تلفظ اور تصور کافی نہیں۔ جب تک کہ اس سے سیراب نہ ہو اَللّٰھُمَّ اشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلْاِسْلَامِ وَ نَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِنُوْرِ طَاعَتِکَ اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

بِالْغَیْبِ

یعنی جو چیزیں ان کی عقل اور حواس سے پوشیدہ ہیں جیسے جنت اور جہنم اور ملائکہ وغیرہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے فرمانے سے ان سب چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور انکو حق جانتے ہیں، اور جو لوگ ان امور غیبیہ کے منکر ہیں وہ سراسر ایمان اور ہدایت سے محروم ہیں اور انکی مثال ایسی ہے جیسے شاعر نے کہا ہے

چو آں کرمے کہ در سنگے نہاں است زمین و آسمانِ او ہماں است

اور ایمان بالغیب کو تقویٰ کی علامت اس لیے قرار دیا کہ محسوسات کی تصدیق ایمان اور تقویٰ کی علامت نہیں اس لیے کہ جو چیز ظاہری یا باطنی حواس سے محسوس اور مدرک ہو اس کی تصدیق اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے اور شرعاً وہی تصدیق معتبر ہے جو ارادہ اور اختیار سے ہو۔

غیب سے کیا مراد ہے

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ بظاہر غیب سے وہ امور مراد ہیں جن کا ذکر حدیث جبریل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ۔ ملائکہ۔ کتبِ الٰہیہ۔ رسلؑ۔ یوم آخرت۔ قضا وقدر۔ ایمان بالغیب سے ان چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے۔ کتاب اور رسول اگرچہ ظاہر کے لحاظ سے محسوس ہیں غیب نہیں لیکن کتاب کا منزل من اللہ ہونا اور پیغمبر کا مرسل من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونا ایک غیبی امر ہے اس اعتبار سے کتب اور رسل بھی ضرور غیب میں داخل سمجھے جائیں گے اور صحابۂ کرام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ایمان بالغیب ہی کہلائیگا۔ اس لیے کہ رسول کی ذات اگرچہ محسوس اور مشاہد ہے مگر وصفِ رسالت اور فرستادۂ خدا ہونا یقیناً غیب ہے۔ یہ کسی نے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور ایمان کا اصل تعلق اسی وصف رسالت کے ساتھ ہے۔

بعض اہل علم نے غیب اور غائب میں فرق بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ

اَلْغَائِبُ مَا لَا یَرَاکَ وَلَا تَرَاہُ غائب تو وہ ہے کہ نہ وہ تجھ کو دیکھے
وَالْغَیْبُ مَا لَا تَرَاہُ اَنْتَ۔ اور نہ تو اس کو دیکھے اور غیب وہ ہے

ے اس کیڑے کی مانند جو پتھر میں پوشیدہ ہے اور وہی اسکا زمین و آسمان ہے۔

کہ تو اسکو نہ دیکھتا ہو اگرچہ وہ تجھ کو دیکھتا ہو۔

اسی وجہ سے حق تعالیٰ پر غیب کا اطلاق درست ہے غائب کا اطلاق درست نہیں۔ اس لیے کہ وہ ہر شئے کو دیکھتا ہے کوئی شئ اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

لطیفہ

بعض شیعہ کہتے ہیں کہ بالغیب سے مہدی موعود اور امام غائب مراد ہیں جن کا شیعہ انتظار کر رہے ہیں۔ واہ واہ

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ

اور قائم اور درست رکھتے ہیں نماز کو یعنی خشوع اور خضوع اور تمام آداب کے ساتھ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔ سورۂ لقمان میں ہے۔

هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ۔ ہدایت اور رحمت ہے ان نیکی کرنے والوں کے لیے جو نماز کو قائم کرتے ہیں

اس آیت میں اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کو المحسنین کی صفت گردانا ہے اور غالباً جبرئیل امین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ما الاحسان (احسان کیا چیز ہے) کہہ کر اسی احسان کی حقیقت دریافت کی ہے جو آیت موصوفہ میں مذکور ہے جسکا جواب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدیں الفاظ ارشاد فرمایا کہ

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ یعنی نماز اور عبادت کا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہی خیال رکھ کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے

مطلب یہ ہے کہ تعظیم کا دارومدار تیرے دیکھنے پر نہیں بلکہ اس کے دیکھنے پر ہے کما قال اللہ تعالیٰ۔ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى کیا نہیں جانتا کہ اللہ اس کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ دربار میں بادشاہ کی تعظیم سب ہی پر فرض ہے خواہ کوئی بادشاہ کو دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو۔ قریب ہو یا بعید ہو۔

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ میں اسی قسم کی نماز مراد ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے عباد متقین کی عبادت اور بندگی کو جب کبھی مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے تو مقیمین الصلوٰۃ کے ساتھ فرمایا ہے مصلین کا لفظ صرف ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جن کی نماز میں اس سرسری ہیئت اور محض ظاہری قیام و قعود کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ ایک جگہ مقام مذمت میں ارشاد ہے۔ فَلَا صَدَّقَ

وَلَا صَلّٰی یعنی اس شخص نے نہ تصدیق کی اور نماز کو قائم کرنا اور ٹھیک طرح سے ادا کرنا تو درکنار اس نے تو کبھی نماز کی ہیئت اور صورت بھی نہیں بنائی۔

بعض علماء کے نزدیک اس مقام پر صلوٰۃ سے مطلق نماز مراد ہے۔ فرض ہو یا نفل۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ فرض نماز مراد ہے۔ اس لیے کہ فلاح جو کہ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ میں مذکور ہے وہ فقط فرض نماز پر موقوف ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے کچھ مسائل اور احکام دریافت کیے۔ آپ نے فرمایا اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں تم پر فرض کی ہیں۔ اعرابی نے کہا کیا اور بھی کوئی نماز ان پانچ کے علاوہ مجھ پر فرض ہے آپ نے فرمایا نہیں۔ اس کے بعد اس شخص نے زکوٰۃ اور صوم کے متعلق دریافت کیا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ واللّٰہ لَا ازید علیٰ ھذا ولا انقص منه خدا کی قسم اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرونگا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ — فلاح پائی اس شخص نے اگر سچ کہا۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ حصہ ہمارے لیے خاص کر لیتے ہیں جسے وقتاً فوقتاً ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

انفاق سے اس جگہ عام معنی مراد ہیں۔ جو زکوٰۃ اور صدقات نافلہ اور ہر قسم کے انفاق فی سبیل اللہ کو شامل ہے بعض اہل علم نے باطنی اور معنوی رزق یعنی علم نافع کے انفاق کو بھی اس آیت شریفہ کے عموم میں داخل فرمایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے سب سے اوّل ایمان کا ذکر فرمایا جو تمام اعمال صالحہ کی جڑ ہے۔ پھر نماز کا ذکر فرمایا جو عبادات بدنیہ میں سب سے افضل ہے۔ پھر عبادات مالیہ زکوٰۃ اور صدقات کا ذکر فرمایا یا یوں کہو کہ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ میں متقین کے حسن اعمال کا ذکر تھا۔ اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں حسنِ اخلاق کا ذکر ہے اور مما میں من تبعیضیہ ہے یعنی مال کا بعض حصہ خرچ کرتے مسرف اور فضول خرچ نہیں اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ کی اپنے عامل یعنی ینفقون پر تقدیم کچھ اہتمام اور اختصاص کی طرف مشیر ہے یعنی ان کے مال کا کچھ حصہ ہمیشہ تصدق اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے مخصوص رہتا ہے۔

ف | جاننا چاہیے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سات قسمیں ہیں۔

ــہ یہ مما رزقنٰهم کی تقدیم کے نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل کشاف میں ہے۔ ۱۲

(۱) زکوٰۃ مفروضہ۔
(۲) صدقۂ فطر۔
(۳) خیرات ومبرات جیسے فقراء کو دینا اور مہمانوں کی ضیافت اور حاجتمندوں کو قرض دینا۔
(۴) وقف جیسے بناء مساجد ومدارس اور کنواں اور مہمان سرائے اور مسافر خانہ۔
(۵) مصارف حج۔
(۶) مصارف جہاد۔
(۷) نفقات واجبہ جیسے نفقۂ عیال اور نفقۂ زوجہ اور نفقۂ محارم۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ

اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اترا تجھ پر اور جو اترا تجھ سے

اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں۔ انہوں

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی

الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

مراد کو پہنچے

قال تعالیٰ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ... الیٰ ... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اور وہ متقی لوگ ایسے ہیں جو ایمان لاتے اس کتاب پر جو تیری طرف نازل ہوئی اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے نازل ہوئیں اس سے مومنین اہل کتاب مراد ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہ اسی لیے اس جگہ والذین کو مکرر لائے کہ یہ متقین کا دوسرا گروہ ہے۔ اور پہلی آیت میں اہل عرب اور امیین کا ذکر تھا وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اور متقین کے یہ دونوں گروہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں آخرت کا تذکرہ اور استحضار متقین کا خاص شعار ہے بخلاف کافروں کے کہ وہ ہر وقت دنیا ہی کی فکر میں رہتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ایسے ہی لوگ ہدایت پر قائم ہیں جو ان کو خدا کی توفیق اور فضل سے ملی ہے کلمہ

علیٰ جو استعلاء کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ لوگ ہدایت پر حاوی اور متمکن ہیں اور ہدایت پر جم گئے ہیں اور مِنْ رَّبِّهِمْ میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ نور ہدایت محض اس رب العالمین کی رحمت اور مہربانی اور اس کی توفیق سے ان کو عطا ہوا ہے جس سے انکی تربیت اور اصلاح مقصود ہے وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ اور ایسے ہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ یعنی مؤمنین کے یہ دونوں گروہ دنیا میں حق تعالےٰ کی توفیق سے نور ہدایت سے سرفراز ہوئے اور آخرت میں اسکی رحمت اور فضل سے مراد کو پہنچیں گے اور مفلح اس کو کہتے ہیں کہ جو اپنی مراد کو بخوبی پہنچ جاتے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ اور کمی واقع نہ ہو پہلے جملہ یعنی اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ میں ایمان اور تقوی کے دنیاوی ثمرہ کا ذکر ہے اور دوسرے جملہ یعنی اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ میں اخروی ثمرہ ذکر ہے بمبئی کا مسافر اگر غلطی سے کلکتہ میل میں بیٹھ جائے اور ریل چھوٹنے کے بعد معلوم ہو کہ یہ گاڑی بجائے بمبئی کے کلکتہ جا رہی ہے تو اس مسافر کی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی اور کلکتہ کے مسافروں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ ان کو اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارا راستہ صحیح ہے۔ اور ہم دیر یا سویر میں ضرور منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

اور اولٰٓئک ۔ کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ان متقین کو ہدایت پر تمکن اور استعلاء کی خصوصیت حاصل ہے اسی طرح ان کو فلاح کی بھی خصوصیت حاصل ہے یہ لوگ غیروں سے ان دو خصوصیتوں کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ
وہ جو منکر ہوئے برابر ہے کہ تو ان کو ڈراوے

اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى
یا نہ ڈراوے وہ نہ مانیں گے مہر کر دی ہے اللہ

قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز
نے اُن کے دل پر اور اُنکے کان پر اور ان کی آنکھوں پر ہے پردہ

وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷ ع
اور اُن کو بڑی مار ہے

ع ۱ ۱

صفاتِ کافرین

قَالَ تعالےٰ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ...... الی ..... عَذَابٌ عَظِیۡمٌ

یہاں تک گروہ اتقیاء کا ذکر فرمایا کہ جو قرآن کریم کی ہدایت سے متمتع اور منتفع ہوئے اب آئندہ اشقیاء کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو اپنی شقاوت اور فساد فطرت کی وجہ سے اس چشمۂ ہدایت سے منتفع نہیں ہوئے. چنانچہ فرماتے ہیں. تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا یعنی جو لوگ اللہ کے علم میں کافر ہیں اُن کے حق میں آپکا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے آپ اس قسم کے لوگوں کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ اور ملول نہ ہوں قرآن کی ہدایت اور آپ کی تبلیغ اور دعوت کا قصور نہیں بلکہ ان کی فاسد اور بگڑی ہوئی استعداد اور فطرت کا قصور ہے اصل کافر وہی ہے کہ جسکا خاتمہ اور موت اللہ کے علم میں کفر پر مقرر ہو چکا ہو۔ جیسے ابو جہل اور ابو لہب و امثالہم۔ ورنہ جس شخص کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا ہے وہ فی الحال محض ظاہر کے اعتبار سے کافر ہے حقیقت اور انجام کے اعتبار سے مومن ہے۔

بُد عمر را نام اینجا بت پرست لیک مومن بود نامش در الست

جو لوگ محض ظاہر کے اعتبار سے کافر تھے ان میں سے بہت سے مشرف باسلام ہوتے اور ہوتے رہیں گے لیکن جو اللہ کے علم میں کافر تھے ان میں سے کوئی ایمان نہیں لایا۔ ایسے کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

گزشتہ آیات میں اہل انعام کا ذکر تھا یعنی جنکو حق تعالےٰ نے ایمان اور ہدایت اور تقویٰ کی نعمت سے سرفراز فرمایا اب اہل غضب اور اہل ضلال کا ذکر فرماتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں خالص کافروں کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر ہے۔

حرف تحقیق یعنی کلمۂ اِنَّ کا استعمال اکثر ان مواقع میں ہوتا ہے کہ جہاں مخاطب کو کسی قسم کا کوئی تردد ہو۔ مگر کبھی کبھی ایسے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے کہ جہاں متکلم یا مخاطب کے گمان کے خلاف کوئی شئی ظاہر ہو جیسے حضرت مریم کی والدہ کا بطور حسرت یہ فرمانا!

رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُہَاۤ اُنۡثٰی۔ اے پروردگار تحقیق میں نے تو یہ لڑکی جنی ہے۔

ؔ یہ آیت نازل ہوئی ان کے حق میں جن کی موت کفر پر اللہ تعالےٰ نے اپنے علم قدیم میں جانی تھی جیسا کہ عتبہ و شیبہ و ابی جہل و ولید بن مغیرہ (موضح القرآن)

خلاف اُمید لڑکی کی ولادت کو بطور حسرت حرف اِنّ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور علیٰ ہذا نوح علیہ الصلاۃ والسلام کو اپنی قوم سے یہ امید تھی کہ وہ میری تصدیق کریں گے جب خلاف امید انہوں نے تکذیب کی تو بطور حسرت یہ فرمایا۔

رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ کَذَّبُوْنِ۔ اے پروردگار تحقیق میری قوم نے تو میری تکذیب کی۔

اسی طرح اس جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امید کے خلاف کفار کے نہ ایمان لانے کو حرف اِنَّ کے ساتھ ذکر فرمایا کہ اے ہمارے نبی آپ ان کافروں کے ایمان کی امید نہ رکھیں۔ ان کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے یہ ایمان نہ لائیں گے اور سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ۔ اس لیے فرمایا کہ کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے لیکن آپ کے حق میں برابر نہیں آپ تو مامور من اللہ ہیں۔ آپ کو تبلیغ اور دعوت کا اجر ہر حال میں ملے گا اس آیت سے یہ مقصود نہیں کہ آپ ان کو تبلیغ اور ہدایت نہ فرمائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے سے غمگین اور ملول نہ ہوں۔

کُفر کی تعریف

ہم يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کی تفسیر میں ایمان کے ساتھ کفر کی حقیقت بھی امام غزالی سے نقل کر چکے ہیں لیکن امام رازی نے جو کفر کی تعریف فرمائی ہے وہ زیادہ واضح ہے اور کفر کی تمام اقسام کو حاوی اور جامع ہے وہ یہ ہے۔

اَلْكُفْرُ عَدَمُ تَصْدِيْقِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا عُلِمَ بِالضَّرُوْرَةِ مَجِيْئُهٗ بِهٖ (تفسیر کبیر ص ۱۵۹ ج ۱)

یعنی کفر کے معنی یہ ہیں کہ رسول اور پیغمبر کی اس چیز میں تصدیق نہ کرنا جس کا بدیہی اور قطعی طور پر دین سے ہونا معلوم ہو چکا ہے۔

کیونکہ کفر کی یہ تعریف یعنی عدم تصدیق الرسول۔ تکذیب اور ترک تصدیق دونوں کو شامل ہے اور امام غزالی نے جو تعریف کی ہے یعنی تکذیب الرسول وہ بظاہر اس شخص کے کفر پر صادق نہ آئے گی۔ کہ جو نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ تکذیب حالانکہ وہ شخص بالاجماع کافر ہے نبی کی تصدیق نہ کرنا ہی کفر ہے خواہ تکذیب کرے یا نہ کرے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کفر کی تعریف بجائے تکذیب کے ترک تصدیق کے ساتھ کی جائے تاکہ کفر کی دونوں صورتوں پر صادق آسکے۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ کرے

وَرَسُوْلِہٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا۔ — تو ہم نے ایسے کافروں کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

اس آیت شریفہ میں نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا۔ وقال تعالیٰ۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِھٰذَا الْقُرْاٰنِ — کافروں نے کہا ہم ہرگز اس قرآن کی تصدیق نہ کریں گے۔

سورۂ صافات میں ہے کہ اہل جنت اہل نار سے یہ کہیں گے۔

بَلْ لَّمْ تَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔ — بلکہ تم تصدیق کرنے والے نہ تھے۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی۔ — اس کافر نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔

بلکہ خود یہی آیت یعنی اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ امام رازی کی تائید کرتی ہے اس لیے کہ اس آیت میں نہ ایمان لانے والوں اور نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔

اقسام کفر

علماء نے کفر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ **کفر تکذیب**:۔ یعنی انبیاء و رسل کو جھٹلانا کما قال تعالیٰ۔

وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ — کافروں نے کہا یہ ساحر اور جھوٹا ہے۔

اِنْ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ۔ — ان قوموں میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا پس میرا عذاب ان پر ثابت ہوگیا۔

(۲) کفر استکبار:۔ تکبر کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو نہ ماننا اور اس کے قبول سے انکار کر دینا۔

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ۔ — ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور تکبر کیا اور تھا وہ کافروں میں سے۔

(۳) کفر اعراض:۔ یعنی پیغمبر کی نہ تصدیق کرے اور نہ تکذیب بلکہ اعراض اور روگردانی کرے کما قال تعالیٰ۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ۔ — اور کافر جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ معرضون کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ "دھیان نہیں کرتے" یعنی نبیؐ کی نصیحت کی طرف توجہ اور التفات نہیں کرتے۔ وقال تعالیٰ۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ — کہہ دیجیے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ کے رسول کی۔ اور اگر روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔

اس آیت میں روگردانی کرنے والوں کو کافر بتایا گیا ہے اور اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں۔

(۴) **کفر ارتیاب** یعنی پیغمبر کے نہ صادق ہونے کا یقین ہے نہ کاذب ہونے کا۔ بلکہ شک اور تردد ہے۔ یہ بھی کفر ہے۔ چنانچہ وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ۔ کی علت حق تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ۔ (یعنی بیشک تھے وہ شک میں متردد)

(۵) **کفر نفاق**: یعنی زبان سے اقرار اور قلب سے انکار کرے اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ سے دور تک اسی کفر نفاق کا بیان ہے۔

حق جل شانہ کا یہ ارشاد خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ پہلے جملہ کی دلیل ہے یعنی ان کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا اس لئے برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمرد اور عناد اور سرکشی کے سزا میں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور انکی آنکھوں پر ایک خاص قسم کا پردہ ہے جو ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور عناد کے سزا میں ان پر علم اور ہدایت کے دروازے بند کر دیئے ہیں نہ آنکھ کے راستہ سے ہدایت پہنچ سکتی ہے۔ اور نہ کان کے راستہ سے لہذا اب کوئی صورت نہیں کہ ہدایت ان کے دلوں تک پہنچ سکے۔ دل کا دروازہ اگر کھلا ہوا ہوتا تو پھر شاید ہدایت اندر داخل ہو جاتی مگر وہ بند کر دیا گیا۔ یہ دنیا میں ہوا۔ اور آخرت میں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے جو فلاح کی سراسر ضد ہے۔

نکتہ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور عَلٰى سَمْعِهِمْ۔ میں کلمۂ علیٰ کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ قلوب اور اسماع ہر ایک کی مہر جلاگانہ اور مستقل ہے۔ جمہور علماء مفسرین و متکلمین یہ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں ختم اور غشاوہ سے مراد نہیں کہ حق تعالیٰ نے حقیقۃً اُن کے دلوں اور کانوں پر کوئی مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر کوئی پردہ ڈال دیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ متکبرین اور معاندین اور ہواپرست اور دشمنان حق و ہدایت اپنی طبعی زیغ اور جبلی کجروی کی وجہ سے اس درجہ اور اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اخلاق ذمیمہ اور رذائل ان کے دلوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہو چکے ہیں کہ ہر فحشاء اور منکر اُن کو مستحسن نظر آتا ہے اور حق جل و علاء کی ہر نافرمانی ان کو لذیذ معلوم ہوتی ہے ان کی حالت نجاست کے کیڑے کی طرح ہے کہ جس کو گندگی سے طبعی رغبت ہوتی ہے اور خوشبو سے اس کو طبعی نفرت ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ نجاست کا کیڑا عطر کی تیز خوشبو کو برداشت بھی نہیں

کر سکتا اور بعض اوقات عطر کی خوشبو سے مر بھی جاتا ہے یہی حالت ان کافروں کی ہے کہ کفر کی نجاست پر فریفتہ ہیں اور حق اور ہدایت کے عطر سے انکو نفرت ہے۔

حق تعالیٰ نے کافروں کی اس حالت کو بطور استعارہ ختم اور غشاوہ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح مہر اور پردہ بیرونی اشیاء کے وصول اور نفوذ سے مانع ہوتے ہیں اسی طرح ان کی یہ حالت ایمان اور ہدایت کو انکے دلوں تک نہیں پہنچنے دیتی اور اندرونی کفر کو اندر سے باہر نہیں آنے دیتی اور نہ ان کے کان کسی حق بات کی طرف التفات کرتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں کسی امر حق کو دیکھنا چاہتی ہیں ایسے لوگوں کو ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

قدوۃ الاولیاء امام حسن بصریؒ یہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ختم اور غشاوہ (مہر اور پردہ) ظاہر اور حقیقت پر محمول ہے کافروں کے دلوں پر حقیقۃً ایک مہر ہے اور حقیقۃً انکی آنکھوں پر ایک پردہ ہے جو مجہول الکیفیۃ ہے اور ہماری نگاہوں سے مستور ہے۔ اللہ کے فرشتے اس ختم اور غشاوہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی مہر اور پردہ کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کافر کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور اُن پر لعنت کرتے ہیں جس طرح قلوب مؤمنین پر نقش ایمان لکھا ہوا دیکھ کر ان کے لیے دعاء اور استغفار کرتے ہیں کما قال تعالیٰ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ یہی لوگ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے پس جس طرح مؤمنین کے دلوں پر ایمان کی کتابت حقیقت ہے اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ بھی حقیقت ہے اگرچہ کتابت ایمان کی طرح اس کی کیفیت مجہول ہے ملائکۃ اللہ جس طرح قلوب مؤمنین پر کتابت ایمان کا حسًّا اور عیانًا مشاہدہ کرتے ہیں اسی طرح وہ قلوب کافرین پر مہر اور اُن کی ابصار پر پردہ کا بھی حقیقۃً معائنہ کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ص ۱۹۰ ج ۱)

و اخرج البزار و البیهقی فی الشعب و ضعفه عن ابن عمر عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال الطابع معلق بقائمة العرش فاذا انتهکت الحرمة وعمل بالمعاصی و اجتری علی اللّٰه بعث اللّٰه الطابع فطبع علی قلبه فلا یقبل بعد ذلك شیئا (تفسیر در منثور ص ۲۳۸) تفسیر سورۃ نساء تحت تفسیر قوله تعالیٰ

امام بزار اور امام بیہقی شعب الایمان میں عبداللہ بن عمرؓ سے راوی ہیں اور امام بیہقی نے اس کی سند کو ضعیف بتایا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا مہر لگانے والا فرشتہ عرش کا پایا پکڑے کھڑا رہتا ہے جب کوئی شخص اللہ کے حکم کی بیحرمتی کرتا ہے اور کھلم کھلا اس کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اللہ کے مقابلہ میں گستاخ اور دلیر ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس مہر لگانے والے فرشتے

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ — کو حکم دیتے ہیں وہ فوراً اس گستاخ اور بیباک کے دل پر مہر لگا دیتا ہے جس کے بعد وہ کسی حق کو قبول نہیں کرتا۔ (تفسیر درمنثور صـ۲۳۸ ج ۲)

اور احادیث صحیحہ اس معنی کی تائید کرتی ہیں چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر لگ جاتا ہے پس اگر توبہ کر لی اور اس گناہ سے باز آ گیا تو دل کو صیقل کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اور گناہ کیا تو وہ نقطہ اور بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اسکے دل کو گھیر لیتا ہے اور یہی وہ رَین (زنگ) ہے جس کی حق تعالیٰ نے کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ میں خبر دی ہے۔ رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔

پس جس طرح ہم ظاہری سیاہی اور سفیدی اور زنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس سے کہیں زائد ملائکۃ اللہ قلوب بنی آدم کی سیاہی اور سفیدی اور زنگ کا معائنہ کرتے ہیں مجاہد فرماتے ہیں کہ رَین یعنی زنگ کا درجہ ختم اور طبع سے کم ہے۔ اور ختم اور طبع کا درجہ۔ اقفال سے کم ہے اور اقفال سب سے زائد سخت ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ کیا ان کے دلوں پر قفل ہیں۔

امام[1] قرطبی فرماتے ہیں کہ حدیث رین اور مجاہد کا قول اس امر کی دلیل ہے کہ آیت میں جس ختم کا ذکر ہے وہ امر حقیقی ہے تفسیر قرطبی صـ۱۸۸ ج ۱۔

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کذب العبد تباعد عنہ الملک میلا من نتن ما جاء بہ رواہ الترمذی۔ — عبداللہ بن عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ بندہ جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔ (ترمذی)

و عن جابر قال کنا مع النبی — حضرت جابر راوی ہیں کہ ہم ایک سفر میں

[1] امام قرطبی حدیث رین کو نقل کر کے فرماتے ہیں قلت وفی قول مجاھد ھذا۔ وقولہ علیہ السلام ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔ دلیل علی ان الختم یکون حقیقیا واللہ اعلم تفسیر قرطبی صـ۱۸۸ ج ۱۔

صلی اللہ علیہ وسلم فارتفعت ریح منتنۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتدرون ما ھذہ الریح ھذہ ریح الذین یغتابون المؤمنین رواہ احمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے یکایک ایک بدبو اٹھی آپ نے ارشاد فرمایا جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے پھر فرمایا یہ بدبو ان لوگوں کے منہ سے آرہی ہے جو اس وقت مسلمانوں کی غیبت کر رہے ہیں۔ (مسند احمد)

ہم اگر قصور بصیرت کیوجہ سے کذب اور غیبت کے رائحۂ کریہہ اور اس کی بدبو کا احساس نہ کر سکیں تو ہمارا یہ عدم احساس معاذ اللہ۔ ملائکہ مکرمین اور انبیاء و مرسلین کے عدم احساس کی ہرگز ہرگز دلیل نہیں بن سکتا۔

اسی طرح اگر ہم اپنی درماندہ اور قاصر بصیرت سے قلوب کافرین کی مہر اور ان کی آنکھوں کا پردہ نہ دیکھ سکیں۔ تو ملائکۃ اللہ کے نہ دیکھنے کی کیسے دلیل ہو سکتا ہے۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ❊ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ ختم اور طبع حق جل شانہ کی جانب سے ابتداءً نہ تھا بلکہ ان کے اعراض اور استکبار اور تکذیب اور انکار کی پاداش اور سزا میں تھا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

پس بسبب ان کے عہد توڑ دینے اور آیات الٰہی کے انکار کر دینے اور انبیاء کو دیدہ و دانستہ ناحق قتل کرنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل پردہ میں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے مہر لگا دی پس یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے مگر ان میں کے بہت تھوڑے۔

❊ ❊

و قال تعالیٰ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔

پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی اور حق سے انحراف کیا تو اللہ نے انکے دلوں کو بالکلیہ حق سے پھیر دیا اور اللہ نہیں توفیق دیتا حد سے نکلنے والوں کو۔

وقال تعالیٰ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۔

آیات مذکورہ میں اس امر کی تصریح ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ ختم اور طبع ان کے نقض میثاق

اور قتل انبیاء اللہ اور زیغ اور انحراف کی پاداش اور سزا تھی ان کی دیدہ دلیری اور علی الاعلان نافرمانی کی ان کو یہ سزا ملی کہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم کردیئے گئے اور مہر لگا کر ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہی سلب کرلی گئی۔ اور معرفت اور ہدایت کی سب راہیں ان پر بند کردی گئیں اب وہ نہ حق کی باتوں کو سمجھ سکیں گے اور نہ سن سکیں گے۔ اور نہ دیکھ سکیں گے اس لیے اب انکو ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔

اور اگر بالفرض حق تعالیٰ جل شانہٗ ابتداءً ہی کسی کے دل پر مہر لگا دیں اور اپنی توفیق اور ہدایت سے محروم کردیں تب بھی ذرا برابر کوئی ظلم نہیں جیسا کہ عطاء بن ابی رباح سے منقول ہے کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے یہ سوال کیا کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے اپنی ہدایت کو روک لیں اور گمراہی اور ہلاکت کو میرے لیے مقدر فرما دیں تو کیا یہ ظلم نہ ہو گا حضرت ابن عباسؓ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ نے تیری کسی مملوک شئ کو روک لیا ہے تو بے شک تجھ پر ظلم کیا اور اگر خدا نے اپنی مملوک شئ کو روک لیا ہے تو وہ اس کی ملک ہے اس کو اختیار ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ وقال تعالٰی قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔

اسی طرح ہدایت بھی اس کی ملک ہے اور اسکی رحمت ہے جس سے اپنے وفاداروں اور اطاعت شعاروں کو نوازتا ہے اور متکبرین اور سرکشوں کو اس سے محروم کرتا ہے۔ (کتاب الھجرتین للحافظ ابن القیم ص۹۹)

حق تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے لوگوں کو مختلف الاستعداد بنایا کسی کو غبی اور کسی کو ذکی کسی کو خوبصورت اور کسی کو بدصورت کسی کو بینا اور کسی کو نابینا۔ کسی کو صحیح سالم تندرست اور کسی کو معذور اور اپاہج اور گونگا اور بہرا۔ جس کسی کو جو کمال اور خوبی عطا کی وہ محض اسکا فضل ہے اس پر کسی کا کوئی حق اور قرضہ نہیں اور جس کو نہیں دیا اس پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اسی طرح اس نے اپنی قدرت اور حکمتِ بالغہ سے کسی کی طینت میں تکبر اور عصیان اور اباء اور سرکشی کی استعداد رکھی اور کسی کی فطرت میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد رکھی اور اپنے احکام کو ان استعدادوں کے ظہور کا ذریعہ بنایا حکم کے بعد استعدادوں کا ظہور ہوا۔ جس میں عصیان اور اباء کی استعداد تھی اس نے نافرمانی کی اور جس میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد تھی وہ حکم خداوندی سنتے ہی سربسجود ہو گیا۔ جیسے بیج میں برگ و بار سب نہاں ہوتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو سب باہر نکل آتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس نے بندوں کو مختلف الاستعداد کیوں بنایا سو یہ سوال بالکل مہمل ہے وہ مالک مطلق اور فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔

کرا زھرۂ آنکہ از بیم تو کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

حق تعالیٰ نے جس زمین کو چاہا ایسا شور بنایا کہ جو تخم اس میں ڈالا جائے وہ سوخت ہو جائے اور کسی زمین کو مرغزار اور لالہ زار بنایا کوئی فلسفی اور سائنس دان اس کی وجہ نہیں بیان کر سکتا کہ خدا تعالیٰ نے زمین کی صلاحیتوں اور استعدادوں میں یہ فرق کیوں رکھا وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا۔ ؎

این زمین پاک و آں شوراست و بد این فرشتہ پاک و آں دیوست و دد
ہر دو گوں زنبور خوردند از محل لیک شد زاں نیش وزاں دیگر عسل
ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب زیں یکے سرگین شد و زاں مشکناب
ہر دو نے خوردند از یک آب خور آں یکے خالی و آں پر از شکر
صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں
ایں خورد گردد پلیدی زو جدا واں خورد گردد ہمہ نور خدا

لطائف و معارف

۱۔(قلب): ۔ لغت میں اس صنوبری گوشت کے ٹکڑے کا نام ہے جو سینہ کے بائیں جانب ایک خالی جگہ میں رکھا ہوا ہے اور یہی مضغۂ لحم۔ روح حیوانی کا منبع اور سرچشمہ ہے اسی میں روح حیوانی پیدا ہوتی ہے۔ جسکے وجود پر بدن کی حس و حرکت موقوف ہے اور جو شرائین کے ذریعہ تمام اعضاء میں پہنچتی ہے مگر اصطلاح شرح میں اُس لطیفۂ ربانی کو قلب کہتے ہیں جو اس مضغۂ لحم میں من جانب اللہ رکھا ہوا ہے اور انسان کی انسانیت اسی سے قائم ہے اور اسی کی وجہ سے احکام شرعیہ کا مکلف اور مخاطب بنتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ اور اسی لطیفۂ ربانی کو قرآن کریم میں کہیں نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کما قال تعالیٰ۔ وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا۔ اور کبھی روح کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ۔ اس قسم کی آیات میں روح سے وہی لطیفۂ انسانی مراد ہے انسان کا بدن عالم خلق سے ہے اور یہ لطیفۂ انسانی عالم امر سے ہے اور الہام یزدانی کا محل اور مورد ہے اس لطیفہ پر جب مہر لگ گئی تو استدلال اور کشف اور الہام کے سب دروازے بند ہو گئے۔

۲۔(سمع):۔ سمع کے معنی کان کے ہیں جو ایک عضو ہے اور کبھی اس کا اطلاق قوت سامعہ پر بھی آتا ہے آیت میں یہی معنی مراد ہیں اس قوت پر جب مہر لگ گئی تو کان کے ذریعہ سے جو ہدایت دل تک پہنچ جاتی تھی اسکا دروازہ بند گیا۔

(۳)(ابصار):۔ جمع بصر کی ہے آنکھ کی روشنی کو بصر کہتے ہیں۔جس طرح دل کی روشنی کو بصیرت کہتے ہیں۔

(۴)(ختم اور غشاوہ):۔ختم کے معنی مہر کرنا تاکہ وہ چیز بند ہوجائے اور چیزیں باہر سے اندر کی طرف نہ پہنچ سکیں۔اور غشاوہ پردہ کو کہتے ہیں آنکھ پر غشاوہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ پردہ آنکھ کی شعاع کو باہر سے روک دے۔

(۵)۔معتزلہ کا گمان یہ ہے کہ کسی کے دل پر مہر لگا دینا ایک امر قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قبیح سے پاک اور منزہ ہے اس لیے معتزلہ قرآن کریم کے اس قسم کی تمام آیتوں کی تاویل کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ختم اور طبع کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف اسناد مجازی ہے۔اہل حق کہتے ہیں کہ یہ اسناد حقیقی ہے قلوب بنی آدم اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں وہ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے قلوب کو پلٹیں دیتا رہتا ہے۔اور پھیرتا رہتا ہے کبھی خیر کی طرف اور کبھی شر کی طرف کما قال تعالیٰ۔ وَ نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ اس قسم کی آیات سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمام قلوب اس کی انگلیوں میں ہیں قلوب کی ہدایت اور ضلالت اور ان کی سعادت اور شقاوت اسکے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے بغیر اسکی توفیق اور عنایت کے ایمان اور ہدایت ممکن نہیں۔ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ۔

تمام کائنات اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اسی نے اپنی قدرت سے ان کو عدم کے پردہ سے نکال کر وجود کی مسند پر بٹھلایا ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ عالم کا کوئی ذرہ بدوں اسکے ارادہ اور مشیت کے حرکت کرسکے ایمان اور ہدایت کفر اور ضلالت سب اسی کی مخلوق ہیں تخلیق و تکوین کے اعتبار سے ہر چیز کی اسناد اس کی طرف ہوگی۔اور اسناد حقیقی ہوگی۔

البتہ کسب اور حصول کے اعتبار سے بندوں کی طرف اسناد ہوسکتی ہے۔چونکہ یہ ختم اور تغشیہ بندوں کے اختیاری تمرد اور سرکشی کا نتیجہ اور اس کی سزا ہے اس لیے متمردین اور معاندین کے تقبیح اور تشنیع کے لیے اسکو ذکر کیا لہذا مورد مذمت اور مستحق ملامت صرف وہی لوگ ہوں گے جو ان خبیث استعدادوں کے ظرف اور محل ہیں۔زہر اور سنکھیہ کا پیدا کرنا تو کمال ہے مگر اسکا استعمال قبیح اور مذموم

ہے اسی طرح روحانی زہر (کفر و ضلالت) اور روحانی تریاق (ایمان و ہدایت) کو پیدا کرنا تو کمال ہی کمال ہے مگر اس کو اپنے اختیار سے استعمال کرنے کا حکم دوسرا ہے زمین اچھی ہو یا بُری۔ شور اور بنجر ہو یا گلزار اور مرغزار ہو پیدا کرنا تو دونوں ہی کا حکمت ہے مگر برائی کیسا تھ شور اور بنجر زمین ہی کو موصوف کیا جائے گا۔ پیدا کرنے والا تو ہر حال میں قابل حمد و ستائش و لائق صد آفرین و تحسین ہے۔ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا۔ جس زمین کو حق تعالے نے شور اور بنجر بنایا اور انبات کی صلاحیتوں سے اسے محروم کر دیا تو خداوند ذوالجلال نے زمین کے اس ٹکڑے پر کوئی ظلم نہیں کیا، اسی طرح خداوند علیم و حکیم نے اگر کسی کے دل پر مہر لگا کر اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر اس کی زمین قلب کو ہدایت کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا تو کوئی ظلم نہیں کیا اہل حق کہتے ہیں کہ یہ ختم اور غشاوہ۔ اُن کی سرکشی اور عناد کی سزا ہے یہ مُہر اُن کو کفر پر مجبور نہیں کرتی اس مہر کا توڑنا ان کے اختیار میں ہے۔ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں ابھی مہر ٹوٹتی ہے۔

حق جل شانہ نے گمراہی کے قفل پیدا کیے اور کافروں کے دلوں پر ڈالدیئے۔ کما قال تعالےٰ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ مگر اس علیم و حکیم نے ان قفلوں کے کھولنے کے لیے مفاتیح (کنجیاں) بھی پیدا کیں تاکہ اگر کوئی قفل ضلالت کو کھولنا چاہے تو کلید ہدایت اور مفتاح سعادت اس کے ہاتھ میں ہے اس سے بسہولت قفل کھل سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بدنصیب کنجی کا استعمال نہ کرے تو قفل خود بخود تو کھلنے سے رہا۔

(۶) امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ کفر اور کافروں کے ساتھ حق تعالےٰ شانہٗ کو ذاتی عداوت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے اس حق جل و علا کے بالذات دشمن ہیں۔ اسی وجہ سے انکا عذاب دائمی ہے اور ان کی مغفرت ناممکن ہے اس لیے کہ صفت رأفت و رحمت جو کہ صفات افعال میں سے ہے وہ ذاتی غضب اور ذاتی عداوت کے مقتضا کو ہرگز نہیں بدل سکتی۔ ایک صفتِ فعل کا مقتضا دوسری صفت فعل کے مقتضا سے متغیر اور متبدل ہو سکتا ہے۔ مثلاً صفت احیا ر سے صفت اماتت کا مقتضا بدل سکتا ہے۔ مگر مقتضائے ذات مقتضائے فعل سے نہیں بدل سکتا۔ اس لیے کہ اقتضائے ذاتی بلاشبہ اقتضائے فعلی اور اقتضار صفاتی سے بدرجہا اعلیٰ وارفع ہے۔ اس لیے قیامت میں کافروں کو اس کی صفت رأفت و رحمت سے کوئی حصہ نہ ملے گا۔ کیونکہ وہ اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کے بالذات دشمن ہیں اور حدیث قدسی میں جو سبقت رحمتی علیٰ غضبی۔ (میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے) وارد ہوا ہے۔ اس سے ذاتی غضب مراد نہیں جو کفار و مشرکین کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ صفاتی اور فعلی غضب مراد ہے جو گنہگار مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے عصاۃ مؤمنین (گنہگار مؤمنین) کے ساتھ ذاتی عداوت اور ذاتی

غضب متعلق نہیں مؤمنین مذنبین کے حق میں جو عقاب اور عتاب بھی آیا ہے وہ ان کے افعال سیئہ کی طرف راجع ہے بلکہ گنہگاروں کے ساتھ ایمان کی وجہ سے ذاتی محبت متعلق ہے اور اسی ذاتی محبت کی وجہ سے اہل ایمان جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور گناہوں کی وجہ سے جو صفاتی اور فعلی غضب ان سے متعلق ہو گیا ہے۔ اسکی وجہ سے چند روز عذاب میں رہیں گے اور پھر اسکے بعد ہمیشہ ہمیشہ روح و ریحان اور نعیم مقیم میں رہیں گے۔ رہا یہ سوال کہ کافر کیلئے آخرت میں تو رحمت سے کوئی حصہ نہیں مگر دنیا میں بھی کیا اسکے لیے کوئی رحمت ہے یا نہیں جواب یہ ہے کہ دنیا میں کافر کے لیے کسی رحمت کا حاصل ہونا فقط ظاہر اور صورت کے لحاظ سے ہے ورنہ حقیقت میں وہ استدراج اور کید متین ہے اور دار آخرت کی طرح دار دنیا میں بھی کفار سے ذاتی عداوت اور ذاتی غضب رحمت کے فیضان سے مانع ہے۔ کما قال تعالیٰ

اَیَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمۡ بِهٖ مِنۡ مَّالٍ وَّ بَنِیۡنَ نُسَارِعُ لَهُمۡ فِی الۡخَیۡرٰتِ ؕ بَلۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ۔

کیا یہ کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مال اور اولاد سے امداد کیے جا رہے ہیں تو انکے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں بلکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ یہ استدراج ہے ہم بتدریج انکو جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں۔

وقال تعالیٰ سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ وَ اُمۡلِیۡ لَهُمۡ ؕ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ ۔

ایسی طرح سے کہ ان کو معلوم بھی نہیں۔ اور انکو ڈھیل دے رہا ہوں۔ بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ

اور ایک لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم یقین لائے اللہ پر اور

بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ۸ یُخٰدِعُوۡنَ

پچھلے دن پر اور ان کو یقین نہیں دغا بازی کرتے

اللّٰهَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ

ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور کسی کو دغا نہیں دیتے مگر

اَنۡفُسَهُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ؕ ۹ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ

آپ کو اور نہیں بوجھتے ان کے دل میں

مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ
آزار ہے پھر زیادہ دیا ہم نے ان کو آزار اور ان کو

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ
دکھ کی مار ہے اس پر کہ وہ جھوٹ کہتے تھے اور جب کہئے

لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ
ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں کہیں ہمارا کام تو

مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ
سنوارنا ہے سُن رکھو وہی ہیں بگاڑنے والے پر نہیں

لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ
سمجھتے اور جب کہئے ان کو ایمان میں آؤ جس

النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ
طرح ایمان میں آئے سب لوگ کہیں کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان ہوئے بیوقوف سنتا ہے

اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ اِذَا لَقُوا
وہی ہیں بیوقوف پر نہیں جانتے اور جب ملاقات

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
کریں مسلمانوں سے کہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب اکیلے جاویں اپنے شیطانوں

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ
پاس کہیں ہم ساتھ ہیں تمہارے ہم تو ہنسی کرتے ہیں اللہ

يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝
ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے انکو انکی شرارت میں بھکے ہوئے

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلضَّلَٰلَةَ بِٱلۡهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت

وہی ہیں جنہوں نے خرید لی راہ کے بدلے گمراہی سو نفع نہ لائی

تِّجَٰرَتُهُمۡ وَمَا كَانُواْ مُهۡتَدِينَ ۝١٦

ان کی سوداگری اور نہ راہ پائی۔

قبائح منافقین

قال تعالیٰ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ... الیٰ .... وَمَا كَانُواْ مُهۡتَدِينَ

ربط ابتدار سورت میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی مدح فرمائی جنہوں نے دل سے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کو مانا اور زبان سے اسکا اقرار کیا۔ یہ اتقیاء کا گروہ تھا بعد میں اشقیاء کا حال ذکر کیا۔ اشقیاء میں دو گروہ تھے۔ پہلا گروہ وہ تھا جو دل اور زبان دونوں سے منکر تھے۔ ان کا ذکر ہوچکا۔ اب آئندہ آیات میں اشقیاء کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو کسی دباؤ اور مصلحت کی بناء پر زبان سے تو مانتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ ایسے شخص کو اصطلاح شریعت میں منافق کہتے ہیں۔ کافروں میں سب سے بدتر یہی فرقہ ہے کہ جس نے کفر کے ساتھ جھوٹ کو جمع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اوس اور خزرج کے اکثر قبائل سچے دل سے اسلام میں داخل ہو گئے مگر بعض قبائل جو یہود سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام کی قوت اور شوکت کو دیکھ کر ظاہر میں مسلمان بنے تاکہ انکے جان و مال اور اہل وعیال محفوظ رہیں مگر اندرونی طور پر یہود اور مشرکین کے ساتھ رہے اللہ تعالیٰ نے انکے بارہ میں یہ آیتیں نازل کیں اور ان آیتوں میں منافقین کے اخلاق ذمیمہ اور افعال قبیحہ کو بیان کیا۔

پہلی قباحت

یہ ہے کہ وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اور تعجب ہے کہ بعضے لوگ باوجود انسان ہونے کے ایسے کمینہ اور کج فہم ہیں کہ محض زبان سے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر حالانکہ وہ کسی درجہ میں بھی مومنین نہیں یعنی اللہ اور یوم آخرت کی

کیا تخصیص وہ تو کسی چیز پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ان کی ذوات کو ایمان اور اہل ایمان سے ذرہ برابر الصاق[1] اور اتصال نہیں۔ الحاق اور اتصاف کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

خاص اللہ اور یوم آخرت کو ذکر کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ سلسلۂ ایمان بالغیب میں سب سے زائد مہتم بالشان اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا ہے یا یہ وجہ ہے کہ بعض مرتبہ کسی سلسلہ کی پہلی اور آخری چیز کا ذکر کر دیتے ہیں اور مقصود استیعاب اور احاطہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں مقصود یہ ہے کہ ہم اہل ایمان کی طرح اوّل سے آخر تک تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور سلسلۂ ایمان کو اول سے آخر تک پکڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسکے جواب میں فرماتے ہیں۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۔"یہ منافقین اپنے زعم میں اللہ اور مؤمنین سے فریب اور دھوکہ کرتے ہیں۔ حالانکہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنے نفسوں کو اس لیے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہیں۔ ان سے کوئی شئے مخفی نہیں اور مؤمنین کو بذریعہ وحی انکی دغا بازی کی اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ ان کے اس فریب سے اہل ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ الٹا انہی کو نقصان ہوتا ہے۔

ف مخادعت مفاعلت کا وزن ہونے کی وجہ سے مشارکت کو مقتضی ہے۔ سو منافقین کی طرف سے تو خداع اور مکر ظاہر ہے۔ مگر حق جل شانہ کی طرف سے ان پر ظاہراً احکام اسلام کا جاری ہونا یا دنیوی نعمتیں دیکر استدراج اور امہال میں مبتلا کرنا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے خداع ہے۔ کہ ظاہر میں تو اعزاز اور اکرام ہے اور درپردہ ارادۂ تذلیل و تحقیر ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۔ یعنی یہ منافقین اس قدر احمق اور بدحواس ہیں کہ اس امر کا ذرہ برابر احساس نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ پر کسی کا کوئی فریب اور دھوکہ کسی طرح نہیں چل سکتا۔

فائدہ (۱) اگر زبان سے اسلام اور ایمان کا اقرار ہو اور دل میں انکار ہو تو یہ اعتقادی نفاق کہلاتا ہے اور اگر دل میں بھی اقرار ہو مگر اعمال اسلام کے پورے مطابق نہ ہوں تو یہ عملی نفاق کہلاتا ہے اس سے کافر نہیں ہوتا اگر حال قال کے مطابق نہ ہو تو سلف صالحین اس کو بھی نفاق کہتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کو پایا کہ ہر ایک اپنے نفس پر نفاق سے ڈرتا تھا۔ حضرات صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ ذرا قلب کی نورانیت میں فرق پایا تو اس کو نفاق سمجھتے تھے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ آپکی حضوری میں قلب کی جو حالت ہوتی ہے وہ اہل و عیال میں جاکر نہیں رہتی۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ حالت ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اگر ہمیشہ یہی حالت رہتی تو گلی کوچوں میں اور بستروں پر فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔

[1] لفظ الصاق سے بمؤمنین کے بار کے ترجمہ کی طرف اشارہ ہے فان الباء للالصاق ۱۲

(۲) جاننا چاہیئے کہ شیعوں کا تقیہ بھی کھلا ہوا نفاق ہے۔ اگرچہ وہ اس کو ایمان کہیں کما قالوا اَلاَ لا ایمان لِمَن لا تقیۃ لہٗ۔ اور کیوں نہیں منافق تو اپنے نفاق کو ایمان اور اخلاص ہی سمجھتا ہے۔

(۳) تفسیر ابن کثیر میں امام مالک سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں ملحد اور زندیق حکم میں منافق کے ہے انتہیٰ۔

(تشریح) جو شخص شریعت کے الفاظ تو بحال رکھے مگر معنی ایسے بیان کرے جس سے اسکی حقیقت ہی بدل جائے ایسے شخص کو قرآن کی اصطلاح میں مُلحِد اور حدیث کی اصطلاح میں زندیق کہتے ہیں ایسا شخص دعویٰ تو اسلام کا کرتا ہے مگر دل میں کفر مضمر ہے اور آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں تاویلات فاسدہ کر کے مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہے وجہ یہ ہے کہ دل میں زیغ اور کجی کی بیماری ہے جو اس کو تاویلات فاسدہ پر آمادہ کرتی ہے اور جتنی تاویلات فاسدہ زیادہ کرتے جاتے ہیں اتنی ہی انکی دل کی بیماری میں زیادتی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔

اور ان منافقین کا اپنے نفسوں کو دھوکہ اور فریب دینا بالکل ظاہر ہے مگر ان کو اس لیے ظاہر نہیں ہوتا کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ انکے دلوں میں ایک خاص قسم کا مرض ہے جس سے ان کی قوت ادراکیہ ماؤف ہو چکی ہے اور یہ کتاب بلاشبہ بیغامِ شفاء اور نسخۂ ہدایت تھی۔ اگر دلوں کو بغض اور عناد سے صاف کر کے اس نسخۂ شفاء کو استعمال کرتے تو شفایاب ہو جاتے۔ مگر اس کتاب ہدایت کے ساتھ ان کا بغض اور عناد زیادتی مرض کا سبب بن گیا۔ پس اللہ نے انکے مرض کو اور بڑھا دیا۔ جو عضو اور جو حاسہ جس غرض اور جس مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہے اس حاسہ سے اس غرض کے نہ حاصل ہونے کا نام مرض ہے۔ زبان کے حق میں نطق اور گویائی اور آنکھ کے حق میں نظر اور بینائی کا۔ اور جسم کے حق میں گرفت اور احساس کا دشوار ہو جانا یہ زبان اور آنکھ اور جسم کا مرض ہے علیٰ ہذا قلب کے حق میں اللہ جل جلالہٗ کی معرفت اور اسکی محبت اور اسکی اطاعت کا دشوار ہو جانا کہ جس کے لیے یہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ قلب کا مرض ہے۔

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است	گر شکر خوردن بود جان کندن است

حالت مرض میں مرغ متنجن اور بہتر سے بہتر غذا بھی مفید نہیں ہوتی بلکہ اور مرض اور بیماری میں قوت اور شدت پیدا کر دیتی ہے۔ ع

ہر چہ گیرد علتی علت بود

اوّل ازالۂ مرض کی فکر چاہیئے اسکے بعد مناسب غذا دیجائے۔ اسی طرح باطنی اور روحانی مریض کو ایمان و ہدایت کی تلقین کوئی نفع نہیں دیتی بلکہ اور مرض میں اضافہ کر دیتی ہے۔

جو شخص صفراء کے مرض میں مبتلا ہے اس کو قند اور نبات بھی تلخ معلوم ہوتی ہے اور قند اور نبات کے استعمال سے اسکا صفراء اور زیادہ ہو جاتا ہے

وَمَنْ يَكُ ذَافَمٍ مُرٍّ مَرِيضٍ يَجِدْ مُرًّا بِهِ الْمَاءَ الزُّلَالَا

جس کے منہ کا مزہ تلخ ہو اس کو آب زلال بھی تلخ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص کفر اور نفاق کے مرض میں مبتلا ہو اس کو ایمان کی حلاوت اور شیرینی کہاں محسوس ہو سکتی ہے۔ کفر اور نفاق کے صفراء نے اس کی قوت ذائقہ کو تلخ بنا دیا ہے اس لیے اس کو ایمان اور ہدایت کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں "کہ ایک آزار یہ تھا کہ جس دین کو دل نہ چاہتا تھا ناچار قبول کرنا پڑا اور دوسرا آزار اللہ نے زیادہ دیا کہ حکم کیا جہاد کا جن کے خیر خواہ تھے۔ ان سے لڑنا پڑا" (موضح القرآن) وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ دعوائے ایمان میں جھوٹ بولتے تھے۔ اور پھر طرفہ یہ کہ اس جھوٹ کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ مردوں کی طرح اپنے عقیدہ کو کھول کر نہیں بیان کرتے۔ عورتوں کی طرح ڈرتے ہیں اسی وجہ سے منافق کھلے کافر سے بدتر ہے۔ اس لیے کہ کافر فقط کفر کرتا ہے مگر جھوٹ تو نہیں بولتا۔ اور نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے بخلاف منافق کے کہ وہ کفر بھی کرتا ہے اور زبان سے جھوٹ بھی بولتا ہے۔ کہ مسلمان ہوں اور اہل ایمان کو دھوکہ دیتا ہے۔ کما قال تعالیٰ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافق تھا وہ اس زمانہ میں زندیق ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی زندیق وہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو اسلام کا کرے مگر دل میں کفر مضمر ہو۔

منافقین کی دوسری قباحت

قال تعالیٰ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ..... الی .... وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝

اور یہ منافقین اپنے باطنی مرض کی وجہ سے اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ فساد کو صلاح اور صلاح کو فساد اور مرض کو صحت سمجھنے لگے ہیں۔ کیونکہ جب اسے یہ کہا جائے کہ زمین میں فساد مت کرو تو یہ کہتے ہیں کہ جز این نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ منافقین کئی طرح سے فساد پھیلاتے تھے۔ کبھی مسلمانوں کے راز فاش کرتے۔ کبھی کافروں کو مسلمانوں کی مخالفت پر آمادہ کرتے اور کبھی کافروں کے اعتراضات ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے سامنے نقل کرتے تاکہ وہ مذبذب اور متزلزل ہو جائیں ان سب کو حق تعالیٰ نے فساد سے تعبیر فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں نفاق خواہ دین کا ہو یا دنیا کا خود ایک مستقل فساد ہے۔ دو رویہ ہونے سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں۔ ایسا شخص ہمیشہ فساد

پھیلاتا ہے اور کسی کا خیر خواہ نہیں ہوتا۔ مسلمان جب ان کو اس قسم کے فسادوں سے منع کرتے تو جواب میں یہ کہتے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۔ جز ایں نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ سب شیر و شکر ہو جائیں۔ آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے۔ نئے دین کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے کے در پے قتل و غارت اور ایذار اور ہتک حرمت ہو گیا ہے وہ سب یک لخت ختم ہو جائے اور ملک اور ملت پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلۂ معاش و تجارت حسب سابق جاری ہو جائے۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں ۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یقیناً یہی لوگ مفسد ہیں۔ کہ کفر اور ایمان اور شرک اور توحید کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور جس کفر و شرک کے فتنہ اور فساد کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے یہ فتنہ پر داز۔ پھر اسی فساد کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانا چاہتے ہیں۔ اور لیکن قلبی مرض کی وجہ سے ان کا باطنی احساس اس درجہ مختل ہو گیا ہے کہ اصلاح اور فساد کے فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ دینِ حق فتنہ نہیں بلکہ کفر اور شرک ہی فتنہ اور فساد ہے۔ اسی کے مٹانے اور اسی کی اصلاح کے لیے حضرات انبیاء مبعوث ہوئے اور کفر اور شرک ہی کے فتنہ کے استیصال کے لیے جہاد و قتال کرنا عین اصلاح ہے۔ جہاد کو فساد بتانا ہی فتنہ اور فساد ہے۔ کما قال تعالیٰ ۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔

کافروں سے قتال و جہاد کرو یہاں تک کہ کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

و قال تعالیٰ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔

لوگ آپ سے ماہ حرام میں قتال کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیئے کہ بے شک ماہ محرم میں ابتداءً قتال کرنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو تنگ اور پریشان کر کے نکالنا ماہ حرام میں قتال کرنے کے جرم سے کہیں زیادہ ہے۔ اور کفر اور شرک کا فتنہ قتل و غارتگری کے فتنہ سے بہت بڑا ہے۔

❊ ❊ ❊ ❊ ❊

اگر کسی مریض کا ہاتھ گل یا سڑ گیا ہو تو اس عضو کا کاٹ دینا اور اس کا داغ دے دینا ہی حاذق طبیب کے نزدیک اصلاح ہے۔ ورنہ اگر اس عضو کو قطع نہ کیا گیا تو تمام بدن کے خراب ہونے کا

اندیشہ ہے۔اسی طرح سے اگر اعداء اللہ سے جہاد و قتال نہ کیا جائے تو روحانی طور پر تمام عالم کے خراب ہونے کا اندیشہ بلکہ ظن غالب ہے۔اب آئندہ آیت میں ان کی بے شعوری کی ایک دلیل بیان فرماتے ہیں کہ وہ اہل عقل اور حق تعالیٰ کا اتباع کرنے والوں کو بے وقوف اور احمق سمجھتے ہیں۔

یہی حال ملاحدہ اور زنادقہ کا ہے کہ آیات اور احادیث میں تاویلات فاسدہ کرکے مسلمانوں کو فتنہ اور فساد میں ڈالتے ہیں اور بے عقلی سے اس فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں۔

منافقین کی تیسری قباحت

قال تعالیٰ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ... الی... اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے وہ لوگ جو حقیقۃً انسان اور آدمی ہیں۔انسان حقیقت میں وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان رکھتا ہو ورنہ وہ شخص "نہ ابن آدم بل غلاف آدمند" کا مصداق ہے۔ ناس سے اس جگہ مطلقاً صحابۂ کرام مراد ہیں یا علماء بنی اسرائیل مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ اور تاریخ ابن عساکر میں ابن عباسؓ سے کما آمن الناس کی تفسیر اس طرح منقول ہے۔ کما آمن ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ اور ان چار کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو خلفائے راشدین کے منہاج اور منوال پر ہو اور کما آمن الناس کے لفظ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور تصدیق اسی قسم کی معتبر ہے جس قسم کی صحابۂ کرام اور خلفاء راشدین نے تصدیق کی۔ ورنہ جو شخص ملائکہ اور جنت اور جہنم وغیرہ وغیرہ کی تصدیق اس معنی کے لحاظ سے نہ کرے کہ جس معنی سے صحابۂ کرام تصدیق کرتے تھے۔ بلکہ اپنی ہوائے نفسانی اور شیطان قرین کے القا کیے ہوئے معنی کے لحاظ سے کرے تو وہ اصلاً معتبر نہیں۔ایسی تصدیق تکذیب کے مترادف ہے اور ایسا ایمان بلاشبہ کفر کے ہم معنیٰ ہے۔الحاصل جب منافقین سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم ایسا ایمان لاؤ کہ جیسا صحابۂ کرام ایمان لائے تو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ ایمان لائے بیوقوف کہ دین کے دیوانے بنے ہوئے ہیں اور زمانہ کے انقلابات سے نہیں ڈرتے ممکن ہے کہ دوسری طرف کا غلبہ ہو جائے دین کی محبت میں دنیاوی مصالح کو نظر انداز کر دیا۔ روافض اور خوارج بھی صحابۂ کرام کو احمق اور کافر اور منافق کہتے ہیں۔سفیہ اس کو کہتے ہیں جو اپنے نفع اور ضرر کو نہ پہچانتا ہو۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ آخرت کے نفع اور ضرر کے فکر میں اس درجہ سرشار اور منہمک

تھے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے کسی نفع اور ضرر کی ذرہ برابر انکو پرواہ نہ رہی تھی۔ اس لیے دنیا کے کتے اُن کو دیوانہ اور بیوقوف کہتے تھے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد اوست فرزانہ کہ فرزانہ نشد

منافقین کا مخلصین کو دیوانہ اور سفیہ کہنا بھی ان کے عقل اور سمجھ دار ہونے کی دلیل ہے۔

ے واذا اتتك مذمتی من ناقص فهی الشهادة لی بانی کامل

ناقص العقل کا میری مذمت کرنا ہی میرے کامل العقل ہونے کی شہادت ہے اس لیے آگے ارشاد فرماتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یہی لوگ احمق اور بیوقوف ہیں جنہوں نے باقی کو چھوڑ کر فانی کو اختیار کیا ہے۔ اور عاقلوں کو احمق سمجھتے ہیں۔ اور حق کو باطل اور ہدایت کو ضلالت سمجھتے ہیں

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسه هواها وتمنی علی الله (رواه الترمذی وابن ماجه)

عاقل اور سمجھ دار وہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بنایا اور ما بعد الموت یعنی آخرت کے لیے عمل کیا اور احمق اور بیوقوف وہ ہے کہ جس نے ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اللہ پر آرزوئیں اور تمنائیں باندھیں (ترمذی شریف، ابن ماجہ)

علاوہ ازیں لیل و نہار آپ کے معجزات کا مشاہدہ کیا اور جو نعت اور صفت آپ کی آسمانی کتابوں میں دیکھی اور پڑھی تھی وہ ہو بہو آپ پر منطبق پائی اور پھر بھی ایمان نہ لائے۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی۔ اور یہ منافق ایسے احمق اور بیوقوف ہیں کہ وہ اپنی حماقت اور بیوقوفی کو بھی نہیں جانتے۔ جو احمق اپنی حماقت کو جانتا ہو وہ غنیمت ہے لیکن جو احمق اپنی حماقت اور سفاہت کو دانائی اور فراست سمجھتا ہو اس کا مرض لاعلاج ہے۔ ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ منافقین اہل اخلاص کو زبان سے بیوقوف بتلاتے ہیں۔ آئندہ آیات میں یہ بتلاتے ہیں کہ محض زبان سے نہیں دل سے بھی انکو بیوقوف سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

منافقوں کی چوتھی قباحت

قال تعالیٰ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ... الی ..... وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ○

اور جب وہ منافقین ملتے ہیں اہل ایمان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب

اپنے شیاطین الانس یعنی اپنے رؤسا کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ سوائے اسکے نہیں کہ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں تاکہ لوگوں پر مسلمانوں کی سفاہت اور بیوقوفی ظاہر ہو کہ محض زبانی اقرار سے ہمکو دعوائے ایمان میں سچا سمجھتے ہیں۔ شیاطین سے منافقین کے پیشوا اور سردار مراد ہیں جو دین الٰہی کے مقابلہ میں ہر قسم کے فتنہ اور فساد کے سرغنہ بنے ہوئے تھے۔ شیطان لغت میں سرکش اور حد سے گزرنے والے کو کہتے ہیں۔ خواہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے ہو۔ کما قال تعالےٰ شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ۔ اہل نفاق کو چونکہ ایمان سے دلی رغبت نہ تھی محض قتل سے جان بچانے کے لیے ایمان کا ظاہراً اقرار کرتے تھے۔ اس لیے اٰمَنَّا کہنے میں کسی حرف تاکید کا استعمال نہ کیا۔ اور جب اپنے شیاطین اور ائمۃ الکفر کی معیت اور مسلمانوں کے استہزار کو بیان کیا تو حرف اِنَّ اور اِنَّما اور جملہ اسمیہ سے اس کو مؤکد کیا۔ یہ تاکیدی کلمات انکار کی بنا پر نہیں بلکہ اظہار شوق و رغبت کے لیے تھے۔ کما فی المطول آئندہ آیت میں ان کے استہزار اور تمسخر کا جواب ہے کہ یہ نادان کیا اہل ایمان کا استہزار اور تمسخر کرتے ہیں ان کو یہ خبر نہیں کہ یہ لوگ خداوند علام الغیوب کے استہزار اور تمسخر کا محل بنے ہوئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ کیا اہل ایمان اور اہل اخلاص کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ ان کے ساتھ تو اللہ تعالےٰ وقتاً فوقتاً تمسخر کرتا رہتا ہے اور اُنکی سرکشی اور گمراہی میں انکو ترقی دیتا رہتا ہے دراں حالیکہ وہ اس میں سرگشتہ اور سرگرداں ہیں۔ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کا استہزار یہ ہے کہ ان کو خوب مال و دولت دیا تاکہ خوب مغرور اور مست ہو جائیں اور پھر دفعتہً انکو پکڑ لیا جائے۔ کافر اس مال و دولت کو نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ عذاب اور نقمت ہے۔ کما قال تعالےٰ۔

اَيَحْسَبُونَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔	کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جس مال اور اولاد سے ہم ان کی مدد کرتے ہیں اور ان کے لیے خیر اور بھلائی کے لیے سعی کر رہے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کو اس کا احساس نہیں کہ (یہ استدراج اور امہال ہے)

بعض سلف صالحین سے منقول ہے کہ کافر جب کوئی معصیت کرتا ہے تو اللہ جل شانہ ظاہراً اس کے لیے کوئی دنیوی نعمت پیدا فرماتے ہیں۔ اور وہ حقیقت میں بلاء عظیم اور نقمت یعنی مصیبت ہوتی ہے۔ قال اللہ تعالےٰ۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ	پس جب کہ وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ہر چیز کے

شَیْءٍ حَتّٰٓی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۔ دروازے ان پر کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہوگئے اس شے سے جو ان کو دی گئی تھی تو ہم نے ناگہانی طور پر انکو پکڑ لیا بس وہ ناامید رہ گئے

اور آخرت کا استہزاء اور تمسخر وہ ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے ایک جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ جب وہ اس دروازے تک پہنچیں گے تو وہ دروازہ فوراً بند کر لیا جائے گا۔ اور ان کو آگ میں دھکیل دیا جائیگا۔ اہل جنت انکی یہ حالت دیکھ کر ہنسیں گے کما قال اللہ تعالٰی۔

فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ عَلَى الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ۔ پس آج کے دن اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے اور تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھیں گے (اخرجہ البیہقی فی الاسماء والصفات) (درمنثور)

اور ایک استہزاء اور تمسخر قیامت کے دن یہ ہوگا کہ پل صراط پر اہل ایمان کے لیے ایک نور پیدا کیا جائیگا جب منافقین پہنچیں گے تو اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی۔

کما قال اللہ تعالٰے فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ۔

یَعْمَهُوْنَ۔ عمہ دل کی بینائی ضائع ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ آنکھ کی بینائی جاتے رہنے کو عمٰی کہتے ہیں۔ قال تعالٰی فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ۔ (دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں)

آئندہ آیت میں ان کے قابل استہزاء ہونے کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کیوں قابل استہزاء نہ ہوں۔ یہ لوگ تو ایسے بیوقوف اور نادان ہیں کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی۔ ایسے ہی لوگوں نے یعنی جن کے دل نابینا اور اندھے ہوگئے۔ نہایت خوشی اور رغبت سے گمراہی کو ہدایت کے عوض خرید لیا۔ اشتراء کے معنی خوشی اور رضامندی سے خریدنے کے ہیں۔ تجارت اور خرید و فروخت میں خریدنے والے کی رضا شرط ہے۔

کما قال اللہ تعالٰے اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ہذا اس مقام پر بجائے لفظ استبدال کے لفظ اشتراء لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے گمراہی

کو ہدایت کے عوض میں نہایت خوشی سے قبول کیا ہے۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔ پس نہ سودمند ہوئی ان کی تجارت اور وہ آخرت کی تجارت سے واقف بھی نہیں۔ آخرت کی تجارت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اور جان و مال سے اس کی راہ میں کوئی دریغ نہ ہو۔

کما قال تعالیٰ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ۔ اور یہ لوگ تجارت میں نفع تو کہاں سے حاصل کرتے انہوں نے تو اصل سرمایہ ہی کو ضائع کر دیا۔ یہاں اصل سرمایہ سے فطرتِ سلیمہ اور قبولِ حق کی استعداد مراد ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَاۤءَتْ

اُن کی مثال جیسے ایک شخص نے سلگائی آگ پھر جب روشن کیا اس کے

مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا

گرد کو لے گیا اللہ ان کی روشنی اور چھوڑا اُنکو اندھیروں میں نظر

يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

نہیں آتا بہرے ہیں گونگے اندھے سو وہ نہیں پھریں گے۔

منافقین کی دو مثالیں

قال تعالیٰ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا... الیٰ..... فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔

(ربط) حق جل شانہٗ جب منافقین کے قبائح بیان کر چکے تو مزید ایضاح کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ اچھی طرح ان کی سفاہت اور بے وقوفی واضح ہو جائے۔ جس کا ماقبل میں بیان ہوا۔

حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں بار بار ایمان اور ہدایت کو نور فرمایا ہے اور مردہ دلوں کے لیے حیات اور زندگی فرمایا ہے اور کفر اور ضلالت کو ظلمت اور تاریکی اور دلوں کی موت اور بربادی

بتایا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے منافقین کے مناسب جنہوں نے ہدایت کے عوض میں ضلالت اور گمراہی کو اختیار کیا دو مثالیں بیان فرمائیں ایک ناری اور دوسری مائی اس لیے کہ نار مادۂ نور ہے اور ماء یعنی پانی مادۂ حیات ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔

مثالِ اوّل منافقین

مثال ان منافقین کی کوتہ نظری اور غلط فہمی اور نورِ ہدایت کے بدلہ میں ظلمات ضلالت کو خرید کر خسارہ اٹھانے میں اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پس جب آگ نے اس کے آس پاس کو خوب روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو سلب فرما لیا اور چھوڑ دیا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی مشعل کو روشن کیا جس کی وجہ سے حق اور باطل اور ہدایت اور ضلالت خوب واضح اور روشن ہو گئے اور تمام مخلوق نے اس میں راہ پائی لیکن منافق اس وقت اندھے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے نور فطرت اور نور بصیرت کو سلب فرما لیا۔ آفتاب نبوت و ہدایت نے اگرچہ تمام عالم کو روشن اور منور کر دیا مگر جب تک آنکھ میں نور اور بینائی نہ ہو تو آفتاب کی روشنی کیا کام آوے گی۔ کاش کہ نرے اندھے ہوتے تب بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ اندھا کسی کو پکار کر اس کی بات سن سکتا ہے مگر جب بہرا اور گونگا بھی ہو تو پھر راہ پر آنے کی کوئی امید نہیں۔ نابینا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا بہرا ہونے کی وجہ سے کسی کی نصیحت بھی نہیں سن سکتا اور گونگا ہونے کی وجہ سے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ اسی طرح منافقوں کو نہ عقل کی آنکھ ہے کہ جس سے خود سیدھا اور غلط راستہ پہچانیں اور دیکھ سکیں اور نہ مرشد اور کسی اللہ والے کی طرف رجوع ہے کہ وہ انکی دستگیری کرے اور ان کا راہنما بن جائے۔ اور نہ خود حق کی طرف کان لگاتے ہیں۔ پھر ایسے شخص کی راستہ پر آنے کی کیونکر امید ہو۔ هذا توضيح ما قاله الشاه عبد القادر الدهلوی فی موضح القرآن۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں۔ مترجم گوید حاصل مثل آنست کہ اعمال منافقان ہمہ حبط شدند چنانکہ روشنی آں جماعۃ دور شد۔ انتہیٰ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ ہدایت کے بعد گمراہی میں چلا جانا ایسا ہے جیسا کہ روشنی کے بعد اندھیرے میں جا پھنسنا۔

عبداللہ بن مسعود اور دیگر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس آیت شریفہ کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے تو کچھ لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور بعد چندے منافق بن گئے تو ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ظلمت اور تاریکی

میں تھا اس نے آگ سلگائی اسکی روشنی سے آس پاس کی تمام چیزیں نظر آنے لگیں اور جو چیزیں بچنے کے قابل تھیں۔ وہ اس کو معلوم ہو گئیں۔ یکایک وہ آگ بجھ گئی اور راستہ کے کانٹے اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ اب وہ حیران اور سرگرداں ہے کہ کس چیز سے بچے اور کس چیز سے نہ بچے۔ اسی طرح یہ منافقین پہلے سے کفر اور شرک کی ظلمتوں اور تاریکیوں میں تھے کہ اسلام لے آئے جس کی وجہ سے حلال و حرام خیر اور شر سب معلوم ہو گیا۔ اور یہ سمجھ گئے کہ کس چیز سے بچیں اور کس چیز سے نہ بچیں۔ اسی حالت میں تھا کہ منافق ہو گیا۔ اور مثلِ سابق پھر ظلماتِ کفر میں جا پھنسا اب اس کو حلال اور حرام، خیر اور شر کی کوئی تمیز نہیں۔ (ابن کثیر)

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ نہایت صحیح ہے اوّل ایمان لاکر نور حاصل کیا۔ پھر نفاق کر کے اس نور کو ضائع کیا۔ اور ہمیشہ کے لیے حیرت میں پڑ گئے۔ راہِ دنیا میں جو ظلمت کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوتی ہے اس کو اس پریشانی اور حیرت سے کہ جو راہِ آخرت میں باطنی ظلمات کی وجہ سے پیش آئے۔ وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریا کے ساتھ ہے۔ دنیا کی ہر پریشانی محدود اور متناہی ہے اور آخرت کی پریشانی غیر محدود اور غیر متناہی۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کسی وقت میں بھی ایمان نہیں لائے۔ ابتدا ہی سے منافق تھے کسی وقت بھی دل سے ایمان نہیں لائے یہ لوگ از اوّل تا آخر منافق رہے تو اس صورت میں آیت کا مطلب وہ ہوگا جو حضرت ابن عباسؓ اور ابو العالیہ اور ضحاک اور قتادہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ منافقین نے محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا اور محض ظاہراً اسلام لائے تو انکو یہ نفع ہوا کہ اس کلمۂ طیبہ کی روشنی میں دنیا میں خوب امن سے رہے۔ جان و مال محفوظ رہا۔ مسلمانوں کے ساتھ مال غنیمت میں شریک رہے جب تک زندہ رہے کلمۂ شہادت کی روشنی سے یہ دنیوی منافع حاصل کرتے رہے۔ مرتے ہی اُن کا یہ نور جاتا رہا اور عقابِ سرمدی کے ظلمات میں جا پھنسے (ابن کثیر) کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت اگر اخلاص سے کہا جائے تو سبحان اللہ نورٌ علیٰ نور ہے۔ لیکن یہ کلمہ اگر نفاق سے بھی کہا جائے تب بھی اس میں ایک نور ہے اگرچہ وہ اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ناتمام اور ناکافی ہے۔ اس لیے کہ یہ کلمہ سراسر حق ہے اگرچہ منافق اس کو اپنی حماقت سے حق نہ سمجھے۔ اور ہر حق میں نور اور روشنی ہے۔ بہر حال منافق کو اس کلمۂ طیبہ کے اعتراف و اقرار کی وجہ سے ایک درجہ کا نور ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ ظلمت اور تاریکی جو کچھ ہے وہ نفاق کی وجہ سے ہے۔ اور اس کلمۂ حق کی روشنی سے دنیاوی فوائد اور منافع حاصل کیے جن کو حق جل شانہٗ نے ماحولہٗ سے تعبیر فرمایا۔ ہر منافق اور خود غرض کا طریق یہی ہے کہ ہر وقت اس کی نظر ماحول پر رہتی ہے۔ اسی طرح ان منافقین نے ظاہری ماحول کو دیکھ کر فقط زبانی قول پر اکتفا کیا اور بجائے مغز کے خول کو کافی سمجھا اور یہ نہ سوچا کہ ظاہری ماحول کو دیکھنا اَحْوَل (بھینگا) کا کام ہے۔ چونکہ دنیاوی منافع چند روز ہوتے ہیں اس لیے اس کو تشبیہ اس جلانے والی آگ سے دی گئی جو تھوڑی دیر میں بجھ

گئی اور اسکا نفع جاتا رہا اور دائمی حیرت و حسرت نے اس کو آگھیرا۔ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ۔ امام غزالی قدس اللہ سرہٗ مشکوٰۃ الانوار میں فرماتے ہیں کہ نور اس کو کہتے ہیں جو بذاتہٖ اور بنفسہٖ ظاہر ہو اور دوسرے کے لیے مُظہِر ہو۔ علامہ سہیلی روض الانف صد ۱۲۶ میں فرماتے ہیں کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو نور سے منتشر ہو۔ نور، ضیاء کے لیے اصل مبداء اور سرچشمہ ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا۔ میں شمس کو ضیاء اور قمر کو نور فرمایا۔ اس لیے قمر کی روشنی میں وہ انتشار اور پھیلاؤ نہیں جو آفتاب کی روشنی میں ہے اور حدیث میں ہے کہ الصلوٰۃ نور و الصبر ضیاء نماز نور ہے اور صبر ضیاء ہے۔ نماز چونکہ عمود اسلام ہے اور فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے اس لیے اس کو نور فرمایا کہ یہی نماز اس صبر کی اصل اور جڑ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ضیاء فرمایا ہے۔ فحشاء اور منکر سے بچنا ہی صبر کا سرچشمہ ہے صبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے نفس کو خدا کی اطاعت پر روکنا اور اس کی معصیت سے بچانا۔ اس لیے صبر اسلام اور ایمان کے اکثر شعبوں کو حاوی اور شامل ہے لہذا صبر میں بہ نسبت نماز کے بہت زائد وسعت اور انتشار ہے جو نماز کی محافظت اور پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا اور چونکہ نور اصل اور مبداء ہے اور ضیاء اس کے تابع ہے۔ اس لیے حق جل و علا پر نور کا اطلاق درست ہے کما قال اللہ تعالیٰ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ضیاء کا اطلاق جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس کا نور تمام روشنیوں کی اصل ہے اس کا نور کسی کے تابع نہیں۔ آہ کلامہ

حکماء نے نور اور ضیاء میں یہ فرق کیا ہے کہ جس روشنی میں حرارت اور گرمی ہو اس کو ضیاء کہتے ہیں اور جس روشنی میں ٹھنڈک ہو اس کو نور کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی آسان اور نرم شریعت کو نور فرمایا کما قال اللہ تعالیٰ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ (بیشک آیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان نور اور ایک روشن کتاب) اور شریعت موسویہ کو احکام شاقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ضیاء فرمایا۔ کما قال تعالیٰ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً۔ بیشک دی ہم نے موسیٰ کو حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب اور تیز روشنی اور اسی وجہ سے کہ نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور صبر میں حرارت اور گرمی ہے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا۔

اور اس مقام پر حق تعالیٰ شانہ نے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ فرمایا اور ذَهَبَ اللّٰهُ بضوءھم نہ فرمایا اس لیے کہ مقصد یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہوگیا اور روشنی کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ ہر طرف سے ظلمت اور تاریکی نے انکو آگھیرا لہذا اگر اس مقام پر بجائے۔ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کے ذَهَبَ اللّٰهُ بضوءھم۔ کہا جاتا تو یہ معنیٰ ہوتے کہ اللہ نے ان کی ضیاء یعنی نور کی شدت اور اس کے انتشار کو زائل کردیا۔ اور اصل نور باقی رہ گیا۔ اور یہ معنیٰ مقصود کے خلاف ہیں۔

اس لیے کہ مقصود تو یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہو گیا۔ اور یہ مقصد نہیں کہ اصل نور تو باقی رہا محض اس کی شدت اور اس کی تیزی زائل ہو گئی۔ فافهم ذلك فانه دقيق و لطيف۔

ابتدار آیات میں چونکہ تذکرہ نار کا تھا اس لیے بظاہر اس کا اقتضاء یہ تھا کہ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ میں بجائے نور کے نار کا ذکر کیا جاتا اور اس طرح کہا جاتا۔ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنَارِهِمْ (اللہ نے ان کی آگ کو بجھا دیا) لیکن بجائے نار کے نور کو اس لیے ذکر کیا گیا کہ نار میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک نور اور ایک حرارت اور احراق (جلانا) لہذا اشارہ اس طرف ہے کہ اس نار میں سے نور (روشنی) کو تو سلب کر لیا گیا اور حرارت اور احراق کو باقی چھوڑ دیا گیا۔

وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔ اور چھوڑا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کسی شئے کو بھی نہیں دیکھتے۔ حدیث میں ہے کہ الایمان بضع و سبعون شعبۃ ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایمان کا ہر شعبہ ایک نور اور مشعل ہے۔ علیٰ ہذا کفر اور نفاق کا ہر شعبہ ظلمت اور تاریکی ہے پس کفر اور نفاق کے شعبوں کے بقدر یہ لوگ ظلمات اور تاریکیوں میں مبتلا ہیں۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس یہ لوگ اب کسی صورت سے حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ اس لیے کہ جب ان کی روشنی چھین لی گئی اور اندھیروں میں چھوڑ دیئے گئے تو ایسے مدہوش ہو گئے کہ سارے حواس مختل ہو گئے لہذا اب نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں اور نہ زبان سے کسی سے پوچھ سکتے ہیں پس ضائع کردہ نور ہدایت کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں۔

تنبیہ یہ مثال ان منافقین کی ہے جن کے دلوں میں نفاق خوب راسخ ہو چکا ہے اب وہ کسی طرح ہدایت کی طرف رجوع کرنے والے نہیں۔ جیسا کہ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ سے معلوم ہوتا ہے اور دوسری آنے والی مثال ان منافقین کی ہے جو ابھی متردد اور مذبذب ہیں کبھی اسلام کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف حیران ہیں کہ کیا کریں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ

یا جیسے مینہ پڑتا آسمان سے اس میں اندھیرے اور گرج

وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ

اور بجلی ڈالتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں مارے

الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹

کڑک کے ڈر سے موت کے اور اللہ گھیر رہا ہے منکروں کو

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ

قریب ہے بجلی کہ اُچک لے ان کی آنکھیں جس بار چمکتی ہے

مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ

ان پر چلتے ہیں اسمیں اور جب اندھیرا پڑا کھڑے رہے اور اگر چاہے اللہ

لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ

لے جاوے ان کے کان اور آنکھیں بیشک اللہ ہر چیز

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰ ع

پر قادر ہے

ع ۲ ۳

منافقین کی دوسری مثال

قال تعالیٰ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ ..... الخ .... اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

یا مثال[۱] ان منافقین کی گمراہی کو ہدایت کے بدلہ خرید کر خسارہ اٹھانے میں ایسی ہے جیسے آسمان سے زوردار پانی پڑ رہا ہو۔ من السماء کا لفظ بڑھانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بارش آسمان کے تمام اطراف اور جوانب کو محیط ہے جس طرح پورے آسمان کو سماء کہتے ہیں اسی طرح آسمان کی جانب کو بھی سماء کہتے ہیں۔ نیز مِنَ السَّمَاۗءِ کے لفظ میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ اس بارش کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کس کی مجال ہے کہ آسمان سے آنے والی چیز کو روک سکے۔ اس میں اندھیرے اور گرج اور

[۱] حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ مترجم گوید حاصل مثل آں ست کہ منافقان در ظلمت نفسانی افتادہ اند وچوں مواعظ بلیغہ شنوند فی الجملہ ایشاں را تنبیہے میشود و آں فائدہ نکند مانند مسافراں کہ در شب تاریک وابر حیران باشند و در برق دو سہ قدم بروند و باز بنشینند۔ واللہ اعلم۔

بجلی ہے۔ جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں خوف کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہے کہ انگلیوں کے پورے نہیں بلکہ پوری انگلیاں اپنے کانوں کے انتہائی سوراخ تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ ہولناک آواز کی وجہ سے موت کے ڈر سے اور اس خوف کی شدت میں یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اللہ تو کافروں کا احاطہ کرنے والا ہے۔ کانوں میں انگلیاں دینا اس کے عذاب سے کسی طرح نہیں بچا سکتا۔ قریب ہے کہ بجلی اُن کی آنکھیں اچک لے جب وہ برق ان کے لیے چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں وہ چلنے لگتے ہیں اور جب اُن پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو حیران کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی دین اسلام بمنزلہ بارانِ رحمت کے ہے جو مردہ دلوں کے لیے آبِ حیات سے کہیں بڑھ کر ہے اور سراسر رحمت ہی رحمت اور نعمت ہی نعمت ہے مگر ابتداء میں کچھ محنت اور سختی ہے جیسے بارش رحمت ہی رحمت ہے اور مردہ زمین کی حیات اور زندگی ہے مگر اول میں کچھ کڑک اور بجلی بھی ہے۔ منافق اوّل کی سختی سے ڈر گئے اور وہ برائے نام مصائب جو حقیقت میں ان کے تزکیۂ نفس کے لیے تھیں ان سے گھبرا گئے۔ اور جس طرح بجلی کی چمک سے روشنی پیدا ہو کر راستہ نظر آجاتا ہے اور بادل کی کڑک سے دل کانپ جاتا ہے۔ اسی طرح منافق جب دنیوی منافع (جیسے جان و مال کی حفاظت، مال غنیمت میں سے حصہ ملنا) ان منافع پر نظر کرتا ہے تو اسلام کی طرف جھک جاتا ہے اور مثلاً جب جہاد کی سختی پر نظر کرتا ہے تو پھر اسلام سے بدک جاتا ہے بہر حال جس طرح بجلی میں کبھی روشنی اور اجالا اور کبھی تاریکی اور اندھیرا۔ اسی طرح منافق کے دل میں کبھی اقرار ہے اور کبھی انکار۔ کما قال تعالےٰ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِۨطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِۨنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ

الحاصل ان آیات شریفہ میں دینِ اسلام کو بارانِ رحمت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اُن کے شبہات اور نفسانی اغراض کو ظلمات کے ساتھ اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والی آیات کو رعد کے ساتھ اور فتوحاتِ اسلام اور غلبۂ دینِ حق کو برق کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جب عذاب سے ڈرانے والی آیتیں نازل ہوتی ہیں تو یہ منافق ان کو سننا نہیں چاہتے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور جب کبھی غلبۂ اسلام کی برق کوندنے لگتی ہے اور اسلام کا نور چمکنے لگتا ہے تو اسلام کی طرف چلنے لگتے ہیں اور جب اغراضِ نفسانی کی ظلمت اور تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے مثلاً کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم آتا ہے تو پھر اسلام کی طرف چلنے سے رُک جاتے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اور اگر خدا چاہتا تو بغیر بجلی اور کڑک ہی کے ان کے کان اور آنکھیں سب ہی لے جاتا۔ بیشک اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ کسی سبب کا محتاج نہیں اور نہ اس کے لیے کوئی مانع ہے۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ ابھی اس فریق کو پہلے فریق کی طرح بالکل اندھا اور بہرہ نہیں بنایا۔ اس فریق سے ابھی ایمان کی امید بالکل قطع نہیں ہوئی ہے شاید یہ ایمان لے آئیں۔ بخلاف پہلے فریق کے کہ جن کی مثال مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا میں ذکر کی گئی۔ ان کے ہدایت پر آنے کی کوئی امید نہیں اس لیے کہ اللہ نے ان کے

نور کو بالکل سلب فرمالیا کما قال تعالے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ اور وہ بہرے اور گونگے اور اندھے ہیں فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف لوٹنے والے نہیں اسی وجہ سے اس فریق کے لیے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ۔ نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کے نورِ فطرت کو ابھی بالکل زائل نہیں فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ

لوگو بندگی کرو اپنے رب کی جس نے بنایا تم کو

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ

اور تم سے اگلوں کو شاید تم پرہیزگاری پکڑو جس نے بنا دیا

لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ

تم کو زمین بچھونا اور آسمان عمارت اور اتارا

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا

آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے کھانا

لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

تمہارا سو نہ ٹھہراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو

تعلیمِ توحید

قال تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ ... الی .... وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(ربط) یہاں تک مؤمنین اور کافرین اور منافقین کے احوال علیحدہ علیحدہ بیان فرماتے اب اس آیت میں علی العموم سب کو خطاب فرماتے ہیں۔ نیز وہ ہدایت جس کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی وہ دو اصولوں پر منقسم ہے ایک توحید اور دوسرے رسالت۔ اس لیے اول توحید اور عبادت کا مضمون ارشاد فرماتے ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی جڑ ہے۔ یعنی یہ کتاب متقین کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔

لیکن تقویٰ کے حاصل کرنیکا طریقہ یہ ہے کہ صرف خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرو اسی وجہ سے یَآاَیُّهَا النَّاسُ ــــــ اُعْبُدُوْا کے بعد لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ شروع سورت میں اس کتاب کا متقین کے لیے موجب ہدایت ہونا بیان فرمایا تھا اب ان آیات میں تحصیل تقویٰ کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اے لوگو اگر واقع میں تم انسان ہو اور اپنی انسانیت کی حفاظت چاہتے ہو تو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا یعنی تم کو اور تمہارے اصول (آباء و اجداد) کو پردۂ عدم سے نکالا اور وجود کا عجیب و غریب خلعت تم کو پہنایا تاکہ تم اس غیر مترقب نعمت اور عمدہ مرحمت کا شکر کرو اور متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔ متقی بننے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر وقت تم اس امر کو پیش نظر رکھو کہ وہ تمہارا پروردگار ہے ایک لمحہ اور ایک لحظہ کے لیے تم اس کی تربیت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتے اسی نے تمکو اور تمہارے آباؤ اجداد کو جن سے تم پیدا ہوئے ہو محض اپنی قدرت سے کتم عدم سے نکال کر وجود کا خلعت پہنایا ہے۔ اپنے امکان کو سوچو تاکہ اسکا وجوب معلوم ہو۔ اپنی عاجزی اور درماندگی کو سوچو تو اسکا قادر مطلق ہونا معلوم ہو اپنی ذلت اور خواری کو سوچو تو اس کا عزیز مطلق اور ذوالجلال والاکرام ہونا معلوم ہو۔ اپنے مملوک ہونے کو سمجھو تاکہ اُس کا مالک ہونا سمجھ میں آئے۔ وعلیٰ ہذا القیاس غایت محبت اور نہایت تعظیم و اجلال کے ساتھ انتہائی تذلل کا نام عبادت ہے مطلق محبت اور مطلق تعظیم اور مطلق تذلل کا نام عبادت نہیں۔ اسی وجہ سے اولاد کی محبت اور والدین اور اساتذہ کی تعظیم اور ان کی تواضع عبادت نہیں کہلائے گی۔ تمام عالم عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا اور سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے اسی عبادت کی دعوت دی۔ حضرت نوح، ہود، صالح اور شعیب وغیرہم علیہم الصلوٰۃ والسلام نے یہی فرمایا۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ ایک اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وقال تعالیٰ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی بھیجتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں) پس میری ہی عبادت کرو۔ اس لیے اب آئندہ آیت میں معرفت معبود کا طریقہ بتاتے ہیں کہ معبود وہ ہے جس نے آسمان اور زمین کو بنایا۔ الخ اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ وہ پاک ذات کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس پانی سے تمہارے کھانے کے لیے قسم قسم کے کچھ پھل اور میوے نکالے پس خدا کے لیے اسکے مقابل اور مماثل ہمتا اور شریک نہ بناؤ اور حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔ کہ تمہارا اور ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور ان انعامات اور انتظامات میں کوئی اس کا شریک اور

سہیم نہیں پس ان انعامات کے شکر میں خاص اسی کی عبادت کرو اور کسی دوسرے کو شریک نہ کرو یعنی یہ سارا عالم بمنزلہ ایک مکان کے ہے۔ آسمان اس کی چھت ہے اور زمین اسکا فرش ہے اور شمس و قمر اور نجوم و کواکب اس گھر کے شمع اور چراغ ہیں۔ قسم قسم کے پھل اور الوان نعمت اس کے دسترخوان پر چُنے ہوتے ہیں۔ عالم کے تمام شجر و حجر اور تمام چرند پرند انسان کی خدمت کے لیے حاضر اور مسخر ہیں اور یہ مکان اس کے رہنے کے لیے ہے پس جس خدا نے یہ تمام نعمتیں پیدا کیں وہی قابل پرستش ہے جب ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو اس کی عبادت اور بندگی میں دوسروں کو کیوں شریک کرتے ہو۔ ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

خلاصہ کلام یہ کہ جو بارانِ رحمت آسمان سے برس رہی ہے وہ بندہ کی زندگی اور حیات ہے اور رزق اسکی غذا ہے عاقل اور دانا کا کام یہ ہے کہ باران رحمت کو نعمتِ عظمیٰ سمجھے نہ یہ کہ اس سے بھاگے۔ اسی طرح اہل ایمان اور اہل اخلاص کو چاہیئے کہ ہدایت خداوندی کی جو بارش آسمان سے ہوئی ہے اس کو اپنی روحانی زندگی کا آبِ حیات سمجھیں۔ منافقوں کی طرح نہ اس سے بھاگیں اور نہ کانوں میں انگلیاں دیں۔ مسند احمد بن حنبل میں باسناد حسن حارث اشعری سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے متعلق حکم فرمایا کہ ان پر خود بھی عمل کریں اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کریں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کو حکم کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ ان احکام کا یا تو خود آپ بنی اسرائیل کو جلد حکم کریں یا مجھ کو اجازت دیں کہ میں بنی اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کا حکم کروں یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ نے سبقت کی تو مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کوئی عذاب نہ آجائے۔ یحییٰ علیہ السلام نے فوراً ہی بنی اسرائیل کو مسجد اقصیٰ میں جمع فرمایا اور منبر پر تشریف فرما ہوتے اور یہ کہا کہ اللہ نے مجھ کو پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ خود بھی ان پر عمل کروں اور تم کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کروں پہلی بات یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے اپنے خالص مال سے بغیر کسی کی شرکت کے ایک غلام خریدا وہ غلام دن میں جو کچھ کماتا ہے وہ بجائے آقا کے کسی اور کو دے دیتا ہے کیا کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو۔ حاشا ہرگز نہیں اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالیٰ ہی تمہارا خالق اور رازق اور مالک ہے پس اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو (بقیہ حدیث کے لیے تفسیر ابن کثیر کی طرف رجوع کریں)

ف امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگر ہزار اطاعت اور عبادت بھی کرے تو ذرہ برابر ثواب کا مستحق نہیں اس لیے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے

کہ عبادت اس لیے واجب ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اوّل تو تم کو پیدا کیا اور پھر بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ لہٰذا اس منعم حقیقی کا شکر بذریعہ عبادت کے تم پر واجب اور لازم ہے بادشاہ کے انعام واکرام کے بعد اگر کوئی بادشاہ کا شکر کرے تو اس شکر کی وجہ سے وہ شخص اپنے کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا بلکہ محض فریضۂ شکر سے عہدہ برآ ہو جانے کو غنیمت سمجھتا ہے اور یہ خوب سمجھتا ہے کہ میرا یہ شکر بادشاہ کے انعام واحسان کے مقابلہ میں، ہیچ ہے اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کے شکر کو سمجھو کہ بندہ کتنی ہی عبادت کرے۔ اسکی ایک نعمت کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتا۔ استحقاق تو درکنار۔ مگر اس نے محض اپنی رأفت ورحمت اور اپنے فضل عمیم سے ہماری ناقص عبادتوں پر بھی اجر اور ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ آمین۔

حق جل شانہٗ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ معبود کی معرفت کے پانچ طریقے بتلائے یا یوں کہو کہ پانچ قسم کے دلائل بیان کیے دو تو نفس کے متعلقات میں سے ہیں اور تین آفاق سے متعلق ہیں اوّل خلقکم فرمایا کہ تم اپنے نفسوں میں غور کرو کہ تم کو عدم کے بعد وجود کی نعمت عطا کی۔ دوم یہ کہ تمہارے آباؤ اجداد کو وجود عطا کیا۔ اور نیست سے ہست کیا جس کو وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے ذکر فرمایا۔ سوم یہ کہ زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا چہارم یہ کہ آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا۔ پنجم یہ کہ آسمان اور زمین کی شرکت سے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے۔ پس جس خداوند ذوالجلال نے یہ عجیب وغریب نعمتیں تم کو عطا کی ہیں اس سے تم اس کی قدرت وعظمت کا اندازہ لگالو۔ اور ہمہ تن اس کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو کیونکہ عبادت خالص اسی منعم حقیقی کا حق ہے۔

غرض یہ کہ اعبدوا اس سورت میں پہلا حکم ہے اور وَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا پہلی نہی ہے اور یہی اسلام کی سب سے پہلی تعلیم ہے کہ صرف خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور کسی کو اس کا شریک اور مثل نہ جانو حق تعالیٰ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ استحقاق عبادت کے وجوہ اور دلائل بھی بیان کیے جو سب کے سب فطری اور عقلی ہیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا

اور اگر ہو تم شک میں اس کلام سے جو اوتارا ہم نے اپنے بندے پر

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ

تو لے آؤ ایک سورۃ اس قسم کی اور بلاؤ جن کو حاضر کرتے ہو

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنۡ

اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو پھر اگر

لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوۡا النَّارَ الَّتِىۡ

نہ کرو اور البتہ نہ کرو گے تو بچو آگ سے

وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

جس کی چھپٹیاں ہیں آدمی اور پتھر تیار ہے منکروں کے واسطے

اثباتِ رسالت نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم بضمنِ اثبات حقیّت قرآنِ عظیم

قال تعالیٰ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا .... الیٰ .... اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ

(ربط) گزشتہ آیات میں عبادت اور معرفت معبود کے طریقے بتلائے اور محکم دلائل سے وجود صانع اور اس کی توحید کو ثابت کیا اور شرک کو باطل کیا اب ان آیات میں دلائل نبوت بیان کرتے ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی معرفت حاصل ہو۔ اور معرفت نبوت کا طریقہ معجزہ ہے اس لیے ان آیات میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ثابت کرنے کے لیے آپ کے سب سے اعلیٰ اور افضل معجزہ کو ذکر کرتے ہیں۔ تاکہ آپکی نبوت و رسالت میں منکرین کو کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

ربط دیگر علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں عبادت کا حکم فرمایا تھا اور ظاہر ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی عبادت مقبول ہے جو اس کی نازل کی ہوئی کتاب سے معلوم ہو لہٰذا آئندہ آیات میں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ذکر فرمائی کہ اگر تم اس کتاب کو کتاب اللہ نہیں سمجھتے بلکہ معاذ اللہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف اور بنائی ہوئی کتاب سمجھتے ہو تو اس کتاب کی ایک سورت ہی کے مثل ایک سورۃ بنا کر پیش کرو۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۔ اور اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں ذرہ برابر کوئی شک اور تردد نہیں جیسا کہ ابتدا سورت میں ارشاد ہوا۔ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ

لَا رَیْبَ فِیْہِ لیکن اگر تم قصور فہم یا عناد کی وجہ سے اس کتاب کے بارہ میں جسکو ہم نے اپنے بندہ پر بتدریج نازل کیا۔ تم کسی شک اور خلجان میں مبتلا ہو گئے تو تم بھی اسی طرح ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت جو فصاحت و بلاغت اور ہدایت وارشاد اور علوم اور معارف میں اس کتاب کے مماثل اور مشابہ ہو لے آؤ قرآن کریم کا وقتاً فوقتاً ضرورت اور واقعات کے لحاظ سے بتدریج نازل ہونا بھی مشرکین کے شک کا زیادہ سبب تھا کہ اگر یہ کلام الٰہی ہے تو تورات وانجیل کی طرح دفعۃً کیوں نہیں نازل کیا گیا کما قال تعالیٰ وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْہِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً تدریج تو بشر کے کلام میں ہوتی ہے جیسا کہ شعراء اور خطباء وقتاً فوقتاً حسب موقعہ اور ضرورت اشعار اور خطبات لکھتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم ان کافروں سے یہ کہہ دو۔ کہ اگر تم اس زعم فاسد اور خیال باطل کی وجہ سے اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں متردد ہو تو تم بھی اسی طرح ایک ہی[1] مرتبہ اس جیسی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت بنالاؤ۔ جو فصاحت وبلاغت اور حسن معانی اور لطائف اور احکام معاش و معاد میں قرآن کا نمونہ ہو اور یہ قرآن اگرچہ بتدریج نازل ہوا ہے مگر اول تا آخر مربوط اور مسلسل ہے۔

کلام عرب میں تحقیق اور یقین کے لیے کلمہ اِذَا۔ اور شک اور تردد۔ ظن اور تخمین کے لیے کلمۂ اِن مستعمل ہوتا ہے اس مقام پر بجائے۔ وَ اِذَا کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ کے وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ۔ میں کلمہ اِن استعمال کرنے میں بظاہر اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ابھی اس میں بھی تردد ہے کہ تم کو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں واقعی شک اور تردد ہے۔ یا دل سے تو تم اس کو کتاب الٰہی سمجھتے ہو اور ظاہر میں محض عناد کی وجہ سے اس کے کتاب الٰہی ہونے میں شک اور تردد ظاہر کرتے ہو۔ اور رَیبٍ کی تنوین تحقیر کے لیے ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا شبہ کوئی قوی نہیں بلکہ ایک نہایت معمولی اور مہمل اور حقیر شبہ ہے جو سراسر قصور فہم اور عناد پر مبنی ہے۔ اس عجیب وغریب بے مثل اور بے نظیر کتاب میں بھی اگر تردد اور شک کی گنجائش ہے تو پھر توریت وانجیل کے کتاب الٰہی تسلیم کرنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا۔

جس شپرہ چشم کو عین نصف النہار کے وقت نور آفتاب میں شک اور تردد لاحق ہوتا ہو۔ وہ شب دیجور میں کواکب اور نجوم کا نور کہاں تسلیم کر سکتا ہے۔ رہا وید سو آج تک اسکا بھید کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ اس کی کیا مراد ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ لہٰذا جس کتاب کا کوئی مفہوم ہی معلوم اور متعین نہ ہوا اس کے بارہ میں شک اور تردد کا سوال ہی عبث ہے علیٰ عبدنا (اپنے خاص بندے پر) اس سے سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مراد ہیں۔ اس اضافت میں (یعنی ہمارے عبد کہنے میں) ایک

[1] اشارۃ الی ان الامر بالاتیان فی قولہ تعالیٰ فاتوا بسورۃ من مثلہ لا یقتضی التکرار ۱۲ عفا عنہ

تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کی طرف اشارہ ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

لا تدعنی الا بیا عبدہا فانہ اشرف اسمائی

مت پکارا کر مجھ کو مگر اس محبوب کا عبد اور غلام کہہ کر کیا یہ نام سب ناموں سے افضل اور بہتر ہے

اگر یکبار گوید بندۂ من از عرش بگذرد خندۂ من

دوسرے اس اضافت میں آپ کے مطیع ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ ہمارے نہایت ہی مطیع اور فرمانبردار بندہ ہیں اور علیٰ عبدنا میں کلمۂ علیٰ کے لانے میں جو کہ کلام عرب میں استعلاء، غلبہ اور احاطہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ کلام الٰہی کے انوار و برکات اور وحی ربانی کے تجلیات خدا کے اس خاص بندہ کو ہر طرف اور ہر جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

بِسُوۡرَۃٍ ۔ لفظ سورت قرآن کریم کی ہر سورت کو شامل ہے خواہ وہ طویل ہو یا قصیر جس طرح قرآن کی طویل سورتیں معجز ہیں اسی طرح چھوٹی سورتیں جیسے سورۂ اخلاص اور سورۂ کوثر اور سورۂ عصر بھی معجز ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ لوگ اگر فقط سورۂ والعصر ہیں تدبر اور تامل کریں تو ان کے لیے کافی اور وافی ہے۔ آھ۔ بلکہ قرآن کا جملہ تام معجز ہے۔ تمام عالم کے فصحاء اور بلغاء مل کر بھی اگر چاہیں کہ قرآنِ کریم جیسا ایک جملہ بنا لائیں تو ناممکن اور محال ہے۔

اول حق تعالیٰ شانہٗ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمام جن اور انس مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ جیسا کہ سورۂ اسراء[1] میں ہے۔ اسکے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ تمام قرآن کا مثل اگر نہیں لا سکتے تو دس سورتیں ہی اس جیسی بنا کر پیش کر دو۔ جیسا کہ سورۂ ہود[2] میں ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت اس سورت کے مماثل بنا لاؤ جیسا کہ سورہ یونس[3] میں ہے اور یہ تمام اعلانات مکہ مکرمہ ہی میں کیے گئے اس لیے کہ یہ تمام سورتیں مکی ہیں یعنی سورۂ اسراء جس میں تمام قرآن کے مثل لانے کا ذکر ہے اور سورۂ ہود جس میں دس سورتوں کے لانے کا اور سورۂ یونس جس میں ایک سورت کے لانے کا ارشاد ہے یہ تمام سورتیں مکہ ہی میں نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں پہنچ کر پھر ایک سورۃ کے مثل لانے کا اعلان کیا گیا ہے جیسا کہ اس آیت یعنی وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۔ میں مذکور ہے اس لیے کہ یہ سورت یعنی بقرہ مدنی ہے

---

[1] کما قال تعالیٰ قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰٓى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا ۔ ۱۲ [2] کما قال تعالیٰ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۔ ۱۲

[3] کما قال تعالیٰ۔ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَـرٰٮهُ‌ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۱۲

اور ہجرت کے بعد سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی۔ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ اور اگر تم تنہا اس کے مثل لانے پر قادر نہیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم سوائے خدا تعالےٰ کے اپنے تمام اعوان و انصار کو بلا لو اگر تم اپنے اس اعتقاد میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں تاکہ وہ تمہاری اس کام میں مدد کر سکیں اور اس مشکل کو حل کر سکیں اور سب مل کر قرآن کے ہم پلہ کلام لا سکیں۔ پس اگر تم سب مل کر بھی ایسا نہ کر سکو۔ یعنی اس کے مثل کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی نہ لا سکو اور ہم پیشینگوئی کیے دیتے ہیں کہ تم ہرگز نہ لا سکو گے۔ قرآن کا ایک اعجاز تو یہ تھا کہ کوئی اس کے مثل نہیں لا سکتا۔ دوسرا اعجاز یہ ہے کہ پہلے ہی پیشینگوئی کر دی گئی اور غیب کی خبر دے دی گئی کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے مثل نہ لا سکے گا۔ بحمد اللہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے اور کوئی شخص اسکے مثل نہ لا سکا۔ بالفرض اگر کوئی شخص قرآن کا معارضہ کرتا تو ضرور نقل ہوتا اس لیے کہ ہر زمانہ میں قرآن کے مخالفوں کا عدد ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ اگر کسی نے قرآن کریم کا معارضہ کیا ہوتا تو اس کا مخفی رہنا ناممکن تھا۔

خلاصہ یہ کہ اگر تم اسکا مثل نہ لا سکو اور ہرگز نہ لا سکو گے تو پھر میری نبوت کی تصدیق کرو۔ اور اس کو کلامِ ربّانی اور وحی رحمانی سمجھو۔ تم ذرا تو غور کرو کہ ایک یتیم بیکس اور اُمّی جسکا سارا عرب مخالف اور دشمن ہو وہ ایسا عظیم الشان دعویٰ بغیر تائید الٰہی کیسے کر سکتا ہے کہ تمام جن اور انس بھی اس کا مثل نہیں لا سکتے اور اگر تم اس کی تصدیق نہیں کرتے تو پھر اس آگ سے ڈرو جسکا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اس جگہ پتھر سے یا تو عام پتھر مراد ہیں یا گندک کے پتھر مراد ہیں یا وہ بت مراد ہیں جن کو کافر پوجتے تھے۔ کما قال تعالےٰ۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ "یعنی تم اور وہ بُت جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں" جو دراصل خاص کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ البتہ گناہوں کا میل کچیل صاف کرنے کے لیے گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لیے جہنم میں رکھا جائیگا۔ پھر جو اصل ذات ہی سے نجاست اور گندگی ہیں وہ تو دوزخ میں رہ جائیں گے اور جو اصل سے پاک ہیں یعنی مومن ہیں اور گناہوں کی عارضی نجاست ان پر لگ گئی (کما فی حدیث البخاری ان المؤمن لا ینجس) وہ پاک صاف ہونے کے بعد نکال لیے جائیں گے

ف اس آیت سے اور آئندہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے صاف ظاہر ہے کہ دوزخ ابھی موجود ہے جو لوگ اس کے قائل ہوئے کہ جنت و جہنم ابھی موجود نہیں بلکہ قیامت کے دن موجود ہوگی۔ صریح غلطی پر ہیں اور یہ قول سراسر آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ علامہ زبیدی اتحاف شرح احیاء ص۲۲۱ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ اسی پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ حادی الارواح الی بلاد الافراح میں فرماتے ہیں۔

جنت تیار کی جاچکی ہے مگر اس میں کچھ خالی میدان ہیں جن میں بندوں کے اعمال صالحہ سے باغات اور محل تیار ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنا کرے اس کے لیے جنت میں ایک محل تیار ہو جاتا ہے یا جو شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ ایک مرتبہ الحمد للہ، ایک مرتبہ اللہ اکبر یا ایک مرتبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہے اس کے لیے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ تفصیل کسی اور موقعہ پر کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو رسول اللہ کی رسالت میں شک ہے اور ہماری وحی کو انسانی کلام جانتے ہو تو اٹھو اور میدانِ معارضہ میں آجاؤ۔ مگر ہم پہلے ہی پیشینگوئی کیے دیتے ہیں کہ تم سب مل کر بھی اسکا معارضہ نہیں کر سکتے پس اگر تم معارضہ نہ کر سکو اور تم پر اپنا عجز اور قصور واضح ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ ایمان لے آؤ ورنہ سخت عذاب میں گرفتار ہو گے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ

اور خوشی سنا ان کو جو یقین لائے اور کام نیک کیے کہ ان

لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا

کو ہیں باغ بہتی نیچے ان کے ندیاں جس بار

رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ

ملے ان کو وہاں کوئی میوہ کھانے کو کہیں یہ وہی ہے جو

رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ

ملا تھا ہم کو آگے اور ان پاس وہ آویگا ایک طرح کا اور انکو ہیں

فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۵

وہاں عورتیں ستھری اور ان کو وہاں ہمیشہ رہنا

ذکرِ معاد یعنی قیامت کا بیان و بشارتِ مومنین صالحین

قَالَ تَعَالٰی وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .... الٰی .... وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ربط

حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ سنّت ہے کہ جب کبھی ترغیب اور وعدہ اور بشارت کا ذکر فرماتے ہیں تو اس کے ساتھ ترہیب اور وعید اور انذار کو بھی ذکر فرماتے ہیں تاکہ خوف اور رجار سے مل کر ایمان میں ایک اعتدالی کیفیت پیدا ہو جاتے اسی سنت کے مطابق حق تعالیٰ نے ان آیات میں جب انذار اور کافروں کی وعید کو ذکر فرمایا تو آئندہ آیات یعنی وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ میں مومنین صالحین کے لیئے بشارت کا ذکر فرمایا۔ نیز وہ انذار اور تہدید اگرچہ دشمنوں کو تھی مگر عاشقان جاں نثار میں تو اس کے سننے کی بھی سہار نہیں وہ تو سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی تسلی اور دل تھامنے کے لیے بشارت ذکر فرمائی۔ تاکہ بشارت کی مسرت اور مخاطبت کی لذت سے وہ پریشانی، مبدل بہ شادمانی ہو جائے چنانچہ فرماتے ہیں اور خوشخبری دیدیجیئے آپ اُن لوگوں کو جو اس کتاب پر ایمان لائے اور اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی اور اس کتاب کی ہدایت کے مطابق نیک عمل کیے کہ ان کے لیے عجیب قسم کے باغات ہیں، ہر ایک کا باغ اسکے ایمان اور عمل صالح کے مطابق ہوگا جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی عثمان غنی فرماتے ہیں کہ عمل صالح اس عمل کو کہتے ہیں جو خالص اللہ کے لیے ہو اور ریار سے بالکلیہ پاک ہو کما قال تعالیٰ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ عمل صالح وہ عمل ہے جس میں چار چیزیں جمع ہوں۔

(۱) علم (۲) نیت (۳) صبر (۴) اخلاص (معالم التنزیل) ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بشارت کا پورا استحقاق جب ہے کہ جب ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی ہوں۔ اس آیت میں متعلقات ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیل نہیں فرمائی صرف بالاجمال اتنا کہہ دیا کہ جو لوگ ایمان دار اور نیک کردار ہوں گے ہم انہیں اُن کے وہم وخیال سے بڑھ کر انعام دیں گے۔

جنت لغۃ میں باغ کو کہتے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں ایک خاص مکان کا نام ہے جو نشأۃ آخرت میں ہمیشہ کے لیے ابرار ومتقین کو عنایت ہوگا۔ جیساکہ جہنم اس مخصوص مکان کا نام ہے جس میں کفار کو ہمیشہ کے لیے اور گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لیے رکھا جائیگا۔ جنت اور جہنم پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں اور اسکی حقیقت کی تحقیق کے درپے نہیں۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ نے جس قدر جنت اور جہنم کے احوال واوصاف بیان کیے ہیں ان پر ان سے ایک حرف بھی زیادہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ عالم غیب میں قیاس نہیں چلتا۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ جن کے نیچے سے نہریں نہایت تیزی سے بہتی ہیں۔

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ جب کبھی دیئے جائیں گے ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کے لیے تو یہ

کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہم پہلے دیئے گئے اور دیئے جائیں گے وہ ایسا پھل کہ جو محض دیکھنے میں ایک دوسرے کے مشابہ اور ہمرنگ ہوگا۔ مگر ذائقہ میں مختلف ہوگا۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباس اور دیگر حضرات صحابہ سے منقول ہے کہ یہ تشابہ اور تماثل محض لون اور صورت کے اعتبار سے ہوگا۔ مزہ اور لذت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوگا۔ یہ اس لیے ہوگا کہ ہر مرتبہ جدید مسرت اور نئی خوشی حاصل ہو۔ خلاصہ یہ کہ جنت کے میوے شکل اور صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے مگر مزے میں جدا اور مختلف ہونگے۔ اہل جنت جب کسی پھل کو دیکھیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ وہ پہلا ہی پھل ہے۔ مگر جب چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اور ان کے لیے وہاں ایسی عورتیں ہونگی جو ہر قسم کی ظاہری اور باطنی گندگی سے پاک ہوں گی۔

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی یہ نعمتیں ہمیشہ رہیں گی۔ دنیا کی نعمتوں کی طرح انکو زوال اور فنا نہیں۔ نعمت کتنی ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو مگر زوال اور فنا کا اندیشہ اسکو مکدر کر دیتا ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے۔ ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

اس لیے ارشاد ہوا کہ تم مطمئن رہو۔ ہمیشہ تم انہیں نعمتوں میں رہو گے تنعّم اور لذائذ کا مدار تین چیزوں پر ہے (۱) عمدہ مکان (۲) لذیذ کھانے (۳) حسین وجمیل عورتیں اس لیے حق تعالیٰ شانہ نے جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ میں عمدہ مکان کا اور كُلَّمَا رُزِقُوْا الخ میں لذیذ کھانوں کا اور وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ میں حسین وجمیل ازواج کا ذکر فرمایا۔

ف انسان کے لیے تین چیزوں کا جاننا ضروری ہے (۱) کہاں سے آیا ہے (۲) اور کہاں رہتا ہے (۳) اور کہاں جانا ہے۔ اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم عدم سے آئے ہو اور اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ چند روز زمین میں قیام ہے اور فَاتَّقُوا النَّارَ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عالم آخرت کو جانا ہے عذابِ الٰہی سے بچنے کی کوشش کرو۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِۦٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا

اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے

فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ

اوپر پھر جو یقین رکھتے ہیں سو جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے

لے کافراں چوں ذکر عنکبوت در قرآن شنیدند طعن کردند وگفتند کہ خدا تعالیٰ بذکر ایں چیز ہائے خسیس چہ ارادہ کردہ است ایں آیت نازل شد واللہ اعلم (فتح الرحمٰن)

مِن رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَآ

انکے رب کا کہا اور جو منکر ہیں سو کہتے ہیں کیا غرض

أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي

تھی اللہ کو اس مثال سے گمراہ کرتا ہے بہتیرے اور راہ پر

بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ

لاتا ہے اس سے بہتیرے اور گمراہ کرتا ہے انہیں کو جو بے حکم ہیں جو

يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ

توڑتے ہیں عہد اقرار اللہ کا مضبوط کئے پیچھے اور توڑتے ہیں

مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ

جو چیز اللہ نے فرمائی جوڑنی اور فساد کرتے ملک میں

أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

انہیں کو آیا نقصان

قرآنِ کریم کے کلامِ الٰہی ہونے پر کافروں کا ایک شبہ اور اُسکا جواب

قال تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا .... الیٰ ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۔
گزشتہ آیات میں اعجاز قرآن کی دلیل مذکور تھی۔ یہاں منکرین کے ایک شبہ کا جواب مذکور ہے۔ شبہ کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم میں کہیں مکھی اور کہیں مکڑی کی مثال دی ہے اس پر کافروں نے یہ اعتراض کیا کہ یہ قرآن اگر اللہ کا کلام ہے تو اس میں ایسی حقیر اور خسیس چیزوں کا ذکر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ ایسی خسیس اور حقیر چیزوں کا ذکر کلام الٰہی کی عظمت کے لائق نہیں یعنی اگرچہ ہم قرآن کا مقابلہ نہ کر سکیں لیکن اس کتاب میں ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا

مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ
وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلاً - بیشک اللہ
نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کرے کسی مچھر کی یا اس چیز کی جو حقارت میں مچھر سے بھی بڑھ کر ہو
پس اہل ایمان خوب جانتے ہیں کہ یہ تمثیل بالکل حق ہے اور درست ہے ان کے رب کی طرف
سے اس لیے کہ تمثیل سے مثل لہٗ (جس کی مثال دی گئی) کی توضیح اور تفصیل مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا
حقیر اور ذلیل چیزوں کی حقارت اور ذلت کی توضیح اور تشریح کے لیے اسکے مناسب مچھر، مکھی اور
مکڑی اسی قسم کی حقیر و ذلیل چیزوں کی مثال ذکر کی جائے گی تاکہ اس شئی کی حقارت اور ذلت واضح ہو
جائے عزیز اور عظیم چیزوں کی مثال سے حقیر اور خسیس چیزوں کی حقارت اور ذلت کو کس طرح سمجھایا
جا سکتا ہے۔ مثال کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مثال دینے والے کے مطابق ہو۔ بلکہ مثل لہٗ کے
مطابق ہونی چاہیئے حقیر کی مثال حقیر سے اور عزیز کی مثال عزیز سے دینی چاہیئے۔ ورنہ ہر عاقل
جانتا ہے کہ حقیر کو عزیز سے مثال دینا احمقوں کا کام ہے۔ توریت اور انجیل اور کلام حکماء میں اس
قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ - | اور البتہ تحقیق ہم نے بیان کی ہے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر مثال تاکہ نصیحت پکڑیں۔

وَ قال تعالیٰ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ - | یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ تفکر اور تامل کریں۔

بعض سلف سے منقول ہے کہ جب میں قرآن کی کسی مثل کو سنتا ہوں اور اس کو نہیں سمجھتا
تو میں اپنے اوپر روتا ہوں اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں۔

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ - | یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے ان کو مگر اہل علم۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ مچھر کی مثال اللہ نے دنیا کے لیے بیان فرمائی ہے مچھر جب تک
بھوکا رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جب کھا کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے اسی طرح اہل دنیا جب دنیا
سے خوب سیر اور سیراب ہو جاتے ہیں تو اللہ ان کو پکڑتا ہے پس وہ ہلاک ہوتے ہیں کما قال تعالیٰ۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ - | پس جب بھول گئے وہ اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہو گئے اس سے جو ان کو دیا گیا

پس پکڑ لیا انکو ناگہاں پس وہ ناامید ہو کر
رہ گئے (تفسیر ابن کثیر)

خلاصہ یہ کہ اہل ایمان مثالوں کو حق سمجھتے ہیں کہ اشیاء کی خست اور حقارت بیان کرنے کے لیے یہ مثالیں دی گئی ہیں۔ اور کافر لوگ اپنی حماقت سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ان حقیر مثالوں سے کیا غرض ہے۔ اور کیا ارادۂ خداوندی ایسی حقیر چیزوں کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ آئندہ آیت میں اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس مثال سے بہتوں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتوں کو۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل۔ اہل ہدایت اور اہل ضلالت میں فرق ہو جائے۔ قرآن اور اس کی تمثیلات سب حق اور عین ہدایت ہیں صحیح المزاج اور سلیم الطبع اشخاص (یعنی اہل ایمان) جب ان تمثیلات کو سنتے ہیں اور ان میں تفکر اور تامل کرتے ہیں تو ان کی ہدایت میں اور اضافہ ہوتا ہے اور ان تمثیلات سے انکو صراط مستقیم اور حق کا راستہ خوب واضح ہو جاتا ہے اور جن کی روح کا مزاج بالکل فاسد اور خراب ہو چکا ہے ان کو ان تمثیلات سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ان کی گمراہی میں، اور زیادتی ہو جاتی ہے۔ فاسد المزاج کو جس قدر بہتر غذا دی جائے گی اسی قدر اسکے فساد اور مرض میں اضافہ ہوگا۔

قرآن عزیز میں جس طرح ہدایت اور اضلال کو حق جل شانہ کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح ہدایت کو انبیاء و مرسلین اور علماء ربانیین اور ائمہ مجتہدین کی جانب اور اضلال کو شیاطین اور اخوان شیاطین کی جانب بھی منسوب کیا گیا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ہدایت اور اضلال کے معانی اور مراتب کو ذکر کیا جائے تاکہ خدا کی ہدایت اور انبیاء و مرسلین کی ہدایت میں فرق معلوم ہو اور جو اضلال حق تعالے جل شانہٗ کی جانب منسوب ہے اس کی کیا حقیقت ہے اور جو اضلال شیاطین اور اخوان شیاطین کی جانب منسوب ہے اسکی کیا ماہیت ہے۔

مراتبِ ہدایت

مرتبۂ اولیٰ ہدایتِ بیان۔ یعنی حق کو بیان کرنا اور واضح کرنا اور لوگوں کو حق کی تعلیم اور دعوت دینا۔ اس معنیٰ سے ہدایت اللہ کی طرف اور اس کے انبیاء و مرسلین اور ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔

اللہ نے بھی حق کو بیان کیا اور اس کی طرف اپنے بندوں کو دعوت دی اور اس کے حکم سے انبیاء و مرسلین اور علماء نے بھی حق کو بیان کیا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی اور اس کی طرف بلایا۔

قال تعالیٰ۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۔ تحقیق ہم نے انسان کو راستہ بتایا تو شکر کرے یا ناشکری کرے ۔

وقال تعالیٰ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ۔ قوم ثمود کو ہم نے سیدھا راستہ بتایا لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی ۔

اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو خطاب فرماتے ہیں ۔

وقال تعالیٰ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ۔ ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے ۔

ان تمام آیتوں میں ہدایت بمعنی البیان مراد ہے اور یہ ہدایت اللہ رب العزت کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ انبیاء اور علماء کی طرف بھی اسکی اسناد ہو سکتی ہے ۔ نیز یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مؤمن اور کافر سب کے لیے ہے ۔

مرتبۂ ثانیہ ہدایت توفیق ۔ یعنی خدا کا اپنے فضل و کرم سے بندہ کے لیے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کو اس کی خواہش اور طبعی میلان کے ایسا موافق بنا دینا کہ اس کی اطاعت لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت حنظل سے بھی زیادہ تلخ معلوم ہو ۔ خیر کے اسباب اور دواعی کو اس کے لیے جمع کر دینا اور اُسکے تمام عوائق اور موانع کو یکلخت اٹھا دینا ۔ یہ ہدایت اللہ جل جلالہٗ کے ساتھ مخصوص ہے اس ہدایت پر نہ کوئی ملک مقرب قادر ہے نہ کوئی نبی مرسل کما قال تعالیٰ ۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ الآیۃ تحقیق آپ جس کو چاہیں راہ پر نہیں چلا سکتے ۔ لیکن اللہ ہی جسکو چاہے راہ پر لائے ۔

اس آیت میں اللہ کے لیے جس ہدایت کو ثابت کیا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس ہدایت کی نفی کی گئی وہ یہی ہدایت بمعنی التوفیق ہے اور اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ میں جس ہدایت کو نبی کریم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ ہدایت بمعنی البیان و دعوۃ الحق ہے ۔ نبی کا کام ہی یہ ہے کہ حق کو بیان کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دے اور اسکی طرف بلاتے مگر خداوندی اطاعت کا ہوائے نفسانی کے مطابق بنا دینا ۔ اور خدا کی عبودیت اور بندگی کی حلاوت اور شیرینی کسی کے دل میں اتار دینا یہ سوائے اسی ملیک مقتدر کے کسی کے قبضہ میں نہیں ۔ چنانچہ حدیث میں ہے لا یتوفق عبد حتی یوفقہ اللہ ۔ بندہ خود بخود توفیق نہیں پاتا یہاں تک کہ خدا اسکو توفیق دے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام غزوۂ احزاب میں خندقیں کھودتے وقت یہ پڑھتے تھے ۔ اللّٰھم لولا انت ما اھتدینا ۔ ولا تصدقنا ولا صلینا ۔ فانزلن سکینۃ علینا ۔ (اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے ۔ اور نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے ۔ پس تو ہم پر سکینت اور طمانیت

نازل فرمایا اور یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہے۔ حق تعالیٰ اس نعمت کبریٰ اور رحمت عظمیٰ سے ان بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس کی رضا اور خوشنودی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت کی جانب گوشۂ چشم سے ایک ادنیٰ التفات کو بھی روا نہ رکھتے ہوں۔ کما قال تعالیٰ

یَهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَیَهۡدِیۡهِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ	جو اللہ کی رضا مندی کا تابع ہو اس کو اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتے ہیں اور سیدھے راستہ پر اس کو چلاتے ہیں۔

مراتب اضلال

اضلال، ہدایت کا مقابل ہے۔ جس طرح ہدایت کے دو معنی ہیں اسی طرح اضلال کے بھی دو معنی ہیں۔

معنیٰ اوّل اضلال کے ایک معنی یہ ہیں کہ خدائے عز و جل کی معصیت کی دعوت دینا اور اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کو قبیح کرکے بتلانا اور اس کی نافرمانی کو مزین اور مستحسن کرکے ظاہر کرنا اور حق کو باطل کے ساتھ ملتبس کرنا۔ حق تعالیٰ نے اسی اضلال کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیۡنٌ۔ وقال تعالیٰ۔

زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَهُمۡ فَصَدَّهُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ	اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے خوبصورت بنا کر دکھایا۔ پس اس طرح سے انکو سیدھے راستہ سے روکا۔

اور ایک مقام پر اسی اضلال کو فرعون کی طرف منسوب کیا ہے۔

وَ اَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهٗ وَ مَا هَدٰی	اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ان کو سیدھا راستہ نہ بتایا۔

اور ایک جگہ سامری کی طرف منسوب کیا۔

وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ	سامری نے انکو گمراہ کیا۔

اس معنی کر اضلال ہمیشہ شیاطین اور اخوان شیاطین اور ائمۃ الکفر کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی جانب کبھی اس اضلال کی اسناد نہیں کی جاسکتی۔ وہ قدوس حکیم اس سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ معاذ اللہ اپنے بندوں کو شر، فحشاء اور منکر کی طرف بلائے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ	تحقیق اللہ تعالیٰ تم کو حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور صلہ رحمی کا اور منع کرتا ہے تمکو ہر بے حیائی اور نامعقول بات اور سرکشی سے اللہ تعالےٰ تم کو سمجھاتے ہیں شاید تم یاد رکھو۔

معنی ثانی اضلال کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنی توفیق اور لطف و رحمت سے کسی کو محروم فرما دیں۔ توفیق اور لطف سے اس شخص کو محروم فرماتے ہیں جو اللہ کی آیتوں کی تکذیب اور انبیاء و مرسلین کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کرے قال تعالےٰ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ۔	اللہ نہیں ہدایت کرتا اس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنیوالا اور جھوٹا ہو۔
وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔	اللہ نہیں ہدایت کرتا حد سے گزرنے والوں کو۔
وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ۔	اور گمراہ کرتا ہے اللہ ظالموں کو۔

یہ اضلال حقیقت میں انکے اسراف، تکذیب، ظلم اور تعدی کی سزا ہے حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف یہی اضلال منسوب ہوتا ہے اور یہ آیت یعنی یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّ یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا۔ جس کی اس وقت تفسیر کی جا رہی ہے۔ اس میں ہدایت اور اضلال کے دوسرے معنیٰ مراد ہیں۔ یعنی خدا اپنی خاص ہدایت اور توفیق اور لطف و رحمت سے بہت سے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس حق جل و علاء کے کلام کی تصدیق کرتے ہیں اور اسکی تمثیل کو حق اور عین ہدایت جانتے ہیں۔ اور اس کے کلام اور تمثیل کا استہزاء اور تمسخر نہیں کرتے۔ اور بہتوں کو ان تمثیلات سے گمراہ کرتا ہے یعنی اپنے توفیق اور لطف و رحمت سے محروم کرتا ہے۔ محروم ان لوگوں کو کرتا ہے جو اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کی حدود سے نکل جاتے ہیں اور خدا سے پختہ عہد کر کے توڑ ڈالتے ہیں جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں۔

وَ مَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ الخ اور نہیں گمراہ کرتا اللہ تعالےٰ ان تمثیلات سے مگر نافرمانوں کو نافرمانی اور سرکشی کی نحوست سے عقل ماری جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کو باطل سمجھنے لگتا ہے اور گمراہ ہوتا ہے۔ اطاعت سے خارج ہونے والوں کو فاسق کہتے ہیں۔ فاسق کا لفظ کافر اور مؤمن عاصی دونوں کو شامل ہے لیکن کافر کا فسق مؤمن عاصی کے فسق سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مگر اس آیت میں فاسق سے کافر ہی مراد ہے۔ قرآن کریم میں فاسق کا لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ قال اللہ تعالےٰ۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ

نوٹ، اگر ہدایت و اضلال کی اور زیادہ تفصیل درکار ہو تو امام رازی قدس اللہ سرہٗ کی تفسیر کبیر کی طرف مراجعت کریں۔

الفٰسِقُوْنَ - اس آیت میں منافقین کو فاسقین کہا گیا ہے اور بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ - اور یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا - ان دونوں آیتوں میں فاسق سے مؤمن عاصی مراد ہے کافر فاسق تو حدود ایمان سے ہی خارج ہوجاتا ہے - اور مؤمن عاصی حدود ایمان سے خارج نہیں ہوتا مگر حدود اطاعت سے خارج ہو جاتا ہے الحاصل حق تعالیٰ شانہ ان اشیاء حقیرہ کی تمثیل سے صرف انہی لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں جو بدکار اور نافرمان ہیں - اور ان لوگوں کو جو خدا کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں - عہد سے اس جگہ وہ وصیت مراد ہے جس کی حق تعالےٰ نے اپنے تمام پیغمبروں کی زبانی تاکید کی کہ خدا کو ایک جانو اور ایک مانو اور اسکے پیغمبروں کی تصدیق کرو - اور بعض کا قول یہ ہے کہ عہد سے وہ عہد مراد ہے جو حق تعالےٰ نے توریت میں یہودیوں سے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا - اور بعض کا قول ہے کہ عہد سے عہد الست مراد ہے یا یوں کہو کہ عہد سے عام مراد ہے خواہ وہ عہد الست ہو یا توریت و انجیل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد ہو - اور توڑتے ہیں اس چیز کو جسکا اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس آیت کے عموم میں ان تمام علائق کا قطع داخل ہے جنکے وصل کا خدا نے حکم دیا ہے - قطع رحمی اور خدا اور اس کے پیغمبروں سے قطع تعلق کرنا یہ بھی اس میں شامل ہے اور فساد کرتے ہیں زمین میں جو قول اور عمل اور جو حرکت اور سکون خدا کی رضامندی کے خلاف ہو وہ سب فساد اور فتنہ ہے - یہ لوگ وہی ہیں جو خسارہ اور نقصان اٹھانے والے ہیں - دنیا میں آخرت کی تجارت کے لیے آئے تھے نفع تو کیا حاصل کرتے اصل رأس المال یعنی عقل اور فطرت سلیمہ کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا اسکو بھی ضائع اور برباد کر دیا - اور صلاح اور رشد اور ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا اور منعم حقیقی کو چھوڑ بیٹھے اور اس سے اپنا تعلق قطع کر لیا - اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ اور نقصان ہو گا -

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ

تم کس طرح منکر ہو اللہ سے اور تھے تم مردے پھر اس نے تم کو جلایا

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۸

پھر تم کو مارتا ہے پھر جلا دے گا پھر اسی پاس الٹے جاؤ گے .

استعجاب بر کفر و نافرمانی و تذکیر انعامات ربانی اور مبدا و معاد کی یاد دہانی

قال تعالیٰ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ ...... الی .... ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ -

حق جل شانہٗ جب دلائل توحید و نبوت و معاد بیان کر چکے اور عبادت کا حکم دے چکے تو اب آئندہ آیات میں اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ ایسے قدیر و عظیم اور رحیم و کریم پروردگار سے سرکشی سراسر تعجب خیز ہے ان انعامات و احسانات کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ تم شکر کرتے نہ کہ کفر۔ حیرت ہے کہ ان انعامات اور احسانات کے بعد تمکو کفر پر جرأت کیسے ہوئی اور اس توبیخ اور عتاب میں دوسرے عنوان اور دوسرے رنگ میں اس دلیل سابق کا اعادہ فرمایا پھر اس سلسلۂ تذکیر میں اولاً نِعَم عامہ کو بیان فرمایا یعنی ان نعمتوں کا ذکر کیا جس کا تعلق عام بنی آدم سے ہے۔ اور ثانیاً نِعَم خاصہ کو بیان فرمایا یعنی ان نعمتوں کا ذکر کیا جن کا خاص بنی اسرائیل سے تعلق ہے اور دور تک سلسلۂ کلام چلا گیا چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ کس طرح اور کیسے تم اللہ جل شانہٗ کے ساتھ کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے۔ پس اس نے تمکو حیات اور زندگی عطا کی اور پھر تم کو موت دیگا اور پھر قیامت کے وقت تمکو دوبارہ زندہ کرے گا پھر تم سب حساب و کتاب کے لیے اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے تاکہ دنیاوی زندگی میں تم نے جو کچھ کیا ہے تمکو اس کی جزا اور سزا ملے۔ پہلی آیت (وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ۔) میں وجود صانع کو ثابت کیا کہ خدا وہ ہے جس نے تمکو عدم سے نکال کر وجود عطا کیا اور نیست سے ہست کیا اور دوسری آیت (ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ) میں حشر و نشر کو ثابت کیا اور ساتھ ساتھ دلیل عقلی بھی بیان کی کہ جو ذات پاک پہلی مرتبہ تمکو موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے وہ دوسری مرتبہ بھی زندہ کرنے پر قادر ہے اور یہ امر بدیہی اور مسلم ہے کہ موت سے کسی کو چارہ نہیں۔ مرنا سب کو ضرور ہے تو سمجھ لو کہ مر کر خدا ہی کے پاس جانا ہے پس ان تمام باتوں کے جاننے کے بعد تم خدا کا کیسے انکار کرتے ہو۔

الحاصل۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ۔ میں وجودِ صانع کی دلیل بیان فرمائی کہ تم کو خدا کا انکار نہ کرنا چاہیے کیونکہ تم پہلے مردہ اور معدوم تھے اللہ تعالےٰ نے تمکو وجود عطا کیا۔ اور جو خود بخود موجود ہوا اور دوسروں کو وجود عطا کرے وہی خدا ہے اور ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ سے حیات ثانیہ کی حجت اور دلیل کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس قادر مطلق نے پہلی مرتبہ تمکو چھوٹے چھوٹے ذروں اور حقیر و ذلیل نطفوں اور خون کے لوتھڑوں اور خون کے ٹکڑوں سے پیدا کیا اور احسن تقویم کا خلعت تمکو پہنایا گیا اس کی نسبت تمہارا یہ گمان باطل ہے کہ وہ دوبارہ بکھرے ہوئے ذرات کو جمع کر کے تم کو حیات عطا نہیں کر سکتا۔ تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ تمہیں خدا کی قدرت کے انکار سے شرم نہیں آتی۔



هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر

اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ

چڑھ گیا آسمان کو تو ٹھیک کیا انکو سات آسمان اور وہ

بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

ہر چیز سے واقف ہے

ع ۳

ذکر تخلیق سامان حیاتِ جسمانی

قال تعالیٰ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ.... الی.... وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔

حق تعالیٰ نے نعمت حیات کا ذکر فرمایا۔ اب ان آیات میں سامان حیات کا ذکر فرماتے ہیں جس پر حیات اور زندگی کا بقاء موقوف ہے۔ اوّل حیات جسمانی کے سامان کا ذکر فرمایا یعنی تمہاری اس ظاہری اور جسمانی حیات کے بقاء کے لیے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور پھر زمین سے مطعومات و مشروبات اور لذائذ و طیبات اور قسم قسم کے ملبوسات تمہارے لیے پیدا کیے۔ اسکے بعد حیات رُوحانی کے سامان کا ذکر فرمایا یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور منصب خلافت پر سرفراز فرمایا اور ہدایت کے علوم عطاء فرمائے۔ اور انبیاء و مرسلین کا سلسلہ جاری فرمایا۔ انبیاء و مرسلین اللہ کی طرف سے جو ہدایت اور رُشد کے علوم اور معارف لیکر آتے ہیں وہی لوگوں کی روحانی حیات کا سامان ہوتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ۔	اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا جبکہ وہ تم کو ایسی شئ کی طرف بلائے کہ جو تم کو روحانی اور معنوی حیات اور زندگی عطا کرے۔

چنانچہ فرماتے ہیں۔ وہی ایک پاک ذات ہے کہ جس نے پیدا کیا تمہارے منافع اور فوائد کے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب حتیٰ کہ سمیات اور نجاسات بھی نفع سے خالی نہیں، جاننا چاہیئے کہ کسی چیز سے انتفاع یعنی نفع حاصل کرنا اور چیز ہے اور کھانا اور چیز ہے۔ انتفاع کی اجازت اور اباحت سے کھانے کی اجازت اور اباحت لازم نہیں۔ پھر وہ رب العزت متوجہ ہوا۔ آسمانوں کی تخلیق و تکوین کی طرف پھر ٹھیک انکو سات آسمان بنائے کہ کہیں ان میں سوراخ اور شگاف اور ٹیڑھا پن نہیں اور وہ پروردگار ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے کہ کیوں اور کس کے لیے پیدا کیا۔ امام جلیل و کبیر حافظ

عماد الدین ابن کثیر قدس اللہ روحہٗ و نوّر ضریحہٗ فرماتے ہیں کہ اس آیت اور حٰم سجدہؔ کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول زمین پیدا کی گئی۔ اور پھر آسمان پیدا کیے گئے۔ اور تعمیر کا طریقہ بھی یہی ہے کہ نیچے سے بنا نا شروع کرتے ہیں جب تحتانی حصہ مکمل ہو جاتا ہے تب چھت ڈالتے ہیں اور علماء کا اس بارے میں کوئی نزاع اور اختلاف نہیں۔ یعنی سب علماء کی یہی رائے ہے۔ صرف قتادہ سے ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ قتادہ کا گمان یہ ہے کہ آسمان پہلے پیدا کیے گئے جیسا کہ بظاہر سورۂ والنازعات کی اس آیت سے متبادر ہوتا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا۔

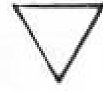
کیا تم بنانے میں مشکل ہو یا آسمان۔ اسے آسمان بنایا اور اس کی بلندی کو بہت اونچا کیا پھر اس کو صاف کیا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور پھر اس میں سے کھول کر دھوپ نکالی اور اس کے بعد زمین کو بچھایا اور اس سے اسکا پانی اور چارا نکالا۔

اس آیت میں آسمان کی پیدائش کو زمین کی پیدائش سے پہلے ذکر فرمایا ہے جو بظاہر سورۂ بقرہ اور حٰم سجدہ کی آیات سے متعارض معلوم ہوتا ہے صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس تعارض کے متعلق دریافت کیا گیا تو یہ جواب ارشاد فرمایا کہ اول زمین پیدا کی گئی۔ اور پھر آسمان (جیسا کہ سورۂ بقرہ اور حٰم سجدہ کی آیات سے ظاہر ہے) اور آسمان بنانے کے بعد زمین کو پھیلایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کا محض مادّہ تو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا۔ مگر زمین حالت موجودہ پر آسمان بنانے کے بعد پھیلائی گئی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین اسی حالت موجودہ پر آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور پھر آسمان بنائے گئے تاکہ ان کے ذریعہ سے زمین پر بارش ہو اور پھر اس بارش سے وہ اثمار و اشجار اور فواکہ و طیبات زمین سے نمودار ہوں جن کا مادہ قدرت ازلیہ نے زمین میں ودیعت رکھا ہے۔ پس زمین کو آسمان کے بعد بچھانے کا یہ مطلب ہے کہ آسمان بنانے کے بعد زمین سے فواکہ اور ثمرات اور قسم قسم کے لذائذ و طیبات کو اگایا۔ خود قرآن نے زمین کو آسمان کے بعد بچھانے کی یہی تفسیر کی ہے کما قال تعالیٰ۔

ؔ سورۂ حٰم سجدہ کی وہ آیت جس سے زمین کا پہلے پیدا ہونا معلوم ہوتا ہے یہ ہے۔ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ۔ الایہ-۱۲

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۔ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۔ اور زمین کو آسمان کے بعد بچھایا یعنی اس میں سے اسکا پانی اور چارا نکالا۔

اور اسی جواب کو علماء سلف اور خلف نے اختیار کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمین کے بچھانے سے ان اشجار و نباتات کا اگانا مراد ہے جو زمین میں بالقوہ موجود ہیں۔ اسی معنی کر زمین کا بچھانا آسمان بنانے کے بعد ہوا۔ باقی زمین بحالت موجودہ آسمان سے پہلے پیدا کی گئی۔



وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ

بولے کیا تو رکھے گا اس میں جو شخص فساد کرے وہاں اور کرے خون اور

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ

ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو کہا مجھ کو

اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اور سکھلائے آدم کو نام سارے

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ بِاَسْمَآءِ

پھر وہ دکھائے فرشتوں کو کہا بتاؤ مجھ کو نام

هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ

ان کے اگر ہو تم سچے بولے تو سب سے نرالا ہے ہمکو معلوم

لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ

نہیں مگر جتنا تونے سکھایا تو ہی ہے اصل دانا پختہ کار کہا

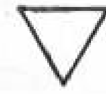
يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ
اے آدم بتا دے ان کو نام ان کے پھر جب اس نے بتا دیئے نام ان کے
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ
کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو مجھ کو معلوم ہیں پردے آسمان اور
الْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾
زمین کے اور معلوم ہے جو تم ظاہر کرو اور جو تم چھپاتے ہو
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ
اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ کر پڑے مگر
اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَ
ابلیس نے قبول نہ رکھا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں میں کا اور
قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا
کہا ہم نے اے آدم بس تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں
رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ
سے محظوظ ہو کر جس جگہ چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے
فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا
پھر تم بے انصاف ہو گئے پھر ڈگایا ان کو شیطان نے اس سے
فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ
پھر نکالا ان کو وہاں سے جس آرام میں تھے اور کہا ہم نے تم سب اترو تم سب
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ
ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تم کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور کام چلانا

إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ

ایک وقت تک پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں پھر متوجہ ہوا

عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾

اس پر بر حق وہی ہے معاف کرنیوالا مہربان



ذکرِ تخلیق سامانِ حیاتِ روحانی و اعطاءِ خلافت ربانی

قال تعالیٰ وَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ... الی... إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ہ

گزشتہ آیات میں زمین و آسمان اور دیگر مخلوقات کی پیدائش کو بیان فرمایا کہ ہم نے ان تمام مخلوقات کو تمہارے نفع کے لیے پیدا کیا ہے۔ آئندہ آیات میں ان مخلوقات سے منتفع ہونے والی مخلوق یعنی انسان کا ذکر فرماتے ہیں۔ انسان سے پہلے دو قسم کی مخلوق موجود تھی۔ ایک فرشتے دوسرے جن اور یہ دونوں قسمیں علوی اور سفلی۔ ارضی اور سماوی اشیاء سے متمتع اور منتفع نہیں ہوسکتیں۔ فرشتوں کا نہ منتفع ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ فرشتوں کو نہ زن اور فرزند کی ضرورت اور نہ طعام و شراب اور نہ طعام و شراب کے لوازم یعنی شہوت اور غضب کی انکو حاجت۔

جنات اگرچہ بعض چیزوں سے متمتع اور منتفع ہوتے ہیں۔ مگر لطافت بدنی اور غلبۂ ناریت کی وجہ سے بہت سے سامان حفاظت سے مستغنی ہیں۔ نہ انکو کسی مکان اور عمارت کی ضرورت اور نہ کسی قلعہ اور برج کی حاجت ہے اور نہ وہ اپنی حفاظت میں تیر و تلوار اور کسی قسم کے ہتھیار کے محتاج ہیں۔ پس اگر وہ عالم کی بعض اشیاء سے منتفع بھی ہیں تو وہ انتفاع ناتمام اور ناقص ہے۔ علاوہ ازیں جنات کی قوت خیالیہ انکی قوت عقلیہ پر اس درجہ غالب ہے کہ جس چیز کا وہ خیال کر لیتے ہیں۔ اس کو واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کا انتفاع حقیقی اور واقعی نہیں بلکہ خیالی ہے۔ بخلاف انسان کے کہ وہ ان تمام چیزوں سے حقیقۃً اور علی وجہ الکمال منتفع ہو سکتا ہے اس لیے منصب خلافت کے لیے انسان ہی کو خاص کیا گیا۔ جسمانی حیثیت سے تمام عناصر اربعہ اور عالم سفلی کی تمام اشیاء سے نفع اٹھا سکتا ہے اور روحانی حیثیت سے عالم علوی کی تمام چیزوں سے متمتع اور متخلق باخلاق الٰہیہ اور متصف بصفاتِ ربانیہ ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس وقت کو یاد دلائیے جب تیرے پروردگار نے حضرت آدم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے انکی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں سے یہ فرمایا إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ تحقیق میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ اور نائب بنانے والا ہوں جو میرا نائب ہو کر زمین پر حکومت کریگا اور زمین والوں پر میرے حکموں کو جاری اور نافذ کرے گا اور وہ خلیفہ عناصر اربعہ سے مرکب ہونے کی وجہ سے زمین کا انتظام کریگا۔ اور منافع ارضیہ سے متنفع ہو گا۔ اور اس میں ایک روح آسمانی پھونکوں گا جس کی وجہ سے وہ آسمان والوں پر حکم چلائے گا۔ ؎

گدائے مصطبہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم ۔۔۔ میکدہ

حضرت آدمؑ کی خلافت کا تذکرہ ملائکہ سے اس لیے فرمایا کہ کائنات ارضی اور سماوی کے منافع فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ آسمان سے پانی کا برسانا۔ زمین سے اشجار و نباتات کا اگانا۔ گرم اور سرد ہواؤں کا چلانا وغیر ذلک۔ من جانب اللہ ان تمام چیزوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے۔ اور یہ تمام امور فرشتوں ہی کی محافظت اور نگرانی میں ہیں۔ پس جب تک فرشتے اللہ کے خلیفہ کی اطاعت نہ کریں اس وقت تک خلافت کا کام سرانجام نہیں پا سکتا۔ اسی لیے حق تعالٰی شانہٗ نے اوّل فرشتوں کے سامنے حضرت آدم کا علمی فضل و کمال ظاہر فرمایا اور پھر انکو سجدہ کا حکم دیا۔

سلاطین عالم جب کسی کو منصب وزارت پر سرفراز کرتے ہیں تو حکومت کی تمام فوجیں اس کی ماتحتی میں دیدی جاتی ہیں اور وہ آکر سلامی دیتی ہیں۔ اسی طرح حق جل شانہٗ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو منصب خلافت پر سرفراز فرمایا تو اپنے تمام جنود و عساکر (یعنی ملائکہ) سے حضرت آدم علیہ السلام کو اطاعت اور فرمانبرداری کا سجدہ کرا دیا۔ تاکہ خلافت کے کام میں کسی قسم کا کوئی خلل نہ پیش آئے اور چونکہ یہ تمام عالم بمنزلہ ایک شہر کے ہے اور فرشتے اسکے عامل اور کارکن ہیں اس لیے خلافت کا تذکرہ فرشتوں ہی سے فرمایا۔ کسی اور مخلوق سے ذکر نہیں فرمایا اس لیے کہ اور سب فرشتوں ہی کے ماتحت ہیں۔

حقیقت ملائکہ

اہل اسلام کے نزدیک ملائکہ اللہ کے محترم اور مکرم بندے ہیں جو نور[1] سے پیدا کیے گئے ہیں۔ معاصی سے معصوم۔ خطا اور نسیان سے محفوظ ہیں۔ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ کھانے اور[2] پینے سے پاک۔ تذکیر و تانیث سے منزہ اور مبرا ہیں۔ قرآن میں ملائکہ کے حق میں ضمیر مذکر کا استعمال محض تشریف و تکریم کی وجہ سے ہے مذکر ہونے کی وجہ سے نہیں جیسے حق جل وعلا کے لیے ضمیر مذکر کا استعمال محض عظمت و اجلال کی وجہ سے ہے جس طرح بعض انسانوں کو حق تعالٰی نے اپنی رسالت اور پیمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے۔

---

[1] اشارة الی ما اخرجه مسلم عن عائشة مرفوعا خلقت الملائكة من نور ۱۲ فتح الباری ص۲۱۶ ج۶

[2] قال الحافظ و فی قصة الملائكة مع ابراهيم وسارة ما يؤيد انهم لا ياكلون ۱۲ فتح الباری ص۲۱۶ ج۶

اسی طرح بعض ملائکہ کو رسالت پیمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے کما قال تعالیٰ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔

فرشتوں نے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً سے یہ سمجھا کہ جب وہ خلیفہ زمین سے پیدا ہوگا تو اس میں لذات سفلیہ سے منتفع ہونے کی خواہش اس کی جبلت میں مرکوز ہوگی جب ان لذتوں کی اسکو ضرورت ہوگی تو قوت شہویہ جوش میں آئے گی اور جو شخص ان لذات اور منافع میں اسکی مزاحمت کرے گا تو قوت غضبیہ جوش میں آئے گی۔ اور مدافعت کے لیے جنگ و جدال اور قتل و قتال کی نوبت آئے گی۔ اس لیے فرشتوں کو یہ شبہ ہوا کہ زمین کی عمارت اور اصلاح کے لیے ایسے شخص کو خلیفہ بنانا بظاہر خلاف حکمت معلوم ہوتا ہے۔ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ۔ فرشتوں نے کسی اعتراض کے طور پر نہیں بلکہ محض حکمت دریافت کرنے کے لیے بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کیا کہ زمین میں آپ اس شخص کو خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے۔ حالانکہ ہم سب ہر لمحہ تیری ذات پاک کی ستائش کے ساتھ مسلسل تسبیح کرتے ہیں تاکہ حق تیری ذات اور صفات کا ادا ہو اور نیز ہم خاص تیرے لیے تقدیس کرتے ہیں۔ یعنی ہم تیرے افعال کو اس بات سے پاک جانتے ہیں۔ کہ تیرا کوئی فعل معاذ اللہ خلاف حکمت ہو یا معاذ اللہ اس میں سفہ اور عبث کا شائبہ ہو۔ بخلاف بنی آدم کے کہ اگر وہ تیری تسبیح و تقدیس بھی کریں گے تو بسا اوقات ریا اور حرص و ہوا کی آمیزش اور شرکت سے پاک نہ ہوں گی۔ رہا یہ سوال کہ ملائکہ کو بنی آدم کا مفسد اور خوں ریز ہونا کیسے معلوم ہوا۔ سو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر حضرات صحابہ سے مروی ہے کہ جب اللہ نے یہ فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً تو فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ وہ خلیفہ کیسا ہوگا۔ تو اللہ رب العزت نے یہ فرمایا کہ اس خلیفہ کے ذریت ہوگی اور زمین میں فساد کرے گی۔ اور ایک دوسرے پر حسد کرے گی۔ اور ایک دوسرے کو قتل کرے گی (تفسیر ابن کثیر) اس پر ملائکہ نے یہ سوال کیا۔ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا۔ الخ اور ملائکہ کا یہ سوال محض حکمت دریافت کرنے کے لیے تھا کہ فساد اور خون ریزی کرنے والوں کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ حاشا بطور اعتراض نہ تھا۔ اس لیے کہ ملائکہ کی تو یہ شان ہے کما قال تعالیٰ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ۔ یعنی بغیر اذن الٰہی کے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے و قال تعالیٰ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ خدا کے محترم بندے ہیں۔ مقصد فقط یہ تھا کہ اس قسم کی مخلوق پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ اگر عبادت اور بندگی مقصود ہے تو ہم اس کے لیے حاضر ہیں۔ ہر وقت تیری اطاعت اور بندگی میں سرشار ہیں اور تیری معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور بری ہیں۔ اس لیے حق جل شانہ نے جواب ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ تحقیق میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے یعنی تمکو معلوم نہیں کہ منصب خلافت کے لیے ایسی ہی حقیقت جامعہ مناسب ہے جو جسمانیت اور روحانیت دونوں کی جامع

ہوا اور قوت عقلیہ کے ساتھ اس میں قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو۔ جس نوع کا مزاج ان مختلف قوی سے مرکب ہوگا وہی عالم کے انتظام اور تدبیر و تصرف پر قادر ہوگا۔ کائنات ارضیہ کے حقائق اور منافع کو بخوبی سمجھے گا اور طرح طرح کی صنعتیں ایجاد کریگا۔ تاکہ منافع ارضیہ قوت سے نکل کر فعلیت میں آجائیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں میں یہ استعداد اور صلاحیت نہیں۔

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

جاننا چاہیئے کہ ہر انسان میں دو قوتیں ہیں ایک تو قوت شہویہ۔ جس سے زنا وغیرہ صادر ہوتا ہے جس کو فرشتوں نے مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا سے تعبیر کیا ہے۔ اور دوسری قوت غضبیہ جس سے قتل اور ضرب اور خونریزی ظہور میں آتی ہے۔ جسکو ملائکہ نے وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ سے تعبیر کیا ہے۔ فرشتوں نے انسان کے یہ دو عیب ذکر کر کے اشارۃً ان دونوں عیبوں کی اپنے سے نفی کی اس لیے کہ مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کے مقابلہ میں وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ کہا اور يَسْفِكُ الدِّمَاءَ کے مقابلہ میں وَنُقَدِّسُ لَكَ کہا۔ اس میں شک نہیں کہ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ بہت سے مفاسد کا سرچشمہ ہیں لیکن ان دو قوتوں میں منافع اور مصالح اور فوائد بھی نہایت عجیب و غریب ہیں۔ ملائکہ نے قوت شہویہ اور غضبیہ کے مفاسد کا تو ذکر کیا لیکن ان دونوں قوتوں کے منافع اور فوائد سے ان کو ذہول ہوا۔ فرشتوں کا خیال اس طرف نہ گیا کہ یہی قوت شہویہ جب اسکا رخ خداوند ذوالجلال کی طرف پھر دیا جاتا ہے تو اس سے وہ ثمرات و نتائج ظہور میں آتے ہیں کہ انکو دیکھ کر فرشتے بھی عشعش کرنے لگتے ہیں یعنی غلبۂ عشق خداوندی اور اس کی محبت کا جوش اور ولولہ خدا کی محبت اور اسکے عشق میں قلب کا بیچین اور بیتاب رہنا یہ وہ نعمت ہے کہ جس پر ملائک بھی رشک کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ملائک میں قوت شہویہ نہ ہونے کی وجہ سے عشق کا مادہ نہیں اطاعت میں اگر فرشتوں کا پلہ بھاری ہے تو عشق اور محبت میں آدم اور بنی آدم کا پلہ بھاری ہے اور علیٰ ہذا جب قوت غضبیہ کو کارخانۂ خداوندی میں صرف کیا جاتا ہے تو اس سے بھی عجیب و غریب نتائج و ثمرات ظاہر ہوتے ہیں یعنی خدا کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی اور اسکے دشمنوں سے جہاد و قتال۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ بدریین کی طرح وہ ملائکہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ان ملائکہ سے افضل ہیں جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے جیسا کہ بخاری میں مذکور ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانا یہ ایسی عظیم نعمت ہے کہ ملائکہ اس سے بالکلیہ محروم ہیں۔ نیز جب تک قوت عقلیہ کے ساتھ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ نہ ہو تو تنہا قوت عقلیہ تجارت وزراعت اور صنعت و حرفت اور تمدن و معاشرت کے اصول اور قوانین مرتب نہیں کر سکتی جن پر تمام کارخانۂ عالم کا دارومدار ہے۔ لہذا خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہوا کہ قوت عقلیہ کے ساتھ قوت غضبیہ اور قوت شہویہ کا بھی حامل ہو۔ نیز اگر جہاں میں

برائیاں اور قباحتیں موجود نہ ہوں تو بعثت رسل اور انزال کتب و شرائع و احکام و اوامر و نواہی سب معطل و بیکار ہو جائیں۔ ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است — دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

شیخ اکبر قدس اللہ سرہٗ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں کہ ملائکہ نے علی الاطلاق تسبیح و تقدیس کا دعویٰ کیا حالانکہ انکی تسبیح و تقدیس فقط ان اسماء و صفات کے ساتھ مقید اور مخصوص ہے جن اسماء و صفات کا انکو علم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ قَالُوا سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ سے معلوم ہوتا ہے مگر ملائکہ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے ایسے اسماء بھی ہیں کہ وہاں تک ملائکہ کے علم کی رسائی نہیں اور اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان اسماء و صفات کا علم عطاء فرمایا خصوصًا وہ اسماء و صفات جنکا تعلق نعمت اور عذاب، موت اور ہلاک، صحت اور مرض سے ہے جیسے رزاق اور مطعم اور مصور محی اور ممیت، ملائکہ ایسے اسماء و صفات کے ساتھ حق سبحانہ و تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس نہیں کرتے جنکا تعلق عالم اجسام سے ہے اس لیے ملائکہ کی تسبیح و تقدیس بنی آدم کی تسبیح کے لحاظ سے مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ انتہی کلامہٗ۔ علاوہ ازیں بنی آدم کی تسبیح و تقدیس، شیطان اور نفس، قوۂ شہویہ اور قوۂ غضبیہ کے معارضہ اور مقابلہ کی وجہ سے زیادہ اکمل اور بہتر ہے، بخلاف ملائکہ کے کہ ان کی تسبیح و تقدیس بمنزلہ سانس کے اضطراری ہے اور اختیاری تسبیح و تحمید اضطراری تسبیح و تحمید سے بہتر ہے۔

جواب تفصیلی بعد جواب اجمالی

گزشتہ آیات اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ میں فرشتوں کے شبہ کا اجمالی جواب تھا۔ اب آئندہ تفصیلی جواب ارشاد فرماتے ہیں جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور زیادتی بیان فرمائی تاکہ فرشتوں پر انکی فوقیت اور افضلیت ثابت ہو اور یہ ظاہر ہو جائے کہ جو شخص علوی اور سفلی کائنات کے اسماء و صفات سے واقف ہو وہی مستحق خلافت ہے یا یوں کہو کہ پہلا جواب حاکمانہ تھا اور یہ جواب حکیمانہ ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا الخ اور سکھائے اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام مع اُن کے خواص اور آثار کے اس لیے کہ جب تک کہ عالم کی تمام چیزوں کے نام اور ان کی حقیقت اور اوصاف اور خواص اور آثار اور طریقۂ استعمال معلوم نہ ہو تو انکا انتظام اور ان میں تصرف کیسے کر سکتا ہے۔ محض نام جاننے سے نہ تو حضرت آدمؑ کی فوقیت ثابت ہوگی اور نہ محض نام جاننے سے انتظام ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعًا روایت ہے کہ قیامت کے روز اوّل اہل ایمان شفاعت کے لیے حضرت آدم کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ اور یہ کہیں گے۔

انت ابو الناس ـــ خلقك — آپ سب انسانوں کے باپ ہیں اللہ نے

اللہ بیدہٖ واسجد لک ملائکتہٗ وعلمک اسماء کل شیئٍ۔ اپنے ہاتھ سے آپ کو پیدا کیا اور فرشتوں سے آپکو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے نام آپکو سکھائے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتوں کو بھی بعض چیزوں کے نام کا علم تھا مگر ان کا علم انہیں چیزوں میں منحصر تھا جن کی خدمت پر وہ مامور تھے دوسری چیزوں سے ان کو کوئی تعلق اور سروکار نہ تھا۔ خلافت کے لیے علم تام اور عام چاہیئے۔ بخلاف حضرت آدمؑ کے کہ اللہ تعالٰی نے انکو علم تام اور عام عطا فرمایا۔ مفردات اور مرکبات کے اسماء اور خواص اور آثار بتلائے صنعتوں اور حرفتوں کا علم عطا فرمایا۔ حفظان صحت اور معالجۂ امراض کے اصول و قواعد بتلائے۔ اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کو ان چیزوں کا علم نہیں دیا گیا۔ لہٰذا وہ خلافت کا کام کیسے انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے اور اسی آیت میں وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کے بعد جو لفظ کُلَّھَا بڑھایا گیا وہ اسی عموم کی تاکید ہے کیونکہ آدم اور فرشتوں میں یہی ما بہ الامتیاز ہے کہ فرشتوں کو تمام اسماء کا علم نہیں اور حضرت آدم کو اسماء کی تعلیم بذریعہ الہام کے تھی کہ ان کے دل میں ڈال دیا کہ فلاں چیز کا فلانا نام ہے اور فلانی چیز کا فلانا نام ہے۔ اور اس تعلیم میں کلمہ اور کلام اور صوت اور حرف درمیان میں نہ تھی بلاواسطہ حرف اور صوت کے اور بغیر کلمہ اور کلام ان کے دل میں ڈالا اور یہ تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی بلکہ بطریق القار فی القلب تھی جیسے وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ۔ میں تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی۔ بلکہ القار فی القلب کے ذریعہ سے تھی کہ ان کے دل میں زرہ بنانے کا طریقہ ڈالدیا۔ پھر جن چیزوں کے نام اللہ تعالٰی نے حضرت آدمؑ کو سکھائے ان چیزوں کی تصویروں کو فرشتوں پر پیش کیا پھر فرمایا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام ٹھیک ٹھیک بتاؤ اگر تم اس بارہ میں سچے ہو۔ کہ تم میں خلافت کی صلاحیت ہے اور تم خلافت کی خدمت انجام دے سکتے ہو۔ اس لیے کہ جب تک کہ حقائق اشیاء اور ان کی صفات اور خواص اور آثار اور طریقہ استعمال کا علم نہ ہو اس وقت تک ان میں تصرف اور ان کا انتظام ناممکن ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا تو پاک اور منزہ ہے ہم کو کسی شیئ کا بھی علم نہیں مگر فقط اُس چیز کا جس کا تو نے ہم کو جتنا علم عطا کر دیا بے شک حقیقت میں تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے تو اس سے منزہ ہے کہ تیرا کوئی کام عبث اور خلاف حکمت ہو ہمارا علم ہماری استعداد کے مطابق ہے اور آدم کا علم انکی استعداد کے مطابق ہے اور استعدادوں اور صلاحیتوں کا تفاوت اور اختلاف تیرے علم اور حکمت پر مبنی ہے آپ مالک مطلق ہیں جس میں جو استعداد چاہیں وہ پیدا کردیں فرشتوں پر جب یہ بات واضح ہوگئی کہ آدم علیہ السلام خلافت کی استعداد اور صلاحیت میں ہم سے بہتر اور برتر ہیں تو بصد عجز و زاری بارگاہ خداوندی میں یہ بولے۔ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔

فائدہ جاننا چاہیئے کہ عرضہم کی ضمیر اسماء کی طرف باعتبار مسمّیات کے راجع ہے ظاہر کا مقتضی

یہ تھا کہ ضمیر مؤنث کی لاتے اور یوں کہتے ثُمَّ عَرَضَهَا جیسا کہ ایک قرارت میں ثُمَّ عَرَضَهُنَّ ضمیر مؤنث کے ساتھ آیا ہے لیکن بجائے ضمیر مؤنث کے ذوی العقول کی ضمیر لائے یعنی هُمْ کی ضمیر لائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ عرض باعتبار وجود خارجی اور جسامت ظاہری کے نہ تھا بلکہ باعتبار وجود روحی اور ملکوتی یا بطور وجود مثالی کے تھا اور اس وجود کے اعتبار سے تمام مخلوقات عاقل اور مدرک ہیں اور تذکیر و تانیث سے مبرا ہیں حق جل شانہٗ نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں کو ان تمام چیزوں کے نام مع خواص اور آثار کے بتلا دو کیونکہ اے آدم ہم نے تمکو ادیم ارض (یعنی روئے زمین) کی تمام اقسام کے مٹیوں سے ملا کر اور مختلف قسم کے پانیوں میں گوندھ کر بنایا ہے اور پھر برابر بنا کر تم میں روح پھونکی ہے جو جنس ملائک سے ہے اس لئے تم میں یہ استعداد اور صلاحیت ہے کہ تم ان چیزوں کے نام اور خواص اور آثار بتلا سکو اس لیے کہ ساری استعدادیں اور صلاحیتیں تم میں جمع ہیں جسمانی حیثیت سے تم زمینی ہو اور روحانی حیثیت سے تم علوی ہو اس لیے تم علوی اور سفلی چیزوں کو جس قدر سمجھ سکتے ہو دوسرا ویسا نہیں سمجھ سکتا۔ غرض یہ کہ تمہارے خمیر میں زمینی اور آسمانی دونوں قسم کی استعدادیں اور صلاحیتیں علی وجہ الکمال موجود ہیں۔ پس ان چیزوں کے نام مع خواص اور آثار کے فرشتوں کے سامنے بیان کرو تاکہ تمہارا فضل و کمال ظاہر ہو اور تمہاری فطرت میں جو عجیب و غریب استعدادیں اور صلاحیتیں ہم نے ودیعت کر رکھی ہیں وہ بروئے کار آجائیں اور فرشتوں پر یہ امر منکشف ہو جائے کہ یہ استعداد بشر کے ساتھ مخصوص ہے ملائکہ کو میسر نہیں پس جب بتائے آدم نے ان تمام چیزوں کے نام جو بے شمار اور بے انتہا تھیں۔ اور اس بیان میں کوئی غلطی بھی نہیں کی تو فرشتے حضرت آدم کے اس کمال علمی کو دیکھ کر حیران رہ گئے تو اس وقت اللہ جل جلالہٗ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے پہلے ہی کہا نہ تھا کہ میں تمام آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو خوب جانتا ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اسکو بھی خوب جانتا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ خلافت کے لیے ایسے حاوی اور کلی علم کی ضرورت ہے بغیر ایسے علم کے خلافت ناممکن ہے۔ فرشتوں کا علم حاوی اور کلی نہیں، جس خدمت پر وہ مامور ہیں فقط اسی کے قواعد اور ضوابط ان کو معلوم ہیں کسی دوسری خدمت اور نظام کا ان کو علم نہیں۔ اور علی ہذا ملائکہ کی قدرت و مشیت ان کے اختیار اور مرضی کے تابع نہیں بلکہ حق جل شانہ کی مرضی کے تابع ہے بخلاف انسان کے کہ اس کی قدرت و مشیت خود اسکی مرضی کے تابع ہے انسان ہی کا علم اور قدرت حق تعالیٰ شانہٗ کے علم اور قدرت کا نمونہ ہے جو ضدین اور نقیضین سے متعلق ہو سکتا ہے۔ نیز بہت سی چیزوں کا علم محض عقل سے نہیں ہو سکتا جب

ؒ اور اسی وجہ سے کہ حضرت آدم کو تمام روئے زمین کی مٹیوں سے بنایا گیا ہے انکی اولاد میں کوئی سرخ رنگ ہے اور کوئی گورا اور کوئی بین بین اور کوئی نرم خو اور کوئی ترش رو اور کوئی نیک طینت اور کوئی بد طینت جیسا کہ مسند احمد اور ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں آیا ہے ۱۲

تک قوت شہویہ اور غضبیہ عقل کی معین اور مددگار نہ ہو اس لیئے ایسی چیزوں کا نام وہی بتلا سکتا ہے جس میں قوت عقلیہ اور ادراکیہ کے علاوہ قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو اور علی ہذا جنات کا علم بھی ناقص ہے اور علاوہ ناقص ہونے کے غلبہ ناریت اور قوت خیالیہ کے غلبہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے اس لیے یہ خدمت انکے سپرد نہیں کی جاسکتی۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا الخ تو حق تعالےٰ شانہٗ نے دو جواب ارشاد فرمائے ایک حاکمانہ اور ایک حکیمانہ۔ حاکمانہ جواب تو یہ فرمایا کہ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ "رموز مملکت خویش خسرواں دانند" اور حکیمانہ جواب یہ ارشاد فرمایا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کہ آدم علیہ السلام کو اشیاء کے تمام اوصاف اور خواص اور اسماء کی تعلیم دی تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں۔ اس سے حضرت آدم کا بمقابلہ ملائک فضل و کمال ظاہر ہوا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں یہاں ایک شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو شریک امتحان کریں اور ایک کو خلوت میں جواب سکھلا دیں اور پھر امتحان لیں۔ **جواب** یہ ہے کہ یہ کہیں ثابت نہیں کہ خدا تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلا دیئے تھے اور جب یہ ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے بھی بتلایا ہو اور یہی احتمال خدا تعالےٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہوسکتی ہے بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہے کہ استاد نے اقلیدس کی کسی شکل کی دونوں طلبہ کے سامنے تقریر کی مگر امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت کے بتلا سکا اور دوسرا نہ بتلا سکا۔ کیونکہ علم کے لیے استعداد کی ضرورت ہے اور یہ استعداد حضرت آدم علیہ السلام ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت جبرئیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی اس لیے نہ بتلا سکے کہ ان میں اس کی استعداد نہ تھی۔ حق تعالےٰ شانہٗ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی رہا یہ شبہ کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھے ہونگے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہوگئی مگر یہ اعتراض لغو ہے کیونکہ بتلانے کیلئے مخاطب کا سمجھنا لازمی نہیں۔ اس لیے اَنۡۢبِئۡ فرمایا۔ عَلِّمۡ نہیں فرمایا۔ تعلیم کے معنیٰ سمجھا دینے کے ہیں اور اَنۡۢبَاء کے معنیٰ اخبار یعنی تقریر کردینے کے ہیں گو مخاطب نہ سمجھا ہو اور یہ استعداد خاصہ بشر کا ہے۔ اگر فرشتوں کو یہ استعداد عطا کردی جائے تو فرشتے فرشتے نہ رہیں جیسے حس و حرکت خاصہ حیوان کا ہے اگر جماد میں یہ صفت پیدا فرما دیں تو جماد۔ جماد نہ رہے گا بلکہ حیوان بن

جائیگا۔ لہذا اس سوال کا حاصل یہ ہو گا کہ فرشتوں کو بشر کیوں نہ بنا دیا سو ظاہر ہے کہ یہ سوال بے معنی ہے جواب اسکا ظاہر ہے کہ اس صورت میں فرشتوں کے پیدا کرنے میں جو حکمت ہے وہ معطل ہو جائے گی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اول ہی فرشتوں کو بشر بنا کر خلیفہ بنا دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انکو بشر کیوں نہیں بنایا اس کی نسبت صرف یہی کہا جائیگا۔

حدیث مطرب و می گو و راز دھر کمتر جو ∴ کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت این معمارا

(ہذا کلہ ملخص من وعظ نفی الحرج پندرھواں وعظ از سلسلۂ تبلیغ) خلاصۂ کلام یہ کہ جب حضرت آدم کی فضیلت ظاہر ہو گئی تو فرشتوں کو ان کی تعظیم کا حکم ہوا چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ اور اے بنی آدم تم خاص طور پر اس احسان کو بھی یاد کرو کہ جس وقت ہم نے تمام فرشتوں کو تمہارے باپ کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا کہ سب مل کر آدم کو سجدہ کرو تاکہ تمہارے باپ کی فضیلت اور فوقیت عملی طور پر علی الاعلان ظاہر ہو جائے بادشاہ جب کسی کو اپنا خلیفہ بناتا ہے تو ارکان دولت کو حکم دیتا ہے کہ اس کو نذریں پیش کریں اور فوج کو سلامی کا حکم دیتا ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اس خلیفہ کی فرمانبرداری کرنا ہوگی تو سب سجدہ میں گر گئے، بعض روایات میں ہے کہ سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام نے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مرتبہ عطا فرمایا کہ تمام قرآن انکی پیشانی پر لکھ دیا۔ رواہ ابن ابی حاتم و ابوالشیخ و ابن عساکر غرض یہ کہ سب فرشتے حکم الٰہی بجا لائے اور سب نے آدمؑ کو سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور اللہ کے علم میں وہ پہلے ہی سے کافروں سے تھا اگرچہ ظہور اسکے کفر کا اب ہوا اس لیے کہ حکم خداوندی کے امتثال سے انکار کرنا ایک کفر تو یہ ہوا۔ دوسرا کفر یہ کیا کہ حکم خداوندی کو خلاف حکمت اور خلاف مصلحت سمجھا۔ تیسرا کفر یہ کیا کہ اپنے تمرد اور سرکشی کو حکم خداوندی کے تعمیل سے بہتر سمجھا میں نے سنا ہے کہ اس زمانہ کے بعضے ملحد شیطان کو موحد اعظم کہتے ہیں۔ اللہ اکبر جو خبیث ذات اپنے کو خداوند ذوالجلال کا ہم پلہ اور ہم رتبہ سمجھتی ہو وہ تو مشرک اعظم ہے۔ شیطان کو موحد اعظم کہنا یہ اس شخص کے نادان اعظم اور احمق اعظم ہونے کی روشن دلیل ہے۔

ف ابلیس اصل میں جنات سے ہے مگر ابتدا میں ملائکہ کے ساتھ اختلاط رکھتا تھا۔ فساد اور خونریزی کی وجہ سے جب جنات کو زمین سے نکال کر جزائر اور جبال میں منتشر کیا گیا تو ابلیس ان میں بہت بڑا عالم اور عابد تھا۔ فساد اور خونریزی سے اپنا بے لوث ہونا ظاہر کیا تو فرشتوں کی سفارش سے بچ گیا اور فرشتوں میں رہنے کی اجازت ہوئی مگر دل میں یہ طمع لگی رہی کہ کسی طرح زمین کی فرمانروائی مجھ کو مل جائے اس طمع میں خوب عبادت کرتا رہا جب حضرت آدم کی خلافت کا وقت آیا اور تمام ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوا۔ تو ابلیس اس وقت ناامید ہوا اور استکبار اور حسد نے اس کو حق جل شانہٗ

کے مقابلہ اور معارضہ پر آمادہ کیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون و مطرود و رجیم و مردود ہوا۔

ابلیس اگرچہ ملائکہ میں سے نہیں کما قال تعالیٰ کَانَ مِنَ الْجِنِّ (اور تھا ابلیس جنات میں سے) مگر خطاب سجود میں بتبعیۃ ملائکہ بالاولیٰ داخل تھا۔ بادشاہ جب سپاہیوں کو حکم دیتا ہے تو سائیس اور فراش بدرجۂ اولیٰ اس حکم کے مامور ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ شیطان کو علاوہ ملائکہ کے سجدہ کا کوئی صریحی حکم کیا گیا ہو جیسے مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ[1] سے متبادر ہے۔

فائدہ سجدہ کی دو قسمیں ہیں ایک سجدۂ عبادت یعنی کسی کو خدا اور معبود سمجھ کر سجدہ کرنا اس قسم کا سجدہ تمام ملتوں میں کفر ہے اور شرک ہے۔ اس قسم کا سجدہ کسی ملت اور شریعت میں کسی وقت میں جائز نہیں رکھا گیا۔ دوسرا سجدۂ تحیت و تکریم یعنی بطور تعظیم کسی کے سامنے سر جھکانا جیسے ابتداءِ ملاقات میں سلام کرتے ہیں۔ اسی طرح شرائع سابقہ میں بطور تسلیم یہ سجدۂ تکریم مشروع تھا۔ شریعت محمدیہ نے اب اسکو بھی ممنوع اور حرام قرار دیا ہے جیسا کہ آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے، دونوں سجدوں میں فرق اتنا ہے کہ سجدۂ عبادت تو کفر ہے اور سجدۂ تعظیم حرام ہے یا یوں کہو کہ سجدۂ عبادت شرک اعتقادی اور سجدۂ تعظیمی شرک عملی ہے تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدۂ عبادت نہ تھا اس لیے کہ سجدۂ عبادت سوائے خدا کے کسی کو کرنا کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کفر کا حکم نہیں دیتا یہ سجدۂ تعظیم وسلام تھا جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہے خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا۔

مناظرۂ عدو اللہ در بارۂ فضیلت خلیفۃ اللہ[2]

ابلیس علیہ اللعنۃ الٰی یوم القیام نے جب سجدہ سے انکار کیا تو علت یہ بیان کی۔

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔	اے خدا میں آدمؑ سے بہتر ہوں تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا

اور آگ مٹی سے بہتر ہے اس لیے میں آدم سے بہتر ہوا مگر اسکا یہ دعویٰ کہ آگ مٹی سے بہتر ہے بالکل غلط ہے بلکہ عنصر ترابی کا عنصر ناری سے بہتر ہونا متعدد وجوہ اور دلائل سے ثابت ہے۔

(۱) آگ بالطبع مفسد اور مہلک ہے، احراق اور اتلاف اسکا خاصہ ہے بخلاف تراب کے کہ وہ

[1] یعنی تجھ کو سجدہ کرنے سے کیا چیز مانع ہوئی جبکہ تجھ کو میں نے حکم دیا تھا۔ ۱۲ مدیر

[2] یہ مناظرہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بدائع الفوائد ص۱۳۹ ج ۴ میں ذکر فرمایا ہے۔

نہ مہلک ہے اور نہ محرق۔
(۲) آگ کی طبیعت ہی خفت اور حدت اور طیش سے بھری ہوئی ہے بخلاف تراب کے کہ اس میں رزانت و وقار سکون اور ثبات ہے۔
(۳) زمین ہی حیوانات کے اَرزاق و اَقوات اور انسانوں کے لباس اور زینت اور تمام سامان معیشت کا معدن اور منبع ہے، بخلاف آگ کے کہ وہ ان تمام نفع رسانیوں سے بالکل بیگانہ ہے۔
(۴) عنصر ترابی کی ہر حیوان کو ضرورت ہے کوئی حیوان زمین سے مستغنی نہیں، بخلاف عنصر ناری کے کہ وحوش و بہائم تو اس سے بالکل مستغنی ہیں، انسان بھی بعض اوقات آگ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔
(۵) زمین میں کسی شے کا اگر ایک تخم بھی ودیعت رکھ دیا جاتا ہے تو زمین ایک تخم کو اضعافاً مضاعفہ بنا کر واپس کر دیتی ہے، آگ میں جو کچھ بھی رکھا جائے جلا کر سب کو خاکستر بنا دیگی۔
(۶) حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم میں بکثرت زمین اور زمین کے منافع کا ذکر فرمایا ہے کہ زمین کو ہم نے مہاد اور فراش بساط اور قرار احیاء اور اموات کا ماویٰ اور ملجاء بنایا زندہ اس پر زندگی بسر کرتے ہیں اور مر کر اس میں دفن ہوتے ہیں اور بار بار زمین اور زمین کے عجائب میں تفکر اور تدبر کا حکم دیا۔ بخلاف آگ کے کہ اکثر و بیشتر اسکو موقع عقاب و عذاب اور مقام تخویف و ترہیب میں ذکر فرمایا۔ صرف ایک دو جگہ یہ ارشاد فرمایا ہے۔ تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ کہ یہ آگ آخرت کی آگ کی یاد دہانی اور مسافروں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔
(۷) حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار زمین کا منبع برکات اور سرچشمہ ہونا بیان فرمایا ہے کما قال تعالےٰ۔ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ۔ اس آیت میں برکت عامہ کا ذکر فرمایا۔ اور آیت وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ اور آیت وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً اور آیت وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا میں ان برکات کو ذکر فرمایا کہ جو زمین کے خاص خاص قطعوں کو حاصل ہیں۔ بہرحال زمین برکات عامہ اور برکات خاصہ دونوں کا معدن اور منبع ہے، بخلاف آگ کے کہ وہ منبع برکات تو کیا ہوتی۔ اس کے برعکس وہ تو برکات کی مٹانے والی اور فنا کرنے والی ہے۔
(۸) مساجد اور وہ بیوت کہ جن میں صبح و شام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ہر وقت اس کی عبادت اور بندگی سے معمور رہتے ہیں وہ سب زمین ہی پر واقع ہیں۔ تمام روئے زمین پر اگر سوائے اس بیت حرام کے جس کو خدا نے مبارک اور هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ اور قِيٰمًا لِّلنَّاسِ فرمایا ہے اور کچھ

بھی نہ ہوتا تو یہ زمین کے شرف اور فضیلت کے لیے کافی اور وافی تھا۔
(۹) جو چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ آگ ان کی خدمت کے لیے ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے تب آگ سلگائی جاتی ہے، ضرورت ختم ہوتے ہی آگ کو بجھا دیا جاتا ہے، آگ زمین کے لیے بمنزلہ ایک خادم کے ہے اور زمین بمنزلہ مخدوم کے ہے۔
علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نار تراب سے بہتر ہے تب بھی یہ استدلال فاسد ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے کا مادہ دوسری شئ کے مادہ سے مفضول اور کمتر ہو مگر وہ شئ بہ ہیئت موجودہ دوسری شئ سے افضل اور بہتر ہو مثلاً انبیاء و مرسلین نطفہ اور علقہ سے پیدا کیے گئے اور ملائکہ نور سے پیدا کیے گئے مگر خدائے عز وجل نے انبیاء و مرسلین کو ملائکہ مقربین پر فضیلت دی آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا اور جبرئیل اور میکائیل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر وزیر بنایا اور ابوبکر وعمر کو زمین میں آپکا وزیر اور مشیر بنایا اور اگرچہ آدم کو ہم نے زمین کی خلافت اور اسکی عمارت کے لیے پیدا کیا ہے مگر سردست ہم نے ان کو حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ تاکہ بہشت کے محلات اور باغات اور چشموں اور نہروں کو دیکھ کر دنیا میں اس کا نمونہ قائم کر سکو اور فقط سیر پر اکتفا نہ کرو بلکہ چند روز وہاں کی رہائش اختیار کرو اور فی الحال اسکو وطن سکونت بناؤ۔ تاکہ اس کی تعمیر کی کیفیت خوب ذہن نشین ہو جائے۔ اور حضرت حوا کو جنت میں رہنے کا اس لیے حکم دیا گیا کہ وہ بہشت کے محلوں کی آرائش اور انکی زیب و زینت اور وہاں کے زیورات اور حریری لباس کو خوب غور سے دیکھ لیں۔ اور سمجھ لیں تاکہ دنیا کی عورتوں کو اس طریق پر چلا سکیں اور کھاؤ تم اس بہشت سے خوب وسعت اور فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو تاکہ تمام ماکولات اور مشروبات کے خواص اور آثار، منافع اور مضار تم کو معلوم ہوں اور پھر اس علم کے مطابق دنیا کے ماکولات ومشروبات میں تصرف کر سکو اور زمین میں جو شجر اور ثمر تمہارے لیے پیدا کیے گئے ہیں ان سے نفع اٹھا سکو۔ مگر باوجود اس عام اجازت کے بطور ابتلاء اور امتحان جس میں تمہارے لیے سراسر خیر ہی خیر ہے ہم تم کو بعض چیزوں کے استعمال سے منع بھی کرتے ہیں تاکہ تم لذائذ اور مرغوبات کے خوگر نہ ہو جاؤ اور وہ یہ کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ درخت کے تعین میں علماء کے اقوال مختلف ہیں کسی آیت یا حدیث صحیح سے ثابت نہیں کہ وہ کیا درخت تھا۔ گیہوں کا تھا کہ انجیر کا۔ زیتون کا تھا یا انگور کا سلف اور خلف میں مشہور یہی ہے کہ وہ گیہوں کا درخت تھا اور اصل حقیقت خدا ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیا درخت تھا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کا علم کچھ مفید اور نافع نہیں اور اس کا جہل کچھ مضر نہیں۔ غرض یہ کہ تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

ف حضرت آدمؑ اور حواؑ کو جس جنت میں رہنے کا حکم ہوا تھا اس سے وہی جنت الخلد

مراد ہے جسکا قیامت کے بعد متقین سے وعدہ ہے جیسا کہ قرآن کریم کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے پیشتر آیت وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ۔ میں اسی جنت الخلد کا ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد حضرت آدمؑ اور حواءؑ کو یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ کا حکم ہوا اور الجنۃ کو معرف باللام ذکر فرمایا جسکا صاف مطلب یہی ہے کہ اس مقام پر الجنۃ سے معہود اور معروف جنت مراد ہے جسکا سابق میں ذکر ہو چکا ہے پھر اس کے بعد جب حضرت آدم کے ہبوط کا ذکر فرمایا اور ہبوط کے معنیٰ اوپر سے نیچے اترنے کے ہیں بعد ازاں یہ فرمایا وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کو ابتداء میں جس جگہ رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ زمین کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی۔ ورنہ اگر پہلے ہی سے زمین پر تھے تو پھر اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ تم زمین پر اترو اور وہاں جاکر ٹھہرو۔

صحیح مسلم میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور یہ عرض کریں گے۔

یا ابانا استفتح لنا الجنۃ فیقول و ھل اخرجکم من الجنۃ الا خطیئۃ ابیکم۔	اے ہمارے باپ آپؑ ہمارے لیے جنت کا دروازہ کھلوائیے تو آدم یہ جواب دیں گے کہ تمہارے باپ کی غلطی تو تم کو جنت سے باہر لائی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اسی جنت سے نکالے گئے تھے کہ جس جنت کا دروازہ مؤمنین کھلوانا چاہتے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

احتج اٰدم و موسیٰ عند ربھما فحج اٰدم موسیٰ قال موسیٰ انت اٰدم الذی خلقك اللہ بیدہٖ و نفخ فیك من روحہ وَ اسجدلك ملائکتہٗ واسکنك فی جنتہ ثم اھبطت الناس بخطیئتك	عالم ارواح میں اللہ تعالےٰ کے سامنے حضرت آدم و موسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ ہوا۔ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ تو وہی آدم ہیں جنکو اللہ تعالےٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور اپنی خاص روح تم میں پھونکی۔ اور فرشتوں سے تم کو سجدہ کرایا اور اپنی جنت میں تم کو سکونت

الارض الی آخر الحدیث | عطا فرمائی اور پھر تم ہی نے لوگوں کو اپنی خطار سے جنت سے زمین کی طرف اتارا۔

* * *

یہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ میں الجنۃ سے وہی جنت مراد ہے جو آسمان پر ہے حاشا جنت سے زمین کا کوئی باغ مراد نہیں جیسا کہ بعض کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ آدمؑ کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ دنیا ہی کے باغوں میں سے کوئی گھنا اور گنجان باغ تھا یہ بالکل غلط ہے پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیت میں جنت سے کوئی دنیاوی باغ مراد ہے جہاں حضرت آدمؑ و حواؑ آرام سے رہتے تھے اس باغ میں شیطان نے جا کر حضرت آدمؑ و حواؑ کو دھوکہ دیا یہ قول بالکل غلط ہے اور ذرہ برابر قابل التفات نہیں رہا۔ یہ سوال کہ جنت میں جانے کے بعد وہاں سے نکلنا نہیں تو حضرت آدمؑ جنت میں جانے کے بعد کیسے نکلے، جواب یہ ہے کہ قیام قیامت کے بعد جو جنت میں داخل ہوگا وہ کبھی جنت سے نہ نکالا جائے گا، اللہ نے دخول جنت پر جو خلود اور دوام کا وعدہ فرمایا اس دخول سے وہ دخول جنت مراد ہے جو قیام قیامت اور جزار اور سزا کے بعد ہوگا۔ کیا احادیث صحیحہ سے یہ ثابت نہیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ المعراج میں جنت کی بھی سیر فرمائی، اور پھر صبح سے قبل ہی اس عالم میں تشریف لے آئے اسی طرح حضرت آدمؑ کے دخول کو سمجھیئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حق جل شانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آئین خلافت سکھنے کے لیے قسم قسم کی اشیاء سے تمتع اور انتفاع کے طریقے معلوم کرنے کے لیے اپنے حرم خاص جنت میں چند روزہ سکونت کے لیے حکم دیا اور تمام اشیاء سے تمتع اور انتفاع کی عام اجازت عطار فرمائی۔ صرف ایک قسم کے درخت سے منع فرمایا۔ شیطان تاک میں تھا کہ ان سے کوئی گناہ اور لغزش صادر ہو مگر گناہ اور لغزش اسی وقت ہوسکتی ہے جب کوئی قید اور ممانعت ہو جب کسی چیز کی ممانعت ہی نہ ہو تو معصیت کیسے سرزد ہو۔ شیطان کو جب لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کی نہی اور ممانعت کا علم ہوا تو سمجھا کہ شاید اس راہ سے آدمؑ پر میرا کوئی وار چل جائے اور اس طرح اپنی دشمنی نکالنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کے بہکانے اور پھسلانے کی فکر شروع کی۔ حضرت آدم اور حضرت حوا کے پاس گیا اور یہ کہا کہ تم اپنی اس تعظیم و تکریم پر مغرور نہ ہونا۔ انجام کو بھی سوچو۔ انجام تمہارا موت ہے۔ حضرت آدمؑ نے پوچھا کہ موت کیا ہے۔ شیطان نے مردہ جانور کی صورت بنا کر نزع اور قبض روح کی طرح کچھ کیفیت اور شدت اور غرغرہ کی حالت ان کو دکھلائی دیکھتے ہی گھبرا گئے اور خوف زدہ ہو کر پوچھا کہ اچھا اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر کیا ہے۔ شیطان نے کہا۔

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۞

کیا میں تم کو اس درخت کی نشان دہی نہ کروں کہ جس کے کھانے سے موت اور فنا نہ آئے اور بقاء اور دوام اور دائمی سلطنت اور لازوال بادشاہت حاصل ہو جائے۔

حضرت آدمؑ نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے۔ شیطان نے وہی درخت بتلایا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو منع کیا تھا حضرت آدمؑ نے کہا کہ یہ درخت تو فنا اور زوال کا ہے۔ بقاء اور دوام کا نہیں بلکہ رسوائی اور ندامت کا درخت ہے۔ قرب اور وجاہت کے بجائے بُعد اور ذلت کا موجب ہے اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے ہم کو اسکے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اگر اس درخت میں یہ فائدے ہوتے تو وہ ارحم الراحمین ہم کو منع نہ فرماتا۔ شیطان نے کہا۔

مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۔

تمہارے پروردگار نے اس درخت سے اس لیے منع نہیں کیا کہ اس کا پھل تمہارے لیے موجب ضرر ہوگا بلکہ اس لیے منع کیا ہے کہ تم اسکے کھانے سے ہمیشہ زندہ رہنے والے یا فرشتے بن جاؤ گے جو ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے اور کھانے اور پینے اور زن و فرزند اور دنیا و مافیہا سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

پس اگر یہ حالت تم کو حاصل ہو جائے تو خلافت کا کام کیسے انجام پائے۔ دنیا کی خلافت کا کام تو زن و فرزند اور طعام و شراب اور کسب معاش کی فکر میں مشغولی سے انجام پا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ زن و فرزند میں مشغول رہ کر خدا کے ساتھ مشغول نہیں رہ سکتا۔

حق تعالیٰ شانہٗ کو چونکہ تم سے خلافت کا کام لینا ہے اس لیے تم کو اپنے سے دور بھیج رہا ہے اور اس درخت کے میوہ کا استعمال خداوند ذوالجلال کے قرب و اتصال کا موجب ہے اور بہشت میں موت نہیں۔ تم کو محض آئین خلافت کے سکھانے کے لیے چند روز بہشت میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ اسکے بعد تم کو اپنی بارگاہِ قرب سے علیحدہ کر کے دنیا میں بھیجے گا۔ وہاں جا کر تم اور تمہاری اولاد طرح طرح کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونگے اور انجام سب کا موت ہوگا اور خداوند

ذوالجلال کا قرب اور وصال اور یہاں کا یہ ملک لازوال دنیا میں جانے کے بعد اور خلافت ارضی کے ملنے کے بعد باقی نہیں رہ سکتا۔ حضرت آدمؑ اور حواؑ ابلیس کی ان دلفریب باتوں سے تردد اور اضطراب میں پڑ گئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک عاشق صادق حکومت اور سلطنت کو چھوڑ سکتا ہے مگر محبوب کی مفارقت اور جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ عاشق صادق کے لیے تو مفارقت کا لفظ ہی فراق روح کا پیغام ہوتا ہے۔ ابلیس نے جب دیکھا کہ حضرت آدمؑ اور حواؑ تردد میں پڑ گئے تو ان کو پختہ کرنے کے لیے بہت سی قسمیں کھائیں۔ کما قال تعالیٰ۔ وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ۔ کہ خدا کی قسم محض تمہاری خیر خواہی سے تم کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ تم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے جو بے ادبی اور گستاخی مجھ سے سرزد ہو چکی ہے اس خیر خواہی سے اس کی کچھ تلافی کر دوں تاکہ عمر بھر تم مجھ کو یاد کرو اور میرے شکرگزار رہو۔ حضرت آدمؑ کو یہ خیال ہوا کہ مخلوق کی یہ جرأت اور مجال نہیں کہ خداوند ذوالجلال پر جھوٹی قسم کھائے اور اس تاکید اکید کے ساتھ کھائے۔ اس لیے بظاہر یہ سچ ہوگا اور قرب اور وصال کے حصول کے شوق میں لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کے حکم سے ذہول ہو گیا اور اس کی عداوت کو بھی بھول گئے فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا پس شیطان نے آدمؑ اور حواؑ کو اس درخت کے بچنے سے اس طرح پھسلا دیا اور معلوم نہیں کہ حضرت حواؑ اور حضرت آدمؑ کے سامنے اس لعین نے کیا کیا دلفریب باتیں بنائی ہونگی جس سے وہ دھوکہ میں آگئے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں بجائے فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا کے فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا آیا ہے۔ کما فی الکشاف۔ اس قراءت میں لغزش کی ایک کیفیت کا بیان ہے، شیطان نے بذریعہ وسوسہ حضرت آدمؑ اور حواؑ کو لغزش دی فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ پس نکالا ان دونوں کو اس راحت اور آرام سے جس میں وہ تھے اور گناہ کی برائی ظاہر کرنے کے لیے ہم نے آدمؑ اور حواؑ سے کہا کہ اترو تم بہشت سے اس لیے کہ تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہوگا۔ اور بہشت نہ معصیت کا محل ہے نہ عداوت اور دشمنی کا۔ اس کے لیے تو دار دنیا ہی موزوں اور مناسب ہے دنیا ہی میں خدا کی نافرمانی اور آپس کی عداوت ممکن ہے خدا کی بہشت اور ساتوں آسمان حق جل وعلا کی معصیت سے بالکلیہ پاک اور آپس کی عداوت سے بالکل منزہ ہیں۔

فائدہ اِهْبِطُوْا کا خطاب حضرت آدمؑ اور حواؑ کو ہے جیساکہ دوسری جگہ قُلْنَا اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بصیغہ تثنیہ وارد ہوا ہے۔ چونکہ حضرت آدم ابوالبشرؑ اور حضرت حوا ام البشرؑ ہونے کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان کے قائم مقام ہیں اس لیے اس جگہ قُلْنَا اهْبِطُوْا میں حضرت آدم اور حوا کو صیغہ جمع کے ساتھ مخاطب فرمایا اور چند روز تک تم کو زمین پر ٹھہرنا ہے اور وہاں کے سازوسامان سے ایک وقت معین تک تم کو متمتع اور منتفع ہونا ہے یعنی وہ انتفاع دائمی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت معین تک ہوگا اور وہ وقت معین ہر شخص کے لحاظ سے تو موت ہے اور سارے عالم

کے اعتبار سے قیامت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اس خطاب سراپا عتاب کو سنتے ہی بے چین اور بے تاب ہو گئے۔ فوراً بارگاہ خداوندی میں ایسے تضرع اور ابتہال کے ساتھ ملتجی ہوئے کہ سارے عالم کا تضرع اور ابتہال بھی اس کے پاسنگ نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی شان عفو اور مغفرت جوش میں آگئی۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست   وے ہمایوں دل کہ آں بریان اوست
در پئے ہر گریہ آخر خندہ ایست   مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

اور حضرت آدم کو توبہ اور معذرت کے کلمات تلقین فرمائے گئے۔ ابلیس کی معصیت چونکہ تمرد اور سرکشی کی بنا پر تھی اس لیے اس کو توبہ اور معذرت کی تلقین نہیں فرمائی۔ اور حضرت آدم کی معصیت سہو اور نسیان اور ذہول اور غفلت کی بنا پر تھی اس لیے انکو بارگاہ خداوندی سے کلمات معذرت کا القاء اور الہام ہوا جو انکی توبہ کی قبولیت کا سبب ہے جیساکہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

پس حاصل کیے آدم نے اپنے رب کے الہام سے معذرت کے چند کلمے۔ پس توجہ فرمائی ان پر اللہ نے اپنی رحمت اور مغفرت سے۔ اور بیشک وہی توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ تواب کے بعد رحیم کی صفت ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا اس پر واجب نہیں محض اپنی رحمت سے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور وہ کلمات یہ ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ جیساکہ سورہ اعراف میں اُنکا ذکر ہے۔

فائدہ ۱ حضرت حوا چونکہ حضرت آدمؑ کے تابع تھیں اس لیئے اس جگہ انکی توبہ کا ذکر نہیں فرمایا۔ اور سورۂ اعراف میں دونوں کی توبہ ذکر فرمائی۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا الخ یعنی دونوں نے کہا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الخ اس پر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کے گناہ کو معاف کیا اور توبہ کو قبول فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بن گئے۔ کما قَالَ تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (اللہ تعالیٰ توابین کو محبوب رکھتا ہے)۔

فائدہ ۲ توبہ کے اصلی معنیٰ رجوع کے ہیں اور اَوْب کے معنیٰ بھی رجوع کے ہیں۔ تائب اور تواب اسکو کہتے ہیں کہ جو معصیت سے طاعت کی طرف رجوع کرے اور آئب اور اواب وہ ہے جو غفلت سے ذکر اور فکر کی طرف رجوع کرے کما قال تعالیٰ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ اور جب تاب کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف کی جائے مثلاً تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهَا۔ کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے انتقام اور عقوبت سے عفو اور رحمت اور لطف و عنایت کی طرف رجوع فرمایا۔

فائدہ ۳ حضرت آدمؑ کے توبہ قبول ہو جانے سے عیسائیوں کے عقیدہ کی تردید

ہو گئی کہ آدم کی معصیت کی وجہ سے ان کی تمام اولاد گناہ کے بوجھ میں لدی ہوئی تھی عیسیٰ نے آکر تمام بنی آدم کو اپنی صلیبی موت سے گناہوں سے مخلصی دی۔ نصاریٰ کا یہ عقیدہ بالکل مہمل ہے عقل اور نقل کے خلاف ہے۔

ازالۂ اشتباہ از لغزش سیدنا وابینا آدم علیہ الصلاۃ والسلام وتحقیق مسلک علمأ اسلام دربارۂ عصمت انبیأ کرام علیہم الصلاۃ والسلام

قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں کہ حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے باوجود اول الانبیار اور نبی مکلم اور رسول محترم ہونے کے یہ زلت[1] (لغزش) کیسے صادر ہوئی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسئلہ عصمت انبیار کی مختصراً توضیح اور تشریح کردی جائے اور عصمت اور معصیت کی حقیقت سمجھادی جائے۔ اصل مسئلہ سمجھ جانے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ کوئی اشکال نہ رہے گا اہل حق کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیأ کرام علیہم الصلاۃ والسلام خداوند ذوالجلال کی نافرمانی سے معصوم ہوتے ہیں۔ صغیرہ اور کبیرہ سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ قصداً وارادۃً ان سے حق تعالیٰ کی نافرمانی ممکن نہیں۔ اگر قصداً ان سے حکم الٰہی کی مخالفت ممکن ہوتی تو حق جل شانہٗ مخلوق کو انکی بے چون وچرا اطاعت[2] اور متابعت کا حکم نہ دیتا اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت نہ قرار دیتا اور انبیار کرام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا نہ قرار دیتا۔

قال تعالیٰ وَ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا	تحقیق جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں

---

[1] زلّت بمعنی لغزش فتح زار کے ساتھ ہے جسکے معنی بلا ارادہ اور اختیار قدم پھسل جانیکے ہیں یہ لفظ زار کے ساتھ ہے ذال کے ساتھ نہیں۔ ذال کیساتھ لفظ ذلّت بکسر ذال ہے جو عزت کی ضد ہے اور قرآن کریم میں فازلھما۔ زار کے ساتھ آیا ہے۔ ذال کے ساتھ نہیں۔ خوب سمجھ لو کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ [2] حافظ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ و از انجملہ آنست کہ ہوائے ایشاں پئے فرمان حق بودہ است ونفس ایشاں ہموار در طاعت او بفرمان ایشاں وازیں وجہ ایشاں از نافرمانی خدا بقصد معصوم مانند وایشاں واجب العصمت اند ومخالفت امر خدائے تعالیٰ برایشاں روا نیست زیرا کہ حق خلق را فرمودہ است کہ پیروی ایشاں بکنند واگر عصیاں بقصد از ایشاں یافت شدے خدائے تعالیٰ خلق را متابعت ایشاں نفرمودے۔ (معتمد فی المعتقد ص ۶۳)

يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ انکے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

دست اورا حق چو دست خویش خواند تا ید اللہ فوق ایدیھم بر اند

اور ظاہر ہے کہ یہ اتباع نبوی اور اقتدار مطلق کا حکم جو آیات قرآنیہ سے ثابت ہے وہ کسی خاص امر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عقائد سے لیکر اعمال تک کوئی عقیدہ اور کوئی خلق اور کوئی حال اور کوئی عمل کیوں نہ ہو سب میں اقتدار نبوی ضروری ہے جیسا کہ مقتضائے اطلاق یہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام کی ذوات بابرکات۔ قدسی صفات اور ملکی سمات ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام کی اصل فطرت وہی ہوتی ہے جو ملائکہ کی ہوتی ہے۔ فطرت کے اعتبار سے انبیاء اور ملائکہ ایک ہوتے ہیں۔ فرق فقط لباس بشری کا ہوتا ہے اور عصمت ملائکہ کا خاصہ لازمہ ہے اور انبیاء کرام۔ ملائکہ سے افضل ہیں جیسا کہ حضرت آدمؑ کا قصہ اس پر شاہد عدل ہے۔ ابلیس لعین اسی وجہ سے ملعون اور مطرود ہوا کہ اس نے حضرت آدم کی افضلیت اور برتری کو تسلیم نہیں کیا جس سے ثابت ہوا کہ حضرت آدمؑ ملائکہ معصومین سے افضل اور برتر ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم معصوم سے افضل نہیں ہو سکتا۔

عصمت کے معنی

عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی مداخلت سے پاک اور منزہ ہوں اور نفس اور شیطان یہی دو چیزیں مادۂ معصیت ہیں اور مادۂ معصیت سے پاک ہونے کا نام عصمت ہے اور معصوم وہ شخص ہے جو اپنے تمام اعتقادات اور نیات اور ارادات اور مقامات اور اخلاق و عادات اور عبادات و معاملات اور اقوال و افعال میں نفس اور شیطان کی مداخلت سے محفوظ ہو اور حفاظت غیبی اس کی محافظ اور نگہبان ہو کہ اُن سے کوئی ایسی شئی سرزد نہ ہو جائے کہ اُن کے دامن عصمت کو آلودہ کر سکے۔ حق جل شانہٗ کی نظر عنایت اور فرشتوں کی محافظت اُنکو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہو گویا انکو راہ راست پر چلاتی ہو اور خلاف حق کے میلان سے بھی اُن کی مانع ہو حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں انبیاء کرام کو مرتضیٰ اور مصطفین[1] الاخیار اور عباد مخلصین فرمایا ہے۔ جس سے من کل الوجوہ ارتضا اور اصطفاء اور اخلاص کامل مراد ہے اور مخلص وہ ہے کہ جو خالص اللہ کا ہو غیر اللہ کا اس میں شائبہ نہ ہو یعنی مادۂ شیطانی سے بالکلیہ پاک ہو لہٰذا ضروری ہوا کہ نبی صغائر اور کبائر دونوں سے معصوم ہو اس لیے کہ مادۂ شیطانیہ ہی صغائر اور کبائر

---

[1] کما قال تعالیٰ وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ وقال تعالیٰ حاکیا عن اللعین رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ ــــ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ۔

کا منشا ہے اور حق جل شانہ کے اس ارشاد اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ میں. لفظ مِنْ بیانیہ ہے اور لفظ رسول نکرہ لایا گیا ہے معلوم ہوا کہ ہر رسول کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ اور برگزیدہ بندہ ہو یعنی تمام اخلاق و عادات اور افعال و ملکات اور احوال و مقامات میں من کل الوجوہ حق تعالیٰ کا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ہو اور بلا شرکت غیرے خالص اللہ کا بندہ ہو اور ظاہر ہے کہ ان آیات میں بعض وجوہ سے پسندیدگی مراد نہیں اس لیے کہ بعض وجوہ سے تو ہر مسلمان خدا کا پسندیدہ بندہ ہوتا ہے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کے اصطفاء اور اجتباء اور ارتضاء سے من کل الوجوہ پسندیدگی اور برگزیدگی مراد ہے اور من کل الوجوہ پاک و صاف اور خدا کا پسندیدہ اور بلا شرکت غیر خالص حق تعالیٰ کا بندہ وہی ہو سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی بندگی اور اطاعت سے بالکلیہ پاک ہو اور اسی مادۂ معصیت سے بالکلیہ طہارت اور نزاہت کا نام عصمت ہے اور اصطفاء اور ارتضاء باب افتعال کے مصدر ہیں جو اپنے لیے ہوتا ہے. اکتیال اور اتزان اپنے لیے کیل و وزن کرنے کو کہتے ہیں اور کیل اور وزن عام ہے خواہ اپنے لیے ہو یا غیر کے لیے. کما قال تعالیٰ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ اپنے لیے کیل کرنے کو اکتالوا یعنی باب افتعال کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا اور دوسروں کے لیے تولنے کو کالوہم اور وزنوہم ثلاثی مجرد سے تعبیر کیا گیا پس اس قاعدۂ لغویہ کے بنا پر اصطفاء اور ارتضاء کے معنی اپنے لیے پسندیدہ اور برگزیدہ بنا نکلے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ پس عصمت کا ماحصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام تمام اخلاق و ملکات و عادات و حالات۔ اقوال و افعال عبادات و معاملات میں سرتاپا پسندیدۂ خداوندی اور برگزیدۂ ایزدی ہوتے ہیں اور ظاہراً اور باطناً دخل شیطانی اور عوارض نفسانی سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی عنایت ربانی و حمایت یزدانی سے علیحدہ نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء کی بے چون وچرا اطاعت فرض ہے اور اُن کا ہر قول اور ہر فعل قابل قبول ہے اور اُن کی اطاعت سے انحراف شقاوت ابدی اور خسران دارین کا موجب ہے حضرات انبیاء کرام سے اگر کسی وقت بمقتضائے بشریت کوئی لغزش بطور سہو و نسیان صادر ہو جاتی ہے تو وہ باہر سے آتی ہے اندر سے نہیں آتی جیسے آب گرم میں حرارت خارجی اثر سے آتی ہے باقی پانی میں مادۂ حرارت کا نام و نشان نہیں پانی کی طبیعت میں سوائے برودت کے کچھ بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ پانی کتنا ہی گرم ہو اگر آگ پر ڈال دیا جائے تو آگ فوراً بجھ جاتی ہے اسی طرح حضرات انبیاء کرام کا باطن مادۂ معصیت (نفس و شیطان) سے بالکل پاک ہوتا ہے، البتہ کبھی خارجی اثر سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے لیکن فوراً ہی دست قدرت اُس باہر سے آئے ہوئے غبار کو چہرۂ عصمت سے صاف کر دیتا ہے اور چہرۂ نبوت پہلے سے زیادہ صاف اور روشن ہو جاتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام

کے قصہ میں حق جل شانہٗ کا ارشاد۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ

(اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خالص بندوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے تاکہ (یوسفؑ) سے برائی اور بےحیائی یعنی صغیرہ اور کبیرہ کو اس سے دور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔

اسی طرف مشیر ہے کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ سوء اور فحشاء کو یوسفؑ سے دور رکھیں اور یہ نہیں فرمایا کہ یوسفؑ کو سوء اور فحشاء سے دور رکھیں۔ پھیرنا اور ہٹانا اور دور رکھنا اسکے حق میں ہوتا ہے جو آنا چاہتا ہو معلوم ہوا کہ سوء اور فحشاء حضرت یوسفؑ کی طرف آنا چاہتا تھا۔ جس کو حق تعالیٰ نے یوسفؑ کی طرف آنے سے روک دیا حضرت یوسفؑ ادھر جانا نہیں چاہتے تھے۔ معاذاللہ اگر حضرت یوسف کا میلان سوء اور فحشاء کی طرف ہوتا تو حق تعالیٰ اس طرح فرماتے كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَهٗ عَنِ السُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ یعنی ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء سے روکا اور بچایا معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام تو سوء والفحشاء سے بھاگ رہے تھے مگر سوء اور فحشاء اُن کے پیچھے لگا ہوا تھا جسکو دست قدرت نے دھکے دیدیئے اور یوسف علیہ السلام کو بالکل بچا لیا کیونکہ یوسف علیہ السلام تو خالص اللہ کے بندے تھے اُن کا قلب مادۂ معصیت سوء اور فحشاء سے بالکلیہ پاک تھا زلیخا کی طرف سے یہ سوء اور فحشاء چلا مگر حق تعالیٰ کی رحمت اور عنایت نے اس کو خدا کے مخلص اور برگزیدہ بندہ تک پہنچنے نہ دیا۔

غرض یہ کہ خارجی اثر کی بناء پر حضرات انبیاء کرام سے بطریق سہو ونسیان جو لغزش ہو جاتی ہے تو محض صورت کے اعتبار سے اس پر عصیان یا معصیت کا اطلاق ہو جاتا ہے یا اُن کے مقام عالی اور مرتبہ علیا کے لحاظ سے اسکو عصیان کہہ دیا جاتا ہے۔

معصیت کے معنی

اور معصیت (گناہ) مطلق مخالفت حکم کا نام نہیں بلکہ معصیت اس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً اور قصداً ہو اور بوجہ نسیان اور غلطی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موقع عذر میں یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بھول گیا تھا یا میں سمجھا نہ تھا اگر باوجود نسیان اور غلط فہمی کے بھی کسی مخالفت کو معصیت اور گناہ اور جرم کہا جائے تو پھر موقع عذر میں یہ کہنا کہ میں بھول گیا تھا سراسر لغو ہوگا۔

معلوم ہوا کہ مطلق مخالفت کا نام معصیت نہیں بلکہ معصیت اُس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً ہو اور جو مخالفت سہو اور نسیان کی بناء پر ظہور میں آئے یا بتقاضائے عظمت یا بتقاضائے محبت کوئی مخالفت سرزد ہو جائے تو اسکو معصیت اور گناہ نہیں کہتے بلکہ اس کو زَلَّتْ اور لغزش کہتے ہیں جیسے کوئی

مخدوم اپنے کسی چھوٹے کو سرہانے بیٹھنے کو کہے اور وہ اس کے کہنے کو نہ مانے تو یہ سرکشی اور معصیت نہیں بلکہ عین ادب اور دلیل اطاعت ہے صلح حدیبیہ میں حضرت علیؓ کا لفظ رسول اللہ مٹا دینے سے انکار کر دینا اسی قبیل سے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کھا لینا بھول چوک کی بنا پر تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ حضرت آدم حق جل شانہٗ کی ممانعت لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ کو بھی بھول گئے اور شیطان کی عداوت سے بھی ذہول ہو گیا اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد اِنَّهٗ عَدُوٌّ لَّكُمَا فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى یہ بھی یاد نہ رہا سو یہ ماجرا بھولے سے ہو گیا اور بھول چوک کو گناہ اور جرم قرار دینا سراسر غلط ہے۔ حضرت آدم اور حوا دونوں جنت پر شیدا اور فریفتہ تھے اس لیے ابلیس کی قسم سے دھوکہ میں آ گئے اور یہ سمجھے کہ خدا کا نام لیکر کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ نیز حضرت آدم کا گیہوں کو کھا لینا بتقاضائے محبت خداوندی تھا۔ خلود اور قرب خداوندی کے شوق میں تھا۔ جیسا کہ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۔ اس پر دلالت کرتا ہے نیز بتقضائے عظمت بھی تھا اس لیے کہ جب شیطان نے یہ قسم کھائی وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ تو حضرت آدمؑ کو یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ خدا کا نام لیکر کوئی جھوٹ بولے گا وہ یہ سمجھے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا پس معلوم ہو گیا کہ حضرت آدمؑ کا یہ فعل بارادۂ مخالفت نہ تھا اور نہ بتقاضائے ہوائے نفسانی تھا۔ بلکہ بتقاضائے محبت وعظمت خداوندی تھا لہٰذا اس کو معصیت اور گناہ نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ از قسم زلّت ولغزش ہے یعنی ارادہ تو اطاعت اور قرب خداوندی کا تھا مگر دشمن نے ایسا دھوکہ دیا کہ قدم پھسل کر دوسری جانب جا پڑا اسی کو لغزش کہتے ہیں۔ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ اور فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ لغزش تھی جو بھولے سے ہو گئی ارادہ نافرمانی کا نہ تھا۔

پس جن آیات قرآنیہ میں اس فعل پر معصیت کا اطلاق کیا گیا ہے وہ محض ظاہر اور صورت کے اعتبار سے ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں یا ان کے مقام بلند اور رتبۂ عالیہ کی نسبت سے اسکا نام عصیان رکھا گیا (مباحثۂ شاہجہان پور صـ۳۷ و صـ۳۸)

اور حضرات انبیاء کے حق میں ترک اَولیٰ ایسا ہے جیسا کہ دوسروں کے حق میں خطاء (حاشیۂ ملا عبدالحکیم علی الخیالی صـ۲۶۱)

حضراتِ انبیاء کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ افضل اور اَولیٰ سے چوک گئے اور بھولے سے غیر اَولیٰ اور غیر افضل کے مرتکب ہوئے اور اوروں کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ حق اور ہدایت سے چوک گئے اور باطل اور ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرات انبیاء کرام باجماع امت ایسی خطاء سے معصوم ہیں حضرات انبیاء کی خطاء اجتہادی کے یہ معنی ہیں کہ کسی وقت بھول چوک سے اولیٰ وافضل کے بجائے خلافِ اولیٰ

امر ان سے صادر ہو جاتا ہے۔ اور بجائے عزیمت کے رخصت پر عمل کر لیتے ہیں۔

حضرت آدمؑ کی زَلّت اور لغزش کو اسی معنی پر محمول کرنا چاہیئے اور یہ معلوم رہنا چاہیئے اگر بالفرض والتقدیر انبیاء کرامؑ معاذ اللہ ہماری طرح اسیر حرص وشہوت ہوتے تو خدا تعالیٰ ہم پر ان کی بے چون و چرا اطاعت اور متابعت فرض نہ کرتا۔ اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو خلاصۂ موجودات اور زبدۂ کائنات ہیں ان کو انبیاء کرام کی اقتدار کا حکم نہ دیتا اور یہ ارشاد نہ فرماتا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ (کذا فی المعتمد فی المعتقد للتورپشتی)

امامؒ ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ نظر اور فکر کا اقتضاء یہ ہے کہ انبیاء کرام کے حق میں عصمت کا اعتقاد۔ ملائکہ کی عصمت کے اعتقاد سے زیادہ مؤکد اور اہم ہو اس لیے کہ لوگ انبیاء کرام کی اتباع اور متابعت پر مامور ہیں اور ملائکہ کی اطاعت پر مامور نہیں (المعتمد فی المعتقد للتورپشتی ص۷۳)

متعلقات عصمت

امام رازی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ عصمت کا تعلق چار چیزوں سے ہے اول عقائد۔ دوم تبلیغ احکام۔ سوم فتوی اور اجتہادات۔ چہارم۔ افعال وعادات وسیرت وکردار۔

قسم اوّل یعنی عقائد کے متعلق اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرامؑ ابتداء ہی سے توحید اور ایمان پر مفطور ہوتے ہیں، جب سے پیدا ہوتے ہیں اسی وقت سے ان کے قلوب کفر اور شرک سے پاک اور منزہ اور ایقان وعرفان سے لبریز ہوتے ہیں اور ان کے مبارک چہرے معرفت اور قرب الٰہی کے انوار وتجلیات سے ہر وقت جگمگاتے رہتے ہیں آج تک کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت حق جل شانہٗ نے اپنی نبوت ورسالت کے لیے کسی وقت بھی ایسے شخص کو منتخب فرمایا ہو جو اس عظیم الشان منصب کی سرفرازی سے پہلے کفر اور شرک کی نجاست میں ملوث اور آلودہ ہو چکا ہو ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ اور حق جل شانہٗ کا یہ ارشاد وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۔ اسی طرف مشیر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام اگرچہ قبل از بعثت نبی نہیں ہوتے مگر خدا کے ولی اور مقرب ضرور ہوتے ہیں اور ایسے ولی اور مقرب ہوتے ہیں کہ دوسرے اولیاء اور مقربین کی ولایت اور قرب کو ان کی ولایت اور قرب کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں ہوتی کہ جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہوتی

لہ اصل عبارت یہ ہے امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ گفتہ است کہ نظر اقتضاء آں می کند کہ تاکید وجوب عصمت درحق انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام افزوں از انست کہ درحق ملائکہ زیرا کہ خلق بمتابعت انبیاء مامورند بہ متابعت ملائکہ مامور نیستند (کذا فی المعتمد فی المعتقد للتورپشتی ص۷۳)

ہے، اس لیے امت محمدیہ کے تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام کے دلوں میں کفر اور گمراہی کا اعتقاد ناممکن اور محال ہے، البتہ فرقۂ امامیہ کے نزدیک بطور تقیہ انبیاء کے لیے کفر جائز ہے۔

قسم دوم تبلیغ احکام- سو اس بارہ میں بھی تمام امت محمدیہ کا اتفاق ہے کہ احکام الٰہیہ کی تبلیغ میں انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں۔ در بارۂ تبلیغ اُن سے نہ قصداً کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ سہواً تبلیغ کے بارہ میں جھوٹ اور تحریف سے بالکلیہ پاک اور معصوم اور منزہ ہوتے ہیں کسی طور اور کسی صورت سے کذب اور تحریف کا اُن سے سرزد ہونا محال ہے تندرست ہوں یا مریض خوش ہوں یا ناراض کوئی حالت ہو مگر یہ ناممکن ہے کہ وحی الٰہی کے پہنچانے میں اُن سے کسی قسم کی سہواً یا عمداً کوئی غلطی ہو جائے ورنہ پھر وحی الٰہی پر وثوق اور اطمینان کی کوئی صورت نہ رہے گی اور نبی کی تبلیغ سے وثوق اور اعتماد بالکل جاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نزول وحی کے وقت فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ وحی الٰہی شیطان وغیرہ کی مداخلت سے بالکلیہ محفوظ رہے۔ کما قال تعالیٰ

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا

وہی عالم الغیب ہے اپنے خزانۂ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر اپنے برگزیدہ یعنی رسول کو بقدر حکمت و مصلحت بذریعہ وحی کے کچھ بتلا دیتا ہے اور نزولِ وحی کے وقت اس رسول کے آگے اور پیچھے فرشتوں کا پہرہ لگا دیتے ہیں کہ شیطان اور نفس اس میں کسی قسم کا دخل نہ کرنے پائے اور یہ انتظام اس لیے کیا گیا کہ معلوم ہو جائے کہ فرشتوں نے اپنے رب کے پیام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے ہیں۔ غلطی سے پاک اور مبرا ہیں اور اللہ تعالیٰ انکے تمام احوال کے محیط ہیں اور ہر چیز ایک ایک ان کو معلوم ہے۔

قسم سوم یعنی فتویٰ اور اجتہاد کے متعلق علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ انتظار وحی کے بعد انبیاء کرام کبھی کبھی امور غیر منصوصہ میں اجتہاد فرماتے ہیں۔ اگر کسی وقت کوئی اجتہادی خطا ہو جاتی ہے تو فوراً بذریعہ وحی کے متنبہ کر دیئے جاتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ انبیاء سے کوئی اجتہادی خطا واقع ہو اور من جانب اللہ انکو مطلع نہ کیا جائے

قسم چہارم یعنی افعال و عادات سو ان کے متعلق اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ انبیاء کبائر سے تو بالکلیہ پاک ہوتے ہیں البتہ صغائر یعنی خلاف اولیٰ امور کبھی کبھی

سہواً اور نسیاناً ان سے صادر ہو جاتے ہیں۔ ظاہراً وہ معصیت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان سے کسی حکم کی تشریع مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم سے ظہر یا عصر کی نماز میں سہو کا پیش آنا بظاہر غفلت معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں سجدۂ سہو کا حکم بتلانا مقصود تھا۔ اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو امت کو سجدۂ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا؟ اور علی ہذا اگر لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز نہ فوت ہوتی تو قضاء فوائت یعنی فوت شدہ نمازوں کی قضاء کا مسئلہ کیسے معلوم ہوتا اس اعتبار سے یہ سہو اور نسیان عین رأفت اور عین رحمت ہے اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں۔

یا لیتنی کنت سھو محمد۔ — کاش میں رسول اللہ کا سہو ہو جاتا یعنی حضور کا سہو میری یاد سے کہیں بہتر ہے

اور حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ پیغمبر کا نسیان حقیقت میں کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ حضرات انبیاء کو بمقتضائے بشریت سہو اور نسیان ضرور پیش آتا ہے۔ اس لیے کہ انسان جب تک جامۂ بشریت میں ہے خواص بشریہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ بھوک بھی ہے اور پیاس بھی ہے۔ مسرت اور فرحت بھی ہے اور رنج وغم بھی ضحک اور تبسم بھی ہے۔ ناراضی اور غصہ بھی۔ اور حق تعالےٰ شانہ کے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے۔

قُلۡ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ — آپ کہہ دیجئے کہ جز این نیست کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔

ؒ ؒ ؒ

یعنی باوجود نبوت و رسالت کے پھر میں بشر ہوں فرشتہ نہیں۔ تمہاری طرح کھاتا اور پیتا ہوں۔ اپنی حوائج ضروریہ کے لیے بازاروں میں بھی آتا جاتا ہوں۔ یہ سب بشریت کے لوازم اور خواص ہیں۔ نبوت و رسالت کے منافی نہیں۔ بہر حال سہو اور نسیان انسانیت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح دوسرے لوازم انسانیت مثلاً بھوک اور پیاس وغیرہ نہ نبوت و رسالت کے منافی ہیں اور نہ عصمت کے اسی طرح افعال و عادات میں سہو اور نسیان بھی نبوت اور عصمت کے منافی نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرات انبیاء کے سہو اور نسیان کو دوام اور قرار۔ بقاء اور استمرار نہیں کبھی کبھی بمقتضائے بشریت سہو ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی نبی کو جب کبھی کوئی سہو ہوا تو وہ ایک ہی مرتبہ ہوا یعنی اس نوع کا سہو پھر اس کو مدت العمر کبھی پیش نہیں آیا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے لا یلدغ المؤمن من جحر مرتین۔ یعنی مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ جن کے قلوب ایمان کی حلاوت اور شیرینی چکھ چکے ہیں۔ وہ شیطان سے دو مرتبہ نہیں ڈسے جاتے ہاں جو حقیقۃً مومن نہیں محض نام کے مومن ہیں وہ دو مرتبہ نہیں بلکہ صدہا مرتبہ نفس اور شیطان سے ڈسے جاتے ہیں اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس درخت کو کھا لینا بھی اسی مقتضائے بشریت اور خاصۂ انسانیت یعنی سہو اور نسیان کا ثمرہ اور نتیجہ تھا۔ چنانچہ

خود حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ آدمؑ بھول گئے یعنی حق تعالیٰ شانہٗ کی ممانعت اور شیطان کی عداوت کا اس وقت استحضار نہ رہا معصیت اور نافرمانی کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ فقط شیطان کی قسم سے دھوکہ میں آگئے۔ حدیث میں ہے المؤمن غرٌّ کریم۔ مؤمن دھوکہ میں آ ہی جاتا ہے۔ وقال تعالیٰ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (تم پر بھول چوک میں کوئی گناہ نہیں ولیکن گناہ اس میں ہے جسکا تمہارے دل پختہ ارادہ کرلیں) اس آیت کے مطابق جب خطا اور نسیان میں کوئی گناہ ہی نہیں تو وہ پھر عصمت کے منافی کیسے ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حالت صوم میں بھول کر کھا لینا مفسد صوم بھی نہیں۔ حضرت آدمؑ کا قلب مطہر اور سینۂ مبارک چونکہ حق جل وعلا کی عظمت اور جلال سے بھرا ہوا تھا۔ اس لیے جب شیطان نے اللہ کی قسم کھا کر یہ کہا کہ إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ۔ (میں یقینا تمہارا خیرخواہ ہوں) تو حضرت آدمؑ کو یہ وہم بھی نہ ہوا کہ کوئی بے حیا اور گستاخ حق تعالیٰ شانہٗ کا نام لیکر جھوٹی قسم کھائے گا۔ اس فریب کے ساتھ شیطان نے حضرت آدمؑ کو لغزش میں ڈالا۔ قال تعالیٰ فَدَلّٰهُمَا بِغُرُورٍ (یعنی شیطان نے انکو دھوکہ اور فریب کے ساتھ پھسلا دیا) غرور کے لفظ سے خود معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصیت دھوکہ سے ہوگئی ورنہ حضرت آدمؑ کا ارادہ نہ تھا۔ وہ تو مزید قرب الٰہی کے متمنی اور متلاشی تھے۔ دشمن نے طاعت کے بہانہ سے معصیت میں مبتلا کر دیا مگر یہ معصیت فقط ظاہراً اور صورۃً معصیت تھی حقیقت میں عظیم الشان نعمت اور بے پایاں رحمت تھی۔ مقصود یہ تھا کہ گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریقہ معلوم ہو۔ جس طرح نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے سہو سے سجدۂ سہو کا حکم بتلانا مقصود تھا۔ اگر آپکو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو امت کو سجدۂ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سہو سے توبہ اور استغفار کا طریقہ بتلانا مقصود تھا۔ کہ جب کبھی کسی سے کوئی گناہ صادر ہو تو فوراً اپنے باپ آدمؑ کی طرح تضرع اور زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں رجوع کرے شیطان کی طرح معارضہ اور مقابلہ نہ کرے، بالفرض اگر حضرت آدمؑ سے یہ معصیت نہ سرزد ہوتی تو ہم گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریق کیسے معلوم ہوتا۔

عارف ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ کے علم میں سعادت اور شقاوت دونوں ہی مقدر تھیں اسکی حکمت اسکو مقتضی ہوئی کہ سعادت کا بھی افتتاح ہو۔ اور شقاوت کا بھی۔ اس لیے سعادت کا افتتاح حضرت آدمؑ کے ہاتھ سے کرایا اور شقاوت کا افتتاح ابلیس کے ہاتھ سے کرایا۔ اہ کلامہٗ۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص سنت حسنہ جاری کرتا ہے تو جتنا اجر اور ثواب اس سنت پر عمل کرنے والوں کو ملتا ہے اسی قدر اجر و ثواب اس سنت کے جاری کرنے والے کو بھی ملتا ہے جب تک وہ سنت جاری رہے گی اس شخص کے اجر میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس عالم میں توبہ اور استغفار، تضرع اور ابتہال اور بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کی مبارک سنت جاری فرمائی۔ تاقیام قیامت جس قدر بھی تائبین اور مستغفرین توبہ اور استغفار کرتے رہیں گے اسی قدر حضرت آدمؑ کے درجات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ حضرت آدمؑ ہی تمام تائبین اور مستغفرین کے امام اور تمام متضرعین اور خاشعین کے قدوہ اور پیشوا ہیں۔

اور ابلیس نے اباء اور استکبار کی سنت سیئہ کو جاری کیا۔ قیامت تک جو شخص بھی حکم خداوندی سے اعراض وانکار کریگا۔ اس سے ابلیس کی ملعونیت اور مطرودیت میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ وہ کافرین اور مستکبرین کا امام اور احکام خداوندی پر اعتراض کرنے والوں کا پیشوا ہے۔ شیخ ابو العباس عریبی جو کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے شیخ ہیں، وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ معاذ اللہ حضرت آدم نے خدا کی نافرمانی نہیں کی بلکہ یہ معصیت اس بدبخت ذریت نے کی جو حضرت آدمؑ کی پشت میں مستور تھی اس لیے کہ حضرت آدمؑ کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں ان کی تمام صالح اور طالح ذریت سوار تھی۔

حافظ ابن قیم قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ حق تعالٰے شانہٗ جب کسی بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو ظاہراً اسکو ذنب اور معصیت میں مبتلا کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ ایک باطنی مرض یعنی اعجاب اور خود پسندی کا علاج ہوتا ہے، ایسی حالت میں ذنب اور معصیت میں مبتلا ہونا ہزار طاعتوں سے زائد نافع اور مفید ہوتا ہے اور صاحب بصیرت کے نزدیک یہ معصیت، "ایں خطا از صد ثواب اولٰے ترا ست"، کا مصداق ہوتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ صحت اور عافیت اتنی مفید اور کارآمد نہیں جتنا مرض مفید اور کارآمد ہو جاتا ہے اس لیے کہ مرض کے آتے ہی طبیعت فوراً پرہیز اور علاج کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے اور طبیب حاذق کے مشورہ سے پورے اہتمام کے ساتھ تنقیہ اور مسہل کو شروع کردیا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی روز میں تمام فاسد اور ردّی مادہ خارج ہو کر طبیعت، پہلے سے زائد صاف اور ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر جب لذائذ و طیبات۔ فواکہ و ثمرات، لطیف غذاؤں اور مقوی دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس قدر قوی ہو جاتا ہے کہ اس مرض سے قبل بحالت صحت بھی اتنا قوی نہ تھا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا اس معصیت میں مبتلا ہو کر مسلسل تین سو سال تک توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری کرتے رہنا (جیسا کہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے) بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو گیا۔ چنانچہ حق تعالٰے شانہ فرماتے ہیں۔

وَ عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۔ آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی کی۔
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ ۔ پس ان کی عیش

فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى

مکدر[1] ہوگئی پھر خدا نے انکو برگزیدہ بنایا اور ان پر خاص توجہ فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔

کیا ہر معصیت سے انسان معاذ اللہ خدا کا مجتبیٰ اور برگزیدہ بندہ بن جاتا ہے۔ حاشا ثم حاشا ہاں ایسی معصیت کے بعد خُدا کے فضل و رحمت سے مجتبیٰ اور برگزیدہ بن سکتا ہے جس معصیت کے بعد آدم علیہ السلام جیسی ندامت اور شرمساری اور تضرع اور زاری ظہور میں آئے، ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ وارضاہ ایک صحابی تھے حضرات صحابہ میں انکو کوئی خاص شان امتیازی حاصل نہ تھی۔ بمقتضائے بشریت زنا میں مبتلا ہو گئے۔ مگر بعد میں اس درجہ صمیم قلب اور اخلاص سے توبہ کی کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس توبہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ واللہ اگر ماعز کی توبہ تمام مدینہ پر تقسیم کی جائے تو یقیناً سب کی نجات کے لیے کافی اور وافی ہوگی۔ زنا بیشک معصیت تھا مگر ماعز اسلمی کی مضطربانہ اور بے تابانہ ندامت اور شرمساری اور گریہ وزاری نے اس کو عنداللہ ایسا مقبول اور محبوب بنادیا کہ سارے عالم کی عفت وعصمت اس پر فدا اور قربان ہے۔ ماعز اسلمی کو زنا کے سبب سے جو عنداللہ تقرب حاصل ہوا وہ اب بڑے سے بڑے ولی کو نماز سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ خوب سمجھ لو کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ اس مثال سے معاذ اللہ یہ مقصد نہیں کہ حضرات انبیاءؑ بھی اس قسم کے کبائر میں مبتلا ہو سکتے ہیں اس لیے کہ میں ابتداء ہی میں بتلا چکا ہوں کہ انبیاء کرام کبائر سے بالکلیہ معصوم ہوتے ہیں۔ اس مثال سے صرف اتنا بتلانا مقصود ہے کہ بعض مرتبہ زلت اور معصیت کا صدور طاعت سے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے اور وہ معصیت بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اس زلت اور لغزش سے حضرت آدمؑ کی شان میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ توبہ اور استغفار کے مقرون ہو جانے کی وجہ سے انکی شان اور بلند ہو گئی۔ اور گویا کہ بزبانِ حال حضرت آدمؑ سے اس وقت یہ کہا جا رہا تھا۔

یا آدم لا تجزع من کاس زلل کانت سبب کیسك فقد استخرج منك داء لا یصلح ان تجاورنا به و البست به حلة العبودیة۔

اے آدم تو اس لغزش کے پیالہ سے مت گھبرا کہ جو تیری ہوشیاری اور احتیاط کا سبب بنا اسی کی وجہ سے تجھ سے وہ عجب کی بیماری نکال دی گئی جس کے ساتھ ہماری مجاورت ناممکن ہے اب اس کے بعد تم کو عبودیت اور بندگی

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ غوی کے معنی گمراہ ہونیکے نہیں بلکہ عیش کا مکدر ہونا مراد ہے (لسان العرب مادہ غوایت)

(شعر) لعل عتبك محمود عواقبه
وربما صحت الاجسام بالعلل
یا آدم ذنب تذل به لدینا
احب الینا من طاعة تدل
بها علینا یا آدم انین
المذنبین احب الینا
من تسبیح المدلین۔
(مدارج السالکین ص ۱۶۶ ج ۱)

کا حلہ اور خلعت عطا کیا گیا۔
ترجمۂ شعر۔ "امید ہے کہ تیرے عتاب کا انجام نہایت محمود اور بہتر ہو گا اور بسا اوقات بیماریوں سے اجسام پہلے سے زائد تندرست ہو جاتے ہیں"۔ اے آدم وہ گناہ جس سے تو ہمارے نزدیک ذلیل ہو وہ اس طاعت سے بدرجہا محبوب ہے جس پر تو ناز کرے اور اے آدم گنہگاروں کی آہ و زاری ہمارے نزدیک نازوالوں کی تسبیح و تہلیل سے بدرجہا بڑھ کر محبوب ہے۔

؎ مرکب تو بہ عجائب مرکبست
برفلک تازد بیک لحظہ زپست
چوں برآرند از پشیمانی انین
عرش لرزد از انین المذنبین

ولی اور رسول میں فرق

ولایت تقویٰ اور طہارت کی ایک سند (ڈگری) ہے جو بندہ کی جدوجہد اور سعی اور اکتساب سے ملتی ہے اور نبوت و رسالت ایک عہدہ اور منصب ہے جو بدون حکم شاہی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ولایت بمنزلہ ایک سند کے ہے کہ جو امتحان سے فراغت کے بعد مل جاتی ہے اور نبوت و رسالت بمنزلہ عہدہ کے ہے محض قابلیت سے خود بخود کوئی وزیر اور سفیر نہیں بن جاتا جب تک حکم شاہی نہ ہو۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولیاء کی تعریف میں حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔ اور رسول کی تعریف میں یوں فرماتے ہیں فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ۔ غرض حاصل ولایت اتقاء ہے۔ (جو بندہ کا فعل ہے) اور اتقاء مبنی للفاعل۔ اتقاء مبنی للمفعول کو مستلزم نہیں۔ تیر اور تلوار سے ہر ایک بچنے کی اپنی سی تدبیر کرتا ہے مگر اس پر بھی کبھی زخمی ہو ہی جاتا ہے اور حاصل رسالت کا ارتضاء ہے کیونکہ من رسول بیان ہے من ارتضیٰ کا۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کا مرتضیٰ ہوتا ہے اور ارتضاء فعل خداوندی ہے کیونکہ ارتضیٰ کا فاعل ضمیر راجع الی اللہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اطاعت سے راضی ہوتے ہیں اور معصیت سے ناخوش۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ

معلوم ہوا کہ رسول کے لیے من کل الوجوہ مرتضیٰ ہونا ضروری ہے اور من کل الوجوہ ارتضا ریہی حاصل معصومیت کا ہے۔ (اجوبۂ اربعین ص۹۱ حصۂ دوم)

فائدہ حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں انبیار کی لغزشوں کو اس لیے بیان فرمایا ہے کہ ان حضرات کی شان اور مرتبہ معلوم ہو کہ یہ حضرات خدا تعالیٰ کے اس درجہ مقرب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر مؤاخذہ ہوتا تھا اور وہ خداوند ذوالجلال کے مؤاخذہ سے لرزاں اور ترساں رہتے تھے حضرات انبیار کی یہ لغزشیں ہی درحقیقت انکی معصومیت کی دلیل ہیں جس شخص کا مرتبہ جس قدر بلند ہوتا ہے اسی قدر اسکی معمولی سی بات بھی غیر معمولی بن جاتی ہے۔

عصمتِ انبیار اور حفاظتِ اولیار میں فرق

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ حضرات انبیار کرام ہر وقت بارگاہ خداوندی میں مقیم رہتے ہیں کسی وقت حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور جلال انکی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیار معاصی سے معصوم ہوتے ہیں اور اولیار اللہ بارگاہ خداوندی میں آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقیم نہیں اس لیے اولیار معاصی سے محفوظ تو ہوتے ہیں مگر معصوم نہیں ہوتے اور عصمت اور حفاظت میں یہ فرق ہے کہ اولیار بسا اوقات مباحات اور جائز امور کو محض حظ نفس اور طبعی میلان اور خواہش کے لیے کرگزرتے ہیں۔ مگر حضرات انبیار کسی وقت بھی طبعی میلان اور حظ نفس کے لیے مباح اور جائز امر کا ارتکاب نہیں فرماتے۔ ہاں جب کسی شئی کی عنداللہ اباحت اور اسکا خدا کے نزدیک جائز ہونا بتلانا مقصود ہوتا ہے تب اس مباح کو استعمال فرماتے ہیں تاکہ امت کو نبی کے کرنے سے اس فعل سے اسکا مباح اور جائز ہونا معلوم ہو جاتے اور جس طرح نبی پر فرض کی تعلیم فرض ہے اسی طرح فعل مباح اور امر جائز کی اباحت اور جواز کا بتلانا بھی فرض ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کو ایک فعل مباح پر بھی فرض ہی کا ثواب اور اجر ملتا ہے اس لیے کہ نبی کے ذمہ مباح کی اباحت کا بتلانا بھی فرض ہے۔

اب ہم حضرات انبیا رعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت کے کچھ دلائل ذکر کرتے ہیں۔ جو زیادہ تر امام فخرالدین رازی قدس اللہ سرہٗ کی تفسیر کبیر سے لیئے گئے ہیں۔

دلائل عصمتِ انبیار کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام

دلیل اوّل قال اللہ تعالیٰ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ جس شخص نے رسول کی اطاعت کی

فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ پس تحقیق اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔
وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

پہلی آیت میں رسول کی اطاعت کو اپنی ہی اطاعت قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی نہیں کہا جاسکتا۔ اطاعت رسول اور اطاعت خداوندی میں اتحاد اور عینیت جب ہی ممکن ہے جب رسول حق جل وعلا کی معصیت کے شائبہ سے بھی بالکلیہ پاک ہو اور تاکید و تحقیق کے لیئے کلمۂ قد کا اضافہ فرمایا تاکہ کوئی شخص اطاعت حق جل شانہٗ اور اطاعت رسول میں کسی قسم کی تفریق نہ قائم کرے۔ کما قال سبحانہ وتعالے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا۔

اور دوسری آیت میں رسول کی علی الاطلاق اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور اس پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم شخص کی اطاعت کا علی الاطلاق کسی طرح حکم نہیں دیا جا سکتا اور اسی وجہ سے کہ خلفاء اور امراء معصوم نہیں۔ علی الاطلاق انکی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ان کی اطاعت کا یہ معیار مقرر ہوا۔

السمع و الطاعۃ حق مالم یؤمر بمعصیۃ فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ (بخاری) امیر کی سننا اور اسکی اطاعت ضروری ہے جب تک معصیت کا حکم نہ کیا جائے۔ اور امیر جب معصیت کا حکم کرے تو پھر اسکی اطاعت نہیں۔

اور جن آیات میں نبی کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے۔ ان میں کسی جگہ مالم یؤمر بمعصیۃ (جب تک معصیت کا حکم نہ دیا جائے) کی قید نہیں اضافہ کی گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی کا کوئی فعل معصیت ہوتا ہی نہیں تاکہ امراء اور خلفاء کی طرح ان کے اتباع میں یہ قید لگائی جائے اور علیٰ ہذا غیر معصوم شخص کی علی الاطلاق اطاعت بلا قید مذکور رحمت خداوندی کا سبب بھی نہیں ہو سکتی۔

دلیل دوم نیز اگر انبیاء کرام معاصی سے معصوم نہ ہوں تو عیاذاً باللہ انبیاء کرام کا غیر مقبول الشہادۃ ہونا لازم آئیگا اس لیے کہ عاصی فاسق ہوتا ہے اور فاسق کی شہادت مقبول نہیں لقولہ تعالے۔ اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا۔ تو پھر قیامت کے دن بمقابلہ اُمم حضرات انبیاء کی شہادت کیسے مقبول ہوگی۔ حالانکہ قرآن عزیز میں ہے کہ ہر نبی قیامت کے دن اپنی امت پر گواہی دے گا۔ کما قال تعالے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ

پس کیا حال ہو گا جب کہ ہم بلائیں گے ہر امت میں سے گواہی دینے والا اور حال کا بیان کرنے والا اور آپ کو ان سب پر گواہ بنائیں گے۔

دلیل سوم

نیز صورت مفروضہ میں نبی کا مستحق عذاب اور مستحق لعنت ہونا لازم آتا ہے جو ایک عاصی اور گنہ گار کا حکم ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

(۱) وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدًا فِيْهَا۔

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو یقیناً اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

(۲) اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔

خبردار! کہ اللہ کی لعنت ہے نافرمانوں پر۔

حالانکہ کوئی نبی کسی کے نزدیک مستحق عذاب اور مستحق لعنت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جو شخص عذاب الٰہی اور لعنت خداوندی کا مستحق ہو وہ نبی اور رسول تو درکنار متقی اور صالح بھی نہیں ہو سکتا۔

دلیل چہارم

نیز حضرات انبیاء کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو حق جل شانہ کی اطاعت کی طرف بلائیں پس اگر وہ خود اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے نہ ہوں تو وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔

کیا تم دوسروں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب اللہ کو پڑھتے رہتے ہو۔ پس کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

کیوں کہتے ہو وہ باتیں جو تم خود نہیں کرتے دوسروں کو کہنا اور خود نہ کرنا یہ اللہ کے نزدیک سخت مذموم اور اس کے غضب اور ناراضی کا سبب ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

حالانکہ یہ بات ایک ادنیٰ واعظ اور معمولی عالم کے لیے بھی مناسب نہیں حضرات انبیاء و مرسلین کی شایان شان تو کیسے ہو سکتی ہے۔

دلیل پنجم

نیز اگر انبیاء کرام سے کبائر و معاصی کا صدور جائز رکھا جائے تو پھر معاذ اللہ انبیاء کو معاصی پر تنبیہ اور زجر و توبیخ اور ایذاء رسانی بھی جائز ہونی چاہیئے جو خدائے عز و جل کے نافرمانوں کے لیے لازم اور ضروری ہے حالانکہ نبی کو کسی قسم کی ایذاء اور تکلیف پہنچانا

دنیا اور آخرت کی لعنت اور عذاب الیم کا سبب ہے کما قال تعالیٰ۔

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔
بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہو۔

(۲) وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔
جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے لیے نہایت ہی دردناک عذاب ہے۔

دلیل ششم نیز انبیاء کرام کا تمام گنہ گاروں سے زائد مستحق عذاب ہونا لازم آئے گا۔ اس لیے کہ انبیاء کا مرتبہ سب سے بلند ہے اس لیے انبیاء سے معصیت کا صدور بھی بہت بڑا سمجھا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ جاریہ پر بمقابلہ حرّہ نصف حد آتی ہے اور زانی محصن پر رجم اور غیر محصن پر فقط جلد ہے۔ اور ازواج مطہرات کے لیے ارشاد ہے۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفْ لَھَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ۔
اے نبی کی عورتو! تم میں سے جو صریح بیحیائی کا کام کرے تو اس کو دوچند مار ہوگی۔

اور ظاہر ہے کہ نبوت اور رسالت سے کوئی اعلیٰ اور ارفع مرتبہ نہیں۔ پس اگر نبیؑ سے بھی معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو پھر نبوت ورسالت کے منصب کے مناسب نبی کو سب سے زائد معذب اور معتوب اور مغضوب خداوندی ماننا لازم آئے گا۔ اور جب نبی ہی معاذ اللہ خدا کا معتوب اور مغضوب ٹھہرا تو پھر مقبول الٰہی کون ہوگا۔

دلیل ہفتم نیز معصیت کا صدور ہمیشہ اتباع شیطان ہی کی وجہ سے ہوتا ہے پس اگر نبی معصوم نہ ہو تو نبی کا متبع شیطان ہونا لازم آئے گا۔ کما قال تعالےٰ۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْھِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّہٗ فَاتَّبَعُوْہُ اِلَّا فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔
اور ابلیس نے ان پر اپنے گمان کو سچ کر دکھایا سوائے تھوڑے سے ایمانداروں کے، لوگ اسکے پیرو ہوئے۔

حالانکہ [illegible] کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ شیطان کے اتباع سے محفوظ رہیں۔

دلیل ہشتم نیز غیر نبی کا نبی سے افضل ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ آیت بالا میں متبعین شیطان سے مؤمنین کے ایک فریق کو مستثنےٰ فرما دیا گیا ہے لہذا یہ فریق جو اتباع شیطان سے محفوظ ہے اگر حضرات انبیاء کا فریق ہے تو اس کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے وہو المراد۔

اور اگر حضرات انبیاء کے سوا کوئی اور جماعت ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ایک گروہ مؤمنین کا ایسا ہے جو اتباع شیطان سے بری ہے مگر عیاذاً باللہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اتباع شیطان سے بری نہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص اتباع شیطان سے بری ہوگا وہ اس شخص سے یقیناً افضل ہوگا جو اتباع شیطان سے بری نہیں کما قال تعالےٰ ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔

دلیل نہم حق تعالےٰ شانہٗ نے بندوں کو دو قسموں پر تقسیم فرمایا ہے ایک حزب الشیطان یعنی شیطان کا گروہ کما قال تعالےٰ ۔

اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطَانِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطَانِ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَ۔	یہ شیطان کا گروہ ہے آگاہ ہو جاؤ شیطان کے گروہ والے ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔

دوسرے حزب اللہ یعنی اللہ کا گروہ۔ کما قال تعالےٰ ۔

اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔	یہ اللہ کا گروہ ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہی کا گروہ کامیاب ہوتا ہے ۔

لہٰذا اگر نبی سے معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو نبی کا عیاذاً باللہ بجائے حزب اللہ اور مفلحین کے حزب الشیطان اور خاسرین کی جماعت اور گروہ میں شمار کرنا لازم آئے گا۔

دلیل دہم حق تعالےٰ شانہٗ نے خود ابلیس سے نقل فرمایا ہے کہ میرے اغواء سے تیرے مخلص بندوں کا گروہ مستثنیٰ ہے کما قال تعالےٰ ۔

فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ۔	قسم ہے تیری عزت کی سوائے عباد مخلصین کے سب کو گمراہ کروں گا۔

☆ ☆ ☆ ☆

اور من کل الوجوہ۔ عباد مخلصین کا مصداق صرف حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان میں ہے۔ اِنَّآ اَخْلَصْنٰھُمْ بِخَالِصَۃٍ ذِکْرَی الدَّارِ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ۔

دلیل یازدہم حق تعالےٰ شانہٗ نے جا بجا قرآن عزیز میں انبیاء کرام کا بلا کسی تخصیص کے مصطفیٰ اور مجتبےٰ ہونا ذکر فرمایا ہے یعنی یہ نبی ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ یہ کسی جگہ نہیں فرمایا۔ کہ فلاں امر اور فلاں صفت میں یہ ہمارے برگزیدہ ہیں۔ یا فلاں وصف کے اعتبار سے یہ ہمارے منتخب بندے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات کسی خاص صفت یا کسی خاص فعل کے لحاظ سے برگزیدہ نہیں بلکہ تمام افعال و اقوال کے اعتبار سے

منتخب اور برگزیدہ ہیں کما قال تعالٰے۔

وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۔ اور تحقیق وہ ہمارے نزدیک منتخب اور چنے ہوئے اور نیک لوگوں میں سے ہیں

اور ظاہر ہے کہ من کل الوجوہ خدا کا برگزیدہ اور پسندیدہ مصطفےٰ اور مجتبےٰ ہونا صدور معاصی کے بالکل منافی اور مباین ہے۔

دلیل دوازدہم نیز حق تعالےٰ شانہ نے حضرات انبیاء کی یہ شان ذکر فرمائی ہے۔

يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ ۔ وہ بھلائیوں اور نیک کاموں میں نہایت تیز رو ہیں۔

اور الخیرات کو معرف بلام الاستغراق ذکر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام سے سوائے خیر محض کے کسی امر کا صدور ہوتا ہی نہیں۔

دلیل سیزدہم ہر عاصی اور گنہ گار کو شرعًا اور عرفًا ظالم کہنا جائز ہے اور قرآن عزیز میں بکثرت خدا کے نافرمانوں کو ظالم کہا گیا ہے، لہٰذا اگر نبیؑ سے بھی معاصی کا صدور جائز ہو تو نبیؑ کو بھی معاذ اللہ ظالم کہنا جائز ہوگا۔ حالانکہ ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہوسکتا۔ کما قال تعالٰے

لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۔ میرا منصب ظالموں کو نہیں ملتا۔

کیونکہ اس آیت میں اگر عہد سے نبوت و رسالت مراد ہے تو صاف ظاہر ہے کہ گنہ گار اور ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ولایت یا امامت ہے تب بھی مدعا حاصل ہے اس لیے کہ جب امامت اور ولایت جس کو نبوت و رسالت سے وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہے جب وہی ظالم اور عاصی کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ تو نبوت و رسالت کا عظیم الشان اور جلیل القدر منصب کہاں حاصل ہوسکتا ہے۔

دلیل چہاردہم قال اللہ تعالٰے

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ ۔ اسی نے ان پڑھوں میں ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور انکو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک اور صاف کرتا ہے۔

پس اگر نبیؑ خود معصیت سے پاک نہیں تو وہ دوسروں کو کیسے مزکی اور پاک اور مطہر یعنی پاک اور صاف بنا دیتا ہے۔

دلیل پانزدہم نیز نبیؑ تو اللہ جل جلالہٗ کی جانب سے امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور حق تعالٰے

شانہٗ کی اطاعت اور اخلاق خداوندی کا بہترین نمونہ ہوتا ہے تاکہ لوگ بے چون وچرا اس کا اتباع کریں اور اس کی ہر حرکت اور سکون اور اسکے ہر قول اور فعل کو اپنے لیے راہ عمل سمجھیں۔ کما قال تعالیٰ۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا۔	تمہارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے انکو دیکھ کر اللہ کی اطاعت کرو۔ یہ اس کے لیے ہے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرے اور اللہ کو بہت یاد کرے۔

اور اخلاق خداوندی اور اطاعت ربّانی کا نمونہ اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے اسوۂ حسنہ وہی شخص ہوسکتا ہے جو حق جلّ وعلا کی معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور منزہ ہو۔

دلیل شانزدہم کوئی شخص اگر نبیؑ اور پیغمبر کی موجودگی میں کوئی کام کرے اور نبیؑ اس فعل پر سکوت کرے تو نبیؑ کا یہ سکوت بالاجماع اس فعل کے جواز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ پس جب نبیؑ کا سکوت ہی اس فعل کو معصیت سے خارج کرکے جواز اور اباحت کی حد میں داخل کردیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نبی کا فعل معصیت سے خارج نہ ہو۔

دلیل ہفدہم بعض لوگوں نے جب اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ۔	اے محمدؐ آپ یہ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تمکو محبوب رکھے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کریگا۔

اللہ نے اس آیت میں آپکے اتباع کو اپنی محبت کا معیار قرار دیا ہے۔ اور پھر آپکی اتباع پر دو وعدے فرمائے ہیں۔

ایک یہ کہ اگر تم ہمارے نبی کا اتباع کروگے تو ہم تم کو محبوب بنالیں گے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گناہوں کی مغفرت کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت کا معیار ایسے ہی شخص کا اتباع ہوسکتا ہے جو معصوم ہو ورنہ ایک عاصی اور گنہگار کا اتباع محبت خداوندی کا معیار کیسے بن سکتا ہے اور نہ محبت الٰہی اور مغفرت ذنوب کا سبب ہوسکتا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي

ہم نے کہا تم اترو یہاں سے سارے پھر کبھی پہنچے تم کو میری

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

طرف سے راہ کی خبر تو جو کوئی چلا میرے بتائے پر نہ ڈر ہو گا

يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ

انکو اور نہ انکو غم اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری نشانیاں وہ

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾

ہیں دوزخ کے لوگ وہ اسی میں رہ پڑے

اعادۂ حکم ہبوط

قال تعالیٰ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ...... الیٰ ...... هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ہ

گزشتہ آیت میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ کا قبول ہونا ذکر فرمایا اب آئندہ آیات میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ توبہ قبول ہونے کے بعد بھی آدم علیہ السلام کو بہشت میں آنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ دنیا میں ہدایت اور حضرات انبیاء و مرسلین کی بعثت کا سلسلہ جاری کرنا ہے تاکہ اطاعت اور نافرمانی کا مادہ ظہور میں آجائے۔ چنانچہ ہم نے انکو حکم دیا کہ تم فی الحال اسی جگہ رہو جہاں تم کو بہشت سے اتارا گیا ہے، یعنی فی الحال دنیا ہی میں رہو۔ سردست بہشت میں جانے کی اجازت نہیں، تم سب کے سب فی الحال اسی جگہ رہو اس لیے کہ اگر تم کو اسی وقت بہشت میں جانے کی اجازت دی جائے تو سب کا اجتماع ایک جگہ نہ رہے گا، تمہارا یکجائی اجتماع مبدل بہ تفرقہ ہوجائیگا۔ حضرت آدمؑ کی پیروی کرنیوالوں کو بہشت میں پہنچا دیا جائیگا اور بدوں اور بدکاروں کو یا تو یہیں چھوڑ دیا جائیگا یا پھر دوزخ میں بھیجدیا جائیگا اور یہ تفرقہ مقصود اور غرض کے منافی ہے۔ اتارنے سے مقصود تکلیفِ احکام اور اطاعت اور فرمانبرداری کا امتحان ہے پس زمین میں اتارنے سے مقصد ہی یہ ہے کہ امر و نہی کے ذریعہ سے تمہارا امتحان کریں۔ پس اے اولاد آدم خوب سمجھ لو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے، پس جو لوگ میری ہدایت کا اتباع کریں گے ان پر نہ آئندہ کا کوئی ڈر ہوگا کہ مثلاً یہاں سے نکالے جائیں اور نہ گزشتہ پر وہ مغموم و محزون ہوں گے مثلاً یہ حسرت کہ ہم سے فلاں راحت اور لذت فوت ہوگئی وہاں پہنچ کر ایسی لذتیں اور مسرتیں ہیں کہ دنیا کی ساری لذتیں اور مسرتیں انکے سامنے ہیچ ہو جائیں گی۔

ف پہلی بار ہبوط کا حکم جنت سے اترنے کے لیے تھا اور دوسری بار ہبوط کا حکم زمین

میں مقیم رہنے کے لیے ہے۔

ف خدا کی ہدایت پر چلنے والوں کو اس قسم کا خوف نہ ہو گا جیسا کہ مجرمین اور نافرمانوں کو ہوتا ہے کہ دیکھیے اس جرم کی اب کیا سزا ملتی ہے۔ اس آیت میں اس قسم کے خوف کی نفی مراد ہے۔ باقی حق تعالےٰ شانہٗ کی عظمت اور جلال کا خوف وہ سب پر طاری ہو گا انبیاء و مرسلین بھی خدا کی عظمت اور جلال سے کانپتے ہوتے ہوں گے نیز اس آیت میں بالکلیہ خوف کی نفی نہیں کی گئی بلکہ خوف کے احاطہ اور استیلاء کی نفی کی گئی ہے۔ اس لیے کہ کلمۂ علیٰ کلام عرب میں استیلاءً اور احاطہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ پس فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ خوف ان پر غالب اور ان کو محیط نہ ہو گا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر خوف اگرچہ غالب نہ ہو مگر کسی نہ کسی قسم کا خوف ضرور ہو گا۔ وہ خوف خدا کی عظمت اور جلال کا ہے۔ نیز اس میں کافروں کی طرف تعریض بھی ہے کہ قیامت کے دن خوف ان کو محیط ہو گا۔ اور ڈر اور اندیشہ ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہو گا۔ بخلاف اہل ایمان کے کہ ان پر خوف غالب نہ ہو گا۔ اور جو لوگ میری ہدایت سے منکر ہوتے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ایسے ہی لوگ جہنم والے ہیں ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ کبھی بھی اس سے نہ نکلیں گے کما قال تعالیٰ۔ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ۔

ہبوط آدم علیہ السلام کے اسرار و حکم

گزشتہ آیت یعنی فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ اور اس کی اجابت کا ذکر تھا کہ ہم نے آدم کی توبہ قبول کی تو ممکن ہے اس سے یہ شبہ ہو کہ ہبوط اور زمین پر اترنے کا حکم لغزش کی وجہ سے تھا شاید قبول توبہ کے بعد وہ حکم باقی نہ رہے۔ اس لیے ہبوط کے حکم کا پھر اعادہ فرمایا۔ اگرچہ توبہ قبول ہو چکی مگر یہ حکم بحالہ باقی ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ہبوط کا حکم لغزش کی وجہ سے نہیں تاکہ قبول توبہ سے اسکے منسوخ ہونے کا خیال یا شبہ کیا جائے بلکہ وہ حقیقت میں إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً کا وعدہ پورا کرنے کے لیے ہے زمین کی خلافت جسکا حضرت آدمؑ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ خود اس کو مقتضی ہے کہ ان کو زمین پر اتارا جائے حضرت آدم سے جنت کی خلافت کا وعدہ نہ تھا بلکہ زمین کی خلافت کا وعدہ تھا اس لیے ہبوط کا حکم قبول توبہ کے بعد بھی برقرار رہا۔ **بعض** عارفین سے یہ منقول ہے کہ جب حضرت حق جل شانہٗ نے حضرت آدم اور حوا کو یہ خطاب فرمایا۔ لَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ۔ تو اس خطاب میں خود اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت آدمؑ اس خطا میں مبتلا ہو کر جنت سے علیحدہ ہوں گے۔ اور جنت کی یہ سکونت چند روزہ ہے دائمی نہیں چنانچہ

وَ یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ ۔ خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت چند روز کے لیے دارِ سکونت ہے نہ کہ دارِ اقامت اس لیئے کہ ہمیشہ رہنے والے کے لیے امر و نہی حظر و اباحت (روک ٹوک) کے احکام نہیں جاری ہوتے اسکے علاوہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتارنے میں اور بھی بہت حکمتیں ہیں۔ منجملہ انکے ایک یہ ہے کہ حق تعالےٰ شانہ کے اسمارِ حسنیٰ میں سے غفور اور رحیم۔ عفوّ اور علیم۔ خافض اور رافع۔ معزّ اور مذلّ بھی ہیں۔ اس لیے حق تعالےٰ شانہٗ کی حکمت بالغہ اسکو مقتضی ہوئی کہ کوئی دار اور محل ایسا ہونا چاہیئے جس میں ان اسمارِ حسنیٰ اور صفاتِ عُلیٰ کے آثار ظاہر ہوں جس کے لیے چاہے مغفرت کرے اور جس پر چاہے رحم کرے جسکو چاہے پست کرے اور جس کو چاہے بلند کرے، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے اس لیے حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کو جنت سے زمین پر اتارا تاکہ ان اسمارِ حسنیٰ کے آثار ظاہر ہوں جنکے ظہور کے لیے دارِ دنیا ہی مناسب ہے نہ کہ دارِ آخرت۔

نیز حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پشت میں وہ لوگ بھی تھے جو جنت میں رہنے کے اہل نہ تھے۔ حضرت آدم کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں نیک و بد ہر قسم کے لوگ سوار تھے۔ اس لیے دنیا میں اترنے کا حکم ہوا تاکہ خبیث کو طیب سے اور شقی کو سعید سے اور مومن کو کافر سے جدا اور الگ کیا جائے اور پھر خبیثین کو دار الخبیثین یعنی جہنم میں اور طیبین کو دار الطیبین یعنی جنت میں بسائے کما قال تعالےٰ۔

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے جدا کر دے۔

اور تاکہ ان اشقیار اور خبیثین کے مقابلہ میں انبیار و مرسلین اور عباد صالحین کا سلسلہ جاری ہو۔ دوستوں کا دشمنوں کے ذریعہ امتحان ہو۔ حبّ اللہ کے مخلص بندے اس کی راہ میں جان و مال کو خرچ کریں۔ اور اسکے دشمنوں سے اسکا کلمہ بلند کرنے کے لیے جہاد و قتال کریں۔ جانبازی اور سرفروشی سے کسی قسم کا دریغ نہ کریں خدا کے دوستوں سے دوستی اور اسکے دشمنوں سے دشمنی کریں تو حق تعالےٰ شانہ ان کو درجات عالیہ اور اپنے تقرب اور رضا و خوشنودی سے سرفراز فرمائے۔

نبوت و رسالت، امامت اور خلافت شہادۃ فی سبیل اللہ اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ خدا کے دوستوں سے محبت اور موالات۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت اور بیزاری اور دشمنی اور معادات یہ تمام فضائل و کمالات زمین ہی پر اتارے جانے کے نتائج و ثمرات ہیں۔ جنت میں رہ کر یہ باتیں کہاں ممکن تھیں

ہبوط آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسرار و حکم کی اگر تفصیل درکار ہے تو حافظ شمس الدین ابن قیم قدس اللہ سرہٗ کی تصنیف لطیف یعنی مفتاح دار السعادۃ کا مطالعہ فرمائیں۔ حافظ موصوف

مدارج السالکین میں فرماتے ہیں۔

یا آدم انما ابتلیتک بالذنب لانی احب ان اظہر فضلی وجودی وکرمی علی من عصانی۔ لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم و لجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفر لھم یاآدم اذا عصمتك و عصمت بنیك من الذنوب فعلی من اجود بحلمی و علی من اجود بعفوی و مغفرتی و توبتی وانا التواب الرحیم یاآدم لا تجزع من قولی لك (اخرج منھا) فلك خلقتھا ولکن اھبط الی دار المجاھدۃ و ابذر بذر التقوی وامطر علیہ سحائب الجفون فاذا اشتد الحب و استغلظ و استوی علی سوقہ فتعال فاحصدہ یا آدم ما اھبطتك من الجنۃ الا لتوسل الیّ فی الصعود وما اخرجتك منھا نفیاًلك عنھا ما اخرجتك عنھا الا لتعود۔

اے آدم میں نے تجھ کو گناہ میں مبتلا کیا اس لیے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فضل اور جود وکرم کو گنہ گاروں پر ظاہر کروں حدیث میں ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمکو فنا کردیتا اور ایسی قوم کو پیدا کرتا جو گناہ کرکے خدا سے مغفرت طلب کرتے اور خدا ان کی مغفرت فرماتا اے آدم تجھ کو اور تیری ذریت کو اگر معصوم بنادوں تو اپنا حلم اور عفو وکرم اور مغفرت اور معافی کس پر ظاہر کروں حالانکہ میں تو رحیم ہوں۔ پس ضرور ہے کہ گنہ گار موجود ہوں تاکہ میں انکی توبہ قبول کروں اور ان پر رحم کروں۔ اے آدم میرے (اخرج منھا) کہنے سے گھبراؤ مت اس لیے کہ جنت کو میں نے تیرے ہی لیے پیدا کیا ہے لیکن اس وقت تم مجاہدہ اور ریاضت کے لیے زمین پر اترو جو تمہارے لیے بمنزلہ خانقاہ یا غار کے ہے اور زمین آسمان کے اعتبار سے بمنزلہ غار ہی کے ہے۔ اور یہاں تخم تقویٰ کے تخم کی کاشت کرو اور چشم گریاں کی بارش سے اس کو سیراب کرو۔ جب یہ دانہ قوی اور مضبوط ہو جائے اور اپنے تنے پر کھڑا ہو جائے تو اسکو کاٹ لو۔ اے آدم تجھ کو اس لیے جنت سے اتارا تاکہ تیرے درجات اور مدارج اور بلند ہوں۔ اور جنت سے چند روزہ

✧ ✧ ✧ ✧

شعر

ان جری بیننا و بینك عتب
و تناءت منا و منك الديار
فالوداد الذی عهدت مقیم
والعثار الذی اصبت جبار
(مدارج السالکین ص ۱۶۶ ج ۱)

ترجمہ شعر - اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں کوئی رنجش پیش آگئی ہے اور اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں منزلوں کا فصل ہو گیا ہے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں اس لیے کہ محبت و مودت کا تعلق اسی طرح باقی ہے۔ اور جو لغزش تم سے ہو گئی ہے اُس کا تدارک ہو سکتا ہے

کے لیے اس لیے نکالا تاکہ اس سے بہتر حالت میں جنت کی طرف تو لوٹ کر آئے۔

فوائد مستنبط از قصۂ آدم صلی اللہ علیٰ نبینا وعلیہ وبارک وسلم وشرف وکرم

ف ۱ قرآن کریم کے ظاہر سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی اور رسول مکلّم ہیں یعنی ایسے رسول ہیں جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا چنانچہ حدیث میں ہے۔

اخرج الطبرانی و ابو الشیخ فی العظمة و ابن مردویه عن ابی ذر قال قلت یارسول الله ارایت آدم أنبیاً کان قال نعم کان نبیا رسولا کلمه الله قبله قال یا آدم اسکن انت و زوجك الجنة۔ و اخرج عبد بن حمید و الآجری فی الاربعین عن ابی ذر قال یا رسول الله من کان اولهم یعنی الرسل قال آدم قلت یا رسول الله انبی مرسل قال نعم خلقه الله بیده

طبرانی اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں اور ابن مردویہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا حضرت آدم نبی تھے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں نبی بھی تھے اور رسول بھی جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا اور یہ کہا کہ یَا اٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ۔ اور عبد بن حمید اور آجری نے اربعین میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یارسول اللہ سب سے پہلے رسول کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ آدم۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ حضرت آدم کیا نبی مرسل تھے۔ فرمایا کہ ہاں اللہ نے

و نفخ فیہ من روحہ و سواہ قبلہ۔ (کذا فی الدر المنثور ص ۵۱ ج ۱) | ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی خاص روح ان میں پھونکی اور پھر ان کو ٹھیک بنایا۔

ف ۲ افعالِ خداوندی کے اسرار و حکم سوائے اس علیم و حکیم کے کسی کو معلوم نہیں۔ ملائکہ مقربین کو بھی سوائے سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔ کہنے کے کوئی چارہ نہ ہوا۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ افعالِ خداوندی کے اسرار کے درپے نہ ہو۔ ملائکہ کی طرح سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ۔ کہہ کر بے چون و چرا تسلیم کرے۔

کرا زہرۂ آں کہ از بیم تو ۔۔۔ کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زبان تازہ کردن باقرارِ تو ۔۔۔ نینگیختن علت از کارِ تو

ف ۳ حضرت آدم کی پیدائش سے پہلے ہی ملائکہ کے سامنے حضرت آدمؑ کی خلافت کا ذکر کچھ تعلیم مشورہ کی جانب مشیر معلوم ہوتا ہے کہ کام کرنے سے پہلے مشورہ کر لینا چاہیئے۔ اگرچہ حق تعالیٰ مشورہ سے بے نیاز ہے۔

ف ۴ استحقاقِ خلافت کے لیے جب ملائکہ نے نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ کہہ کر تسبیح و تحمید، تقدیس و تمجید کو پیش کیا تو حق جل شانہٗ نے ملائکہ کے تسبیح و تقدیس کے جواب میں حضرت آدمؑ کا علمی کمال ظاہر فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم میں مشغول ہونا تسبیح و تہلیل سے افضل اور بہتر ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ علم اللہ کے نزدیک بھی علم ہو۔ اللہ کے نزدیک علم وہ ہے جس سے خدا کی خشیۃ اور اسکی عظمت دل میں راسخ ہوتی ہو کما قال تعالیٰ

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ | جز ایں نیست کہ ڈرتے ہیں اللہ سے اسکے بندوں میں سے صرف علماء۔

معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہو اور جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ اللہ کے نزدیک عالم نہیں اگرچہ سارا عالم اسکو عالم کہے۔ علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است۔

ف ۵ ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ مسجود ساجد سے افضل ہوتا ہے۔

ف ۶ حدیث میں ہے کہ جب فرشتے صبح اور عصر کی نماز سے یا کسی محفل ذکر سے لوٹ کر جاتے ہیں تو حق تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا تو عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھتے چھوڑا۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک بار کہا تھا۔ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ اور کلمہ مَنْ عام ہے جسکا مطلب یہ ہوا کہ سب ایسے ہی ہوں گے تو فرشتے موجبہ کلیہ کے مدعی تھے، انکے جواب کے لیے سالبہ جزئیہ کا ذکر کافی ہو گیا یعنی

ایک شخص یا ایک جماعت کا پیش کر دینا جو اللہ کی مطیع کامل ہو اُنکے موجبہ کلیہ توڑنے کے لیے کافی ہے یہ ضروری نہیں کہ سارے ہی مطیع ہوں قیامت تک اسی طرح سؤال وجواب ہوتا رہے گا۔

ف ۷ اعجاب اور استکبار اور اللہ جل جلالہٗ کے حکم پر اعتراض اور خود ستائی نے ابلیس کو ملعون اور مطرود بنایا اور اطاعت اور انقیاد اور رضا وتسلیم اور عجز اور انکساری اور ندامت اور شرمساری اور توبہ اور استغفار نے حضرت آدمؑ کی شان کو بڑھایا۔

ف ۸ نیز اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جنت پیدا ہو چکی ہے جیسا کہ اہل سُنّت والجماعت کا مسلک ہے معتزلہ کہتے ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔

ف ۹ کافر ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے کبھی نجات نہ پائیں گے۔

ف ۱۰ غلطی سے خلافِ حکمِ خداوندی کوئی کام کر گزرنا معصیت ہے اور حکمِ خداوندی کو غیر معقول اور خلاف سمجھنا یہ کفر ہے۔

(۱۱) فائدہ جلیلہ

ترک اطاعت اور ارتکاب معصیت میں فرق

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترک امر یعنی امر الٰہی کا امتثال نہ کرنا اور حکمِ خداوندی کو نہ ماننا ارتکاب نہی سے زیادہ سخت ہے۔ ابلیس نے حکمِ الٰہی اور امرِ خداوندی یعنی حکم سجود سے انحراف کیا۔ مطرود و مردود ہوا اور آدم علیہ السلام نے ایک نہی کا ارتکاب کیا یعنی جس درخت سے کھانے کی انکو ممانعت کی گئی تھی اس کو کھایا، بارگاہِ خداوندی سے عتاب ہوا۔ حضرت آدم کو اس عتاب کی کہاں تاب تھی فوراً ہی توبہ اور استغفار کی اور صد ہزار گریہ وزاری کے ساتھ اپنے رب کریم سے عفو اور مغفرت کی درخواست کی اللہ نے اپنی رحمت سے توبہ قبول فرمائی اور حُلّۂ اجتبار واصطفار سے سرفراز فرمایا۔

اوّل یہ کہ ترک امر کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے اس لیے زیادہ سخت ہے کہ ارتکاب نہی کا منشار ہمیشہ غلبہ شہوت ہوتا ہے اور ترک امر کا منشار ہمیشہ استکبار اور اعجاب (خود پسندی) ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ جس کے قلب میں ذرا برابر بھی کبر یعنی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں، کبریائی میری ردار ہے اور عظمت میری ازار ہے، جو شخص اس میں میری منازعت کرتا ہے میں اسکو کچل ڈالتا ہوں۔ بخلاف اس شخص کے کہ جو ایمان لانے کے بعد شہوات میں منہمک رہا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ

جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہا وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ اگرچہ وہ چوری اور زنا کرے۔

دوم ۔ یہ کہ اللہ کے نزدیک امتثال امر اور فعل مامور بہ یعنی حکم الٰہی کا بجالانا بہ نسبت منہیات سے احتراز اور اجتناب کے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے جیساکہ حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ کے نزدیک اپنے وقت پر نماز کا ادا کرنا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ خیر الاعمال یعنی سب سے بہتر عمل ذکر اللہ ہے۔ اسی وجہ سے حق جل شانہ نے جابجا قرآن کریم میں اپنی محبت کو امتثال احکام اور اوامر کی بجا آوری پر معلق فرمایا ہے۔ کما قال تعالٰی۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا۔ وقال تعالٰی وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ وقال تعالٰی وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ وقال تعالیٰ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ۔ ان آیتوں میں اللہ نے اپنی محبت کو ان لوگوں کے لیے مخصوص فرمایا ہے جو اس کے ان احکام اور اوامر کو بجالاتے ہیں۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ احسان۔ عدل۔ و اقساط۔ صبر و تحمل یہ سب اللہ کے احکام ہیں۔ ان کی بجاآوری سے اسکی محبت حاصل ہوتی ہے اور محظورات اور منہیات کو حق جل شانہ نے جب کبھی ذکر فرمایا ہے تو محبّت کی نفی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ کما قال تعالٰی وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ و قال تعالٰی وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ و قال تعالٰی وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ و قال تعالیٰ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ و قال تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔

سوم : یہ کہ اوامر و احکام کی تعمیل مقصود لذاتہٖ ہے اور منہیات سے بچنا مقصود بالذات نہیں بلکہ فعل مامور بہ کی تکمیل کے لیے ہے اس لیے کہ منہیات اور محظورات کا ارتکاب، عبادت اور بندگی اور احکام کی بجا آوری میں مخل ہے۔ چنانچہ حق جل شانہ نے تحریم خمر اور تحریم قمار کی علت یہ ذکر فرمائی ہے

یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ۔	شراب اور قمار اللہ کے ذکر اور نماز سے تمکو روکتے ہیں پس کیا تم ان سے باز نہ آؤ گے۔

چہارم :۔ یہ کہ طاعات اور ماموارت کی بجاآوری ہی روح کی غذا ہے۔ بغیر ایمان و تسلیم اور بغیر اطاعت اور انقیاد کے روح کی حیات ناممکن ہے اور محظورات و منہیات سے بچنا بمنزلہ پرہیز کے ہے۔ پرہیز اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ حیات اور قوت میں فتور نہ آئے۔ اصل مقصود حیات اور پرہیز حیات کی نگہبانی کے لیے ہے۔

پنجم :۔ یہ کہ عبادت جس کے لیے جن وانس کو پیدا کیا گیا۔ وہ امتثال اوامر اور احکام خداوندی

کی بجا آوری ہی کا نام ہے جن والنس کو فقط منہیات اور محظورات سے بچنے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا (بلکہ عبادت اور بندگی اور احکامِ خداوندی کی تعمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے) زنا اور سرقہ وغیرہ سے باز رہنے کا نام عبادت نہیں بلکہ جو حکم اس احکم الحاکمین نے دیا اسکو دل وجان سے بجالانے کا نام عبادت اور بندگی ہے۔

ششم : یہ کہ ایک حکم کی تعمیل سے دس گونہ سے لیکر سات سو گونہ بلکہ لا الی نہایتہ ثواب ملتا ہے اور منہی عنہ کے ارتکاب سے صرف ایک گناہ لکھا جاتا ہے، اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ترک امر اور عدم تعمیل حکم کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے کس قدر اعظم ہے۔

ہفتم : یہ کہ طاعت اور عبادت اور احکام کی بجا آوری اور ان کا اجر و ثواب تمام تر صفت رحمت سے متعلق ہے، اور محظورات و ممنوعات کا ارتکاب اور ان پر سزا اور عقاب یہ سب صفت غضب اور انتقام سے متعلق ہے، اور صفت رحمت صفت غضب پر سابق ہے غضب، رحمت پر سابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نزدیک رحمت عذاب سے اور عفو انتقام سے زیادہ محبوب ہے۔ وقال تعالٰے۔

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ لیا ہے یعنی لازم کرلیا ہے۔

مگر اس ارحم الراحمین نے غضب کو اپنے اوپر لازم نہیں فرمایا۔ وقال تعالٰے۔

وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً	اللہ ہر چیز کو باعتبار رحمت کے محیط ہے

مگر غضب اور انتقام کے اعتبار سے محیط نہیں۔ رحمت اسکی دائمی ہے کبھی منفک نہیں ہوتی مگر غضب دائمی نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز فرمائیں گے۔

ان ربی قد غضب الیوم غضبا لم یغضب قبلہ مثلہ و لن یغضب بعدہٗ مثلہ۔	میرا پروردگار آج غصہ ہوا ہے ایسا غصہ ہوا کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غصہ ہوا اور نہ اس کے بعد کبھی ایسا غصہ ہوگا۔

ہشتم : یہ کہ طاعت و عبادت کے آثار جلد زائل نہیں ہوتے۔ بخلاف منہیات و محظورات کہ ان کے آثار بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں۔ معاصی اور سیئات کے آثار کبھی عفو اور مغفرت سے اور کبھی توبہ اور استغفار سے زائل ہو جاتے ہیں کبھی اعمال صالحہ اور مصائب سے انکا کفارہ ہو جاتا ہے اور کبھی شفاعت سے اور کبھی اقارب اور احباب کی دعاؤں سے ان معاصی سے درگزر کیا جاتا ہے اور اگر صمیم قلب اور اخلاص کے ساتھ توبہ کرے تو ان سیئات کو حسنات سے بدل

دیا جاتا ہے۔

نہم: یہ کہ نجات کا دارو مدار احکام کی بجا آوری پر ہے۔ اگر کوئی شخص تمام مناہی اور محظورات سے بچتا ہے مگر احکام خداوندی کو نہیں مانتا تو اس کی نجات ناممکن ہے۔ اور اسکے برعکس اگر کوئی شخص احکام خداوندی کو تسلیم کرتا ہے مگر زنا اور سرقہ اور کسی فحشاء اور منکر سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی نجات ممکن ہے۔

دہم: یہ کہ اوامر اور احکام سے کسی فعل کا وجود مطلوب ہوتا ہے اور نہی سے کسی شئے کا عدم اور ترک مقصود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ عدم میں کوئی کمال نہیں۔ کمال وجود اور ایجاد ہی میں ہے اسی وجہ سے شریعت کی نظر میں اوامر کا امتثال مناہی کے اجتناب سے زیادہ بہتر ہے اور حکم خداوندی سے سرکشی کرنا منہی عنہ کے ارتکاب سے زیادہ جرم ہے تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۔ کذا فی کتاب الفوائد صہ ۱۱۹ للحافظ ابن القیم قدس اللہ سرہ۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے کیا

عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ

تم پر اور پورا کرو قرار میرا تو میں پورا کروں قرار تمہارا اور

اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ

میرا ہی ڈر رکھو اور مانو جو کچھ میں نے اتارا

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪ وَ

سچ بتاتا تمہارے پاس والے کو اور مت ہو تم پہلے منکر اس کے اور

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو

لے مترجم گوید خدا تعالیٰ بنی اسرائیل را نعمتہائے خود یاد داد و معجزہا کہ دریں قوم ظاہر شدہ بود ذکر فرمود آنگاہ شبہات و ہفوات ایشاں را رد کرد بدلائل و ایں قصہ ممتد است تا قولہ تعالیٰ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ ۱۲۔ فتح الرحمٰن

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ
اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور یہ کہ چھپاؤ سچ کو
تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ
جان کر اور کھڑی کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور
ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ
جھکو ساتھ جھکنے والوں کے کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام
وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا
کا اور بھولتے ہو آپ کو اور تم پڑھتے ہو کتاب پھر کیا
تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَ
نہیں بوجھتے اور قوت پکڑو محنت سہارنے سے اور نماز سے اور
اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ
البتہ وہ بھاری ہے مگر انہیں پر جنکے دل پگھلے ہیں جن کو خیال ہے کہ ان
اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾
کو ملنا ہے اپنے رب سے اور ان کو اسی طرف الٹے جانا ہے

تذکیر اجمالی انعامات خاصہ بر اسلاف یہود و امر ایشاں بایفار عہود و نہی از دین فروشی و حق پوشی

(یعنی) اُن نعمتوں کا بیان جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں۔

قال تعالیٰ ۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ ... الیٰ ... وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

لہ یعنی در جمیع حاجات و مصائب واللہ اعلم ۔ فتح الرحمٰن

(ربط) شروع سورت میں حق تعالیٰ نے متقین اور کافرین اور منافقین کے اوصاف اور احوال بیان کیے۔ بعد ازاں یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا۔ میں خطاب عام فرمایا اور کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا پھر توحید اور رسالت اور قیامت کے دلائل بیان کیے تاکہ عبادت کر کے آخرت کی تیاری کر سکیں بعد ازاں اپنے انعامات کو بیان کیا جو تمام بنی آدم کو عام اور شامل ہیں اب عنان خطاب ایک خاص گروہ یعنی بنی اسرائیل کی طرف پھیرتے ہیں اور اُن نعم خاصہ کو بیان کرتے ہیں جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں اور منجملہ دیگر قبائل عرب۔ گروہ بنی اسرائیل کو اس لیے خطاب کے لیے مخصوص فرمایا کہ یہ سورت پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی اور مدینہ میں یہود ایک کثیر تعداد میں آباد تھے یہود کو اگرچہ اَوس اور خزرج اور دیگر قبائل عرب کے مقابلہ میں عددی اکثریت حاصل نہ تھی لیکن یہود کو دیگر قبائل کے مقابلہ میں علمی تفوق اور امتیاز حاصل تھا یہ لوگ اہل کتاب اور اہل علم کہلاتے تھے اور خاندان نبوت سے تھے اور مشرکین عرب اُمّی اور ان پڑھ تھے اور اہل علم اگر حق کو قبول کرلیں تو عوام پر اسکا بہت اثر پڑتا ہے اس لیے اس رکوع میں خاص بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا اور اولاً ان نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا جو اس خاندان پر مبذول ہوئی تھیں۔ اور دوسرے رکوع سے ان کی تفصیل فرمائی جو دور تک چلی گئی اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل ان نعمتوں کو یاد کر کے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور اپنے رب کریم اور منعم قدیم کے الطاف وعنایات کو یاد کر کے ایفاء عہد کے لیے دل وجان سے تیار ہو جائیں کیونکہ توریت میں نبی آخرالزمان کی بشارتیں اور صفتیں مذکور تھیں اور نبی آخرالزمان پر ایمان لانے کے عہد کا بھی ذکر تھا اور علماء یہود اس سے بخوبی واقف تھے اس لیے مناسب ہوا کہ اولاً اہل علم کو اسلام کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ اور لوگ بھی انکی تقلید سے راہ حق پر آجائیں اور انکا اتباع اوروں کے لیے حجت بن جائے اور بنی اسرائیل کے خطاب سے پہلے حضرت آدم کا قصہ ذکر کیا جس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ابلیس نے محض حسد اور تکبر کی وجہ سے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو یعنی یہود کو خطاب کیا تاکہ متنبہ اور خبردار ہو جائیں کہ تم کو تکبر اور حسد کا انجام معلوم ہے لہٰذا تم کو چاہیئے کہ تکبر اور حسد کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع سے اعراض نہ کرو

چنانچہ فرماتے ہیں اے فرزندان یعقوب یاد کرو تم میری ان خاص[1] نعمتوں کو جنکا میں نے خاص تم پر انعام کیا۔ اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے جو اِسْرَا اور اِیْل سے مرکب ہے۔ اسرا کے معنی بندہ یا برگزیدہ کے ہیں اور ایل اللہ کا نام ہے لہٰذا اسرائیل کے معنی عبداللہ یا صَفوۃ اللہ کے ہوں گے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ بجائے یا بنی یعقوب کے یا بنی اسرائیل فرمانے میں ایک خاص لطافت ہے۔ وہ یہ کہ اس لقب کی طرف مضاف کرنے سے یہ معنیٰ ہونگے کہ اے اولاد ہمارے مطیع اور فرمانبردار

[1] ہٰذہٖ ترجمۃ الاضافۃ التی فی قولہ تعالیٰ نِعْمَتِیَ لان الاضافۃ تفید الاختصاص فافہم ۱۲

اور برگزیدہ بندہ کی تم کو تو اتباع حق میں اپنے باپ کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ جس طرح کہتے ہیں یا ابن الکریم افعل کذا اے کریم کے بیٹے ایسا کر۔ یا ابن الشجاع بارز الا بطال۔ اے شجاع کے بیٹے بہادروں کا مقابلہ کر۔ یا ابن العالم اطلب العلم۔ اے عالم کے بیٹے علم حاصل کر۔ پھر اس کے علاوہ تمہارے خاندان میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسٰی علیہ السلام تک چار ہزار نبی آئے۔ اس لیے تم کو پیغمبروں کی علامتیں خوب معلوم ہیں لہذا تم کو نبی اکرم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے اکثر مناظرہ اور مکالمہ قریش کے ساتھ رہتا تھا۔ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود سے مناظرہ اور مکالمہ شروع ہوا۔ یہود چونکہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے علماء کہلاتے تھے، تمام عرب کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ لوگ اہل علم ہیں ان کے خاندان میں ہزاروں نبی ہوئے، انبیاء کی علامتوں سے خوب واقف ہیں۔ دیکھیں یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب اس لیے حق تعالٰے شانہ، نے اپنے خاص خاص انعامات کو جو وقتاً فوقتاً بنی اسرائیل پر ہوتے رہے۔ یاد دلایا اس لیے کہ عام نعمتوں کا تذکرہ اتنا مفید اور مؤثر نہیں ہوتا۔ جتنا کہ خاص نعمتوں کا تذکرہ دل میں اثر رکھتا ہے اس لیے اولاً اجمالی طور پر حق جل شانہ، نے اس رکوع میں بنی اسرائیل پر اپنے خاص انعامات کا ذکر فرمایا تاکہ شرما کر ایمان لائیں اس کے بعد دوسرے رکوع میں تفصیلی طور پر اپنے انعامات کا اور بنی اسرائیل کی شرارتوں کو ذکر فرمایا تاکہ لوگ انکی شرارتوں سے واقف ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ ان کا قول اور فعل قابل اعتبار نہیں۔

اور پورا کرو تم اس عہد کو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں بھی پورا کرونگا اس عہد کو جو میں نے تم سے کیا ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں اس عہد سے وہ مراد ہے جو سورۂ مائدہ کی اس آیت میں مذکور ہے۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا وَّقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس عہد سے وہ عہد مراد ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا کہ تمہارے بھائیوں میں سے یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد مراد ہے۔ اور اہل کتاب سے اللہ کا عہد یہ تھا کہ تم میں سے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیگا اسکو دو اجر ملیں گے جیسا کہ سورۂ قصص کی اس آیت میں ہے اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ۔ ایک اجر حضرت موسٰی یا حضرت عیسٰی علیہما السلام پر

ایمان لانے کی وجہ سے اور دوسرا اجر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ پس اے اہل کتاب تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔ اور اس سے نہ ڈرو کہ ایمان لانے سے تمہارے ہدیے اور نذرانے بند ہو جائیں گے۔ اور قوم تمہاری مخالف ہو جائے گی اور در پئے ایذار واضرار ہو جائے گی اور قوم تمکو اپنی جماعت سے نکال باہر کرے گی جس سے طرح طرح کے نقصان اٹھانے پڑیں گے بلکہ خاص مجھ سے ڈرو قوم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بھلائی اور برائی سب میرے ہاتھ میں ہے۔

ایمان لانے سے دنیا کے حقیر اور معمولی اور چند روزہ اور فانی ہی منافع فوت ہونگے مگر ایمان نہ لانے سے خدا کی رضا اور خوشنودی اور آخرت کے دائمی بیش بہا منافع فوت ہو جائیں گے۔

لکل شئ اذا فارقتہ عوض — ولیس للہ ان فارقت من عوض

(جس چیز کو بھی چھوڑ و اسکا عوض مل سکتا ہے مگر خدا کو چھوڑ کر اسکا عوض پانا ناممکن اور محال ہے)۔ اس لیے ارشاد ہوا مجھ سے ہی ڈرو امرار اور رؤسار سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا اور آخرت کے نفع اور ضرر کا مالک صرف میں ہی ہوں۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ [1]

اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کی درآنحالیکہ وہ کتاب اس توریت کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے۔ یعنی اول تو محض اس وجہ سے ایمان لے آنا چاہیئے تھا کہ قرآن کو اللہ نے نازل کیا ہے جیسے تم توریت پر اس وجہ سے ایمان لائے کہ اللہ نے اسکو اتارا ہے اسی طرح یہ قرآن بھی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے اسی طرح اس پر بھی ایمان لاؤ۔ علاوہ ازیں یہ کتاب اس توریت کی جو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اتاری گئی۔ اس کے منزل من اللہ اور کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے اس لحاظ سے بھی تم کو اس پر ایمان لانا چاہیئے پھر یہ کہ توریت میں نبی آخر الزمان کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی کا تم کو بخوبی علم ہے لہٰذا تمکو چاہیئے کہ سب سے پہلے حضور پر نور پر ایمان لاؤ اور دیدہ دانستہ سب سے پہلے قرآن کے منکر اور مکذب یعنی جھٹلانے والے نہ ہو کہ قیامت تک قرآن کریم کی تکذیب کرنے والوں کا وبال تمہاری گردن پر رہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے بعد پہلا فرقہ یہود کا ہے جو مدینہ اور خیبر میں رہتا تھا اور دوسرا فرقہ نصاریٰ کا ہے جو زیادہ تر شام میں رہتا تھا۔ پس اگر یہود آنحضرت ؐ کی نبوت کا انکار کریں گے تو نصاریٰ بھی انکے دیکھا دیکھی انکار کریں گے اس لیے فرمایا کہ اے یہود تم پہلے کافر نہ بنو۔

---

[1] اشارۃ الی ان الضمیر فی قولہ بہ عائد الی القرآن الذی تقدم ذکرہ قولہ بما انزلت و اختارہ ابن جریر و قیل الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

ف | مشرکین مکہ اگرچہ اہل کتاب سے پہلے انکار اور تکذیب کر چکے تھے مگر وہ تکذیب جہالت اور نادانی پر مبنی تھی دیدہ و دانستہ حق پوشی نہ تھی۔ اہل کتاب حق سے خوب باخبر تھے۔ دیدہ و دانستہ حق کو چھپاتے تھے اس لیے ارشاد ہوا۔ وَلَا تَكُونُوٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ یعنی اے اہل کتاب سب سے پہلے تم حق پوشی کرنے والے نہ بنو۔ اس لیے کہ کفر کی حقیقت حق پوشی ہے۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۔ اور میری آیتوں کے عوض میں ایک نہایت قلیل اور حقیر معاوضہ لینے پر آمادہ اور راضی نہ ہو جاؤ۔ آخرت کے ضرر کو دنیا کے ضرر سے بڑھ کر جانو اور کثیر اور باقی کے مقابلہ میں قلیل اور فانی کو ہرگز ترجیح نہ دو۔ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ساری ہی دنیا کا کل ساز و سامان ثمن قلیل ہے۔ قال تعالیٰ۔ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ دراہم معدودہ کی طمع میں میری آیتوں میں تحریف اور تبدیلی نہ کرو۔ اور خاص مجھ سے ہی ڈرو۔ عوام الناس سے مرعوب ہو کر حق سے اعراض نہ کرو۔

ف | ظاہر کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس طرح فرماتے۔ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ مَتَاعًا قَلِيْلًا۔ میری آیات کے بدلے میں تھوڑا سامان مت خریدو اس لیے کہ عرف میں سامان خریدا جاتا ہے۔ ثمن اور قیمت نہیں خریدی جاتی لیکن بجائے اسکے وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ تمام دنیا کا ساز و سامان بمنزلہ قیمت کے ہے اور اصل مقصود آخرت ہے اور یہ مسلم ہے کہ معاملہ میں مقصود بالذات قیمت نہیں ہوتی۔ اصل مقصود سامان ہوتا ہے اور قیمت اور ثمن مقصود کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پس اشارہ اس طرف ہے کہ تم نے اپنی نادانی اور غلط فہمی سے ثمن اور قیمت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور باقی کو دیکر فانی کو خرید لیا۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو کہ حق کو باطل کے ساتھ ملانا اور حق کو چھپانا کس قدر مذموم ہے۔ زہر کو زہر جان کر کھانا انتہائی نادانی ہے۔

گزشتہ آیت میں بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم خود گمراہی سے باز آؤ اور ایمان اور ہدایت کو قبول کرو۔ اس آیت میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کو گمراہ نہ کرو۔ جن لوگوں کے کان کچھ حق سے آشنا ہو چکے ہوں اور کلمۂ حق ان کے کان میں پڑ چکا ہو انکو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حق اور باطل صدق اور کذب ہدایت اور ضلالت کو انکے سامنے خلط ملط کر دیا جائے تاکہ حق کے قبول کرنے میں متردد ہو جائیں۔ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ میں اسی طرف اشارہ ہے اور جس شخص نے کلمۂ حق سنا ہی نہ ہو۔ رشد اور ہدایت سے بالکل بے خبر ہو۔ اس کے گمراہ کرنے کا طریق یہ ہے کہ حق کو اس کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے کہ مبادا وہ حق بات سُنکر اس کو قبول نہ کرے۔ اور تَكْتُمُوا الْحَقَّ۔ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

یہاں تک اہل کتاب کو ایمان کی دعوت دی گئی۔ ایمان کے بعد سب سے زائد محبوب عمل اللہ کے نزدیک نماز ہے اس لیے آئندہ آیت میں نماز کا اور پھر زکوٰۃ کا حکم فرمایا کہ جان اور مال کی اطاعت میں لگے رہو۔ یعنی اے بنی اسرائیل ایمان کے بعد اور نماز کو قائم اور درست رکھو۔ یعنی محض کتمان حق اور تلبیس اور غلط ملط سے باز رہنا نجات کے لیے کافی نہیں جب تک کہ احکام خداوندی پر عمل نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ ایمان کے بعد نماز کو قائم رکھو۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ الصَّلٰوۃَ۔ میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی ایسی نماز پڑھو کہ جیسی صحابہ کرام پڑھتے ہیں۔ منافقوں کی سی نماز نہ پڑھو۔ جو حقیقت میں نماز نہیں بلکہ فقط صورت اور ہیئت نماز کی ہے اور طیب خاطر اور انشراح صدر کے ساتھ زکوٰۃ دیا کرو۔ جس طرح سے لغت عرب میں ایتان سہولت سے آنے کا نام ہے۔ اسی طرح ایتا سہولت سے دینے کا نام ہے اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا شریعت اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود نماز پڑھتے تھے مگر تنہا۔ اس لیے حکم ہوا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھو اس لیے کہ نماز بھی ایک قسم کا جہاد ہے جس میں اجتماع ضروری اور لازمی ہے۔ اور محراب مسجد محاربۂ شیطان کا محل ہے اور قتال کے لیے صفوف کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے صفوف جماعت کے سیدھا رکھنے کی حدیثوں میں بہت تاکید آئی ہے۔

توبیخ عالم بے عمل

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ کیا تم دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب یعنی توریت کو پڑھتے ہو جس میں عالم بے عمل کی مذمت جابجا مذکور ہے۔ پس کیا تم سمجھتے نہیں کہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا راستہ بتلانا اور دیدہ و دانستہ اپنے کو ہلاک اور برباد کرنا یہ عقل اور فراست نہیں بلکہ عین سفاہت اور عین حماقت ہے۔ تعجب ہے کہ تم دوسروں کے ساتھ تو احسان کرتے ہو مگر اپنے نفس کے ساتھ احسان نہیں کرتے حالانکہ وہ احسان کا زیادہ مستحق ہے اپنی بدخواہی اور دوسروں کی خیر خواہی عقل کا اقتضاء نہیں عقل کو عقل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو بری باتوں سے روکتی ہے اور اس لیے کہ عقل کے معنی لغت میں روکنے کے ہیں۔ پس جب انسان نے اپنے ہی کو گمراہی سے نہ بچایا اور بری باتوں سے نہ روکا تو وہ کس طرح عاقل کہلا سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ عالم بے عمل کی مثال شمع کی سی ہے کہ دوسروں کو روشنی پہنچاتی ہے اور اپنے کو جلاتی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت یہود کے بارہ میں نازل ہوئی جو اپنے خویش اقارب کو جو ایمان لے آئے تھے اُنکو یہ کہا کرتے تھے کہ تم دین اسلام پر قائم رہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں وہ حق ہے دوسروں کو ایمان اور اسلام کی ترغیب دیتے اور خود ایمان اور اسلام کو قبول نہ کرتے مطلب یہ ہوا کہ تم توریت کی تلاوت کرتے ہو اور اس میں نبی آخرالزمان کی بشارتیں پڑھتے ہو باوجود اس علم کے تم خود تو ایمان نہیں لاتے اور تمہارے اقارب اور احباب میں سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے اسکو ایمان اور اسلام پر قائم رہنے کی تاکید کرتے ہو تمہارا عجب حال ہے کہ باوجود کتاب کے پڑھنے اور اہل علم کہلائے جانیکے کہ دوسروں کو تو نیک باتوں کا حکم کرتے ہو مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے۔

تنبیہ اس آیت شریفہ کا یہ مقصد نہیں کہ عالم بے عمل کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے یا کسی کو راہ حق نہ بتلائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خود بھی ضرور عمل کرے عالم ہو کر بے عمل نہ رہے بلکہ عالم باعمل بنے۔ جب وہ دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے تو اسکو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ سب سے پہلے میرا نفس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا محتاج ہے۔

عالم پر دو چیزیں فرض ہیں۔ ایک ترک معصیت یعنی خود معصیت نہ کرنا۔ دوم یہ کہ دوسروں کو معصیت سے منع کرنا۔ اگر دونوں فرض نہیں بجا لاسکتا تو دونوں کو چھوڑا بھی نہیں جاسکتا۔ ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ طبیب اگر کسی مرض میں خود مبتلا ہو تو اسی مرض کے مریض کا معالجہ کرسکتا ہے لیکن خود اسکا مرض جب ہی زائل ہوگا جب وہ خود بھی دوا کا استعمال کرے دوسرے مریض کو دوا کا بتلانا بلاشبہ ضروری اور مستحسن ہے اور مریض کے لیے غایت درجہ مفید ہے مگر اس بدپرہیز طبیب کو فائدہ جب ہوگا کہ جب خود بھی دوا کا استعمال کرے محض دوسرے کو دوا بتلا دینا اس کے مرض کے ازالہ کے لیے کافی نہیں اور لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ میں انکار فقط قول حق اور امر بالمعروف کی طرف راجع نہیں بلکہ تقولون کی قید یعنی لا تفعلون۔ کی طرف راجع ہے یعنی حق کہنے کے بعد اس پر عمل کیوں نہیں کرتے بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی شئی کسی قید کے ساتھ مقید ہو تو نفی اور انکار فقط قید کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ علماء اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نبی برحق ہیں مگر حُبِّ مال اور حب جاہ آپ کے اتباع سے مانع تھے کہ اگر آپ پر ایمان لے آئیں گے تو ہمارے ہدیے اور نذرانے بھی بند ہوجائیں گے اور رؤساء اور امراء کی نظروں سے ہم گر جائیں گے اور جو عزت اور وجاہت ہم کو حاصل ہے وہ جاتی رہے گی۔ آئندہ آیت میں اس کا علاج ارشاد فرمایا۔

اصلاحِ نفس کا طریقہ اور حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ کا علاج

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط اور اگر تم حب دنیا اور ہوا و ہوس کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ہو تو شہوات اور لذات سے پرہیز کرو اور اس کے معالجہ کے لیے یہ دو ایتیں استعمال کرو یعنی صبر سے مدد طلب کرو یعنی نفس کو صبر اور قناعت کا خوگر اور ترک لذات اور شہوات کا عادی بناؤ۔ تاکہ دنیا کی محبت دل سے زائل ہو۔ اور حق اور باطل میں تمیز کرسکو مرض کا ازالہ جب ہی ممکن ہے کہ اوّل مضرات سے پورا پورا پرہیز ہو اور پھر دوا کا استعمال ہو۔ اسی طرح باطنی امراض کے ازالہ کے لیے صبر بمنزلہ پرہیز کے ہے اور شکر بمنزلہ دوا کے ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ اَلْاِيْمَانُ نِصْفَانِ نِصْفٌ فِى الصَّبْرِ وَنِصْفٌ فِى الشُّكْرِ۔ "ایمان کے دو حصّے ہیں ایک صبر اور دوسرا شکر"، یعنی ایمان کی صحت اور سلامتی دو چیزوں پر موقوف ہے ایک صبر پر یعنی مضرات سے پرہیز کرنے پر اور دوم دوا شکر کے استعمال پر۔ جب تک پرہیز کامل نہ ہو اس وقت تک دوا پورا نفع نہیں کرتی اس لیے اوّل پرہیز یعنی صبر کا حکم دیا اور پھر دوا کے استعمال کا حکم دیا یعنی نماز کا کہ حمد و ثنا تسبیح و تقدیس رکوع و سجود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کا شکر ہے۔

بر مُرادِ نفس تا گردی اسیر صبر بگزین و قناعت پیشہ گیر

یعنی اگر تم کو اجر اور معاوضہ ہی مطلوب ہے تو حُطام دنیا اور دراہم معدودہ پر کیوں گرے جاتے ہو آؤ صبر کرو تاکہ بارگاہ خداوندی سے تم کو بے حساب اور بے شمار اجر ملے۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ. اور اگر تم عزت اور وجاہت کے طالب ہو تو عزت اور وجاہت کو ان کے پاس کہاں ڈھونڈتے ہو۔ عزت کی اگر تلاش ہے تو اُس عزیز مقتدر کے پاس تلاش کرو جس کی شان یہ ہے۔ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

پس اگر تم عزت کے متلاشی ہو تو آؤ اور اس ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ بے نیاز پر جبین نیاز کو خم کرو تاکہ دنیا اور آخرت کی عزتیں تم کو حاصل ہوں یعنی نماز پڑھو۔ نماز کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے حق جل شانہ کی محبت اور عظمت کو اور دنیا کی نفرت اور آخرت کی رغبت کو دل میں راسخ کرتی ہے۔ مخلوق سے تعلق کو قطع کرتی ہے اور خالق ذوالجلال سے تعلق کو مستحکم اور مضبوط کرتی ہے مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو جب کوئی امر پیش آتا تو فوراً گھبرا کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اور مسند احمد اور سنن نسائی میں صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا کہ حضرات انبیاء کو جب پریشانی پیش آتی تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ سفر میں تھے کہ بیٹے کی وفات کی خبر دی گئی تو سواری سے اترے اور دو رکعت نماز پڑھی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور یہ فرمایا کہ ہم نے ویسے ہی کیا جیسا اللہ نے ہم کو حکم دیا۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (اخرجہ سعید بن منصور وابن المنذر والحاکم وغیرھم) ضرورت اور پریشانی کے وقت جو نماز پڑھی جائے وہ صلوٰۃ الحاجۃ کہلاتی ہے اس آیت میں اسی صلوٰۃ الحاجۃ کی طرف اشارہ ہے۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

اور تحقیق وہ یعنی صبر اور صلوٰۃ سے استعانت اور استمداد البتہ بہت شاق اور گراں ہے مگر انہیں پر جن کے دل خدا کے خوف سے پگھلے جاتے ہیں۔ جنکو خیال ہے کہ ہم یقیناً خدا سے ملنے والے ہیں اور بلاشبہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یعنی صبر اور نماز حقیقت میں دشوار نہیں کہ جسکا بجا لانا ناممکن ہو ہاں ان لوگوں پر جو خدا سے ملنے کی امید نہیں رکھتے نماز ان پر بہت شاق اور گراں ہے وہ اس کو محض مشقت اور محنت خیال کرتے ہیں مگر اُن خاشعین پر جو عذاب الیم سے ڈرتے ہیں اور ثواب عظیم اور نعیم مقیم کی امید رکھتے ہیں ان پر نماز شاق اور گراں تو کیا ہوتی ان کے لیے تو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کی فرحت اور مسرت ہے۔

ف جو علم اور ادراک ان علامات سے حاصل ہو جو نہ حسی ہوں اور نہ بدیہی لغت میں اس کو ظن کہتے ہیں کبھی دلائل اور براہین کے انضمام سے اُسمیں قوت پیدا ہو جاتی ہے جو جزم اور یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی اس درجہ ضعیف ہو جاتا ہے کہ شک اور وہم کے قریب پہنچ جاتا ہے اس لیے لفظ ظن کبھی یقین کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی شک کے معنیٰ میں اور کبھی گمان غالب کے معنی میں۔ اس آیت میں اگر ظن سے یقین کے معنی مراد لیے جائیں جیسا کہ مجاہد اور ابو العالیہ اور قتادہ وغیرہم سے منقول ہے تو آیت کے یہ معنے ہونگے کہ نماز ان لوگوں پر شاق اور گراں نہیں جو خدا سے ملنے کا یقین رکھتے ہیں اور اگر ظن کے معنی گمان اور خیال کے لیے جائیں تو یہ معنی ہوں گے کہ جس شخص کو خدا کی ملاقات اور اسکی جزاء اور سزا کا گمان اور خیال بھی ہو جائے تو اگر عقل سلیم رکھتا ہے تو صبر اور نماز اور معاصی سے پرہیز اور طاعات خداوندی کا بجا لانا اس کو شاق اور گراں نہیں بلکہ سہل اور آسان ہو گا مریض کو جن لذائذ وطیبات کے استعمال سے ضرر کا گمان اور خیال بھی ہو جاتا ہے ان سے پرہیز کرنا اس کو دشوار نہیں معلوم ہوتا اور تلخ سے تلخ دوا کا استعمال کہ جس سے صحت اور شفا کی امید ہو آسان اور سہل معلوم ہوتا ہے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں کہ اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ۔ کے یہ معنی ہیں کہ وہ خاشعین نماز پڑھتے وقت یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنے پروردگار کو دیکھ

رہے ہیں جیساکہ حدیث میں ہے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ "عبادت کرو اللہ کی اس طرح کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم کو نفس کا تزکیہ اور اسکی اصلاح مقصود ہے تو صبر اور نماز سے اس بارہ میں مدد حاصل کرو۔ اور اگر یہ طریق تم کو دشوار معلوم ہوتا ہے تو دوسرا طریق یہ ہے کہ تم نعمائے الٰہیہ کا مراقبہ کیا کرو اور سوچا کرو کہ حق تعالےٰ شانہٗ نے ہم پر کیا کیا نعمتیں برسائیں اور با وجود ہماری نافرمانیوں کے ہم پر کیا کیا احسانات ہوتے رہے۔ اس تفکر اور مراقبہ کا اثر یہ ہوگا کہ قلب میں حق جل شانہٗ کی محبت کا ولولہ اور جوش پیدا ہوگا۔ اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ "انسان بندہ ہے احسان کا"۔ جہاں یہ جوش اور ولولہ پیدا ہوا مقصد حاصل ہوگیا۔ ؎

ہر آنکہ عشق یکے در دلش گرفت قرار
روا بود کہ تحمل کند جفائے ہزار
عشق آں شعلست کو چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اس لیے آئندہ آیت میں پھر ان نعمتوں کے یاد کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جن نعمتوں کو پہلے اجمالاً یاد دلایا تھا اب انکو تفصیلاً بیان فرماتے ہیں۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ
اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے تم پر
عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا یَوْمًا
کیا اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں پر اور بچو اس دن
لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا
سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے ایک ذرہ اور قبول نہ ہو اس کی
شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾
طرف سے سفارش اور نہ لیں اس کے بدلہ میں کچھ اور نہ ان کو مدد پہنچے
وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ
اور جب چھڑایا ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے دیتے تم کو بڑی تکلیف

الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْؕ

ذبح کرتے تمہارے بیٹے اور جیتی رکھتے تمہاری عورتیں

وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا

اور اس میں مدد ہوئی تمہارے ربّ کی بڑی اور جب ہم نے چیرا

بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ

تمہارے پیٹھنے کے ساتھ دریا پھر بچا دیا تم کو اور ڈبا دیا فرعون کے لوگوں کو اور

اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً

تم دیکھتے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ

پھر تم نے بنا لیا بچھڑا اس کے پیچھے اور تم بے انصاف ہو پھر

عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ

معاف کیا ہم نے تمکو اس پر بھی شاید تم احسان مانو اور

اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے احکام تاکہ تم راہ پاؤ

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْؕ

یہ بچھڑا بنا لیکر اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْؕ اِنَّهٗ

یہ بہتر ہے تمکو اپنے خالق کے پاس پھر متوجہ ہوا تم پر بے شک

هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ

وہی ہے معاف کرنے والا مہربان اور جب تمنے کہا اے موسیٰ ہم یقین نہ

نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ

کریں گے تیرا جب تک نہ دیکھیں اللہ کو سامنے پھر لیا تم کو بجلی

الصّٰعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ

نے اور تم دیکھتے تھے پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو

بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ

مر گئے پیچھے شاید تم احسان مانو اور سایہ کیا ہم نے

الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ط كُلُوْا

تم پر ابر کا اور اتارا تم پر من اور سلویٰ کھاؤ

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ط وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ

ستھری چیزیں جو دیں ہم نے تمکو اور ہمارا کچھ نقصان نہ کیا پر

كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا

اپنا ہی نقصان کرتے رہے اور جب کہا ہم نے داخل ہو

هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا

اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو محظوظ ہوکر

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ

اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرکر اور کہو گناہ اترے تو بخشیں ہم

خَطٰيٰكُمْ ط وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

تمکو تقصیریں تمہاری اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو پھر بدل لی بے انصافوں نے اور

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى

بات سوائے اس کے جو کہدی تھی ان کو پھر اتارا ہم نے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا

بے انصافوں پر عذاب آسمان سے ان کی

يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا

ع ۶

بے حکمی پر اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو کہا

اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا

ہم نے مار اپنے عصا سے پتھر کو پھر بہ نکلے اس سے بارہ

عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا

چشمے پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ کھاؤ

وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ

اور پیو روزی اللہ کی اور نہ پھرو ملک میں

مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

فساد مچاتے

تفصیل انعامات و عنایات خداوند جلیل و شرح جنایات و تقصیرات قوم بنی اسرائیل و حکم مراقبۂ عنایات و ملاحظۂ جنایات کہ در حیا حکم اکسیر دارد

قال تعالٰی يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ... الی ... وَلَا تَعْثَوْا فِى

الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو اجمالی طور پر اپنی نعمتیں یاد دلائیں اب آئندہ آیات میں ان کی تفصیل ہے جو دور تک چلی گئی اور تفصیل میں سب سے پہلی نعمت تفضیل کو ذکر فرمایا اس لیے کہ تفضیل علی العالمین سب سے افضل نعمت ہے پھر لطف یہ کہ اپنے الطاف و عنایات کے بعد ان کی جنایات اور تقصیرات کو ذکر فرمایا اس لیے کہ جب ایک طرف خداوند کریم کی عنایتوں کو دیکھیں گے اور دوسری طرف اپنی جنایات اور تقصیرات کو دیکھیں گے تو لامحالہ حق تعالیٰ سے شرمائیں گے اور اس وقت انکا یہ حال ہوگا اور قال بھی ہوگا۔ ؎

شکر نعمتہائے تو چند انکہ نعمتہائے تو عذر تقصیرات ما چند انکہ تقصیرات ما

اور حیا ایمان کا ایک درمیانی اور مرکزی شعبہ ہے جس پر ایمان کے باقی شعبے گھومتے ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ اے بنی اسرائیل یاد کرو تم میری ان خاص خاص نعمتوں کو جنکا میں نے خاص تم پر انعام کیا اور پھر اپنی جنایتوں پر نظر کرو کہ کیا ان نعمتوں کا یہی حق تھا جو تم کر رہے ہو اور ہماری اس تذکیر اور یاددہانی کی نعمت کو بھی یاد کرو کہ ہم نے تم کو خواب غفلت سے جگایا۔

انعامِ اوّل

وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ اور سلسلہ انعامات میں سب سے پہلے اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمکو اس زمانہ میں جہان والوں پر فضیلت دی کہ دنیا کی بادشاہت کے ساتھ دین کی بادشاہت بھی تم کو دی یعنی تمہارے خاندان میں پیغمبری بھی دی کما قال تعالیٰ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا وَّ اٰتٰکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ وَ قال تعالیٰ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ حضرت یعقوب علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمہارے ہی خاندان سے انبیاء مبعوث ہوتے رہے اور توریت اور انجیل اور زبور سب تمہارے ہی خاندان میں نازل ہوئی۔ تمہارا ہی خاندان نبوت و رسالت اور امامت اور حکمت کا مخزن رہا۔ غرض یہ کہ اس وقت تک تم ہی کو تمام عالم پر بزرگی اور برتری اور فضیلت حاصل رہی اب وقت آیا کہ وہ نبی آخر الزمان ظاہر ہوں جن کی تمام انبیاء و مرسلین حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلاۃ والسلام خبر دیتے چلے آئے لہذا اگر تم کو اپنی فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا منظور ہے تو فوراً محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور دل و جان سے ان کی اعانت اور امداد کرو۔ اور جس طرح قارون اور سامری نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کر کے

خاندان یعقوبی کے شرف کو ضائع کیا تم بھی قارون اور سامری کی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر کے اپنی فضیلت اور بزرگی اور اپنے شرف اور منصب کو ضائع نہ کرو۔ اگر تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہو تو اپنی سابق فضیلت اور گزشتہ منصب پر قائم ہو بلکہ تم سے دو اجر کا وعدہ ہے اور اگر تم ایمان لانے سے انحراف کرتے ہو تو سمجھ لو کہ تم اپنے منصب سے معزول ہو۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام کے وقت سے اس وقت تک بنی اسرائیل ہی سب سے افضل اور اشرف تھے۔ یہ وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے گزشتہ زمانہ سے لیکر اس وقت خطاب تک بنی اسرائیل کا ان فضیلتوں میں کوئی شریک اور سہیم نہیں رہا اور یہ وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے۔ گزشتہ فضیلت اور گزشتہ شرف کو باقی رکھنا ہے تو اس نبی برحق کی دعوت کو قبول کرو مگر افسوس ان لوگوں نے اس دعوت کو ٹھکرایا اور مغضوب علیہم اور ضالین کے نام سے موسوم ہوئے اور جو لوگ ایمان لائے وہ خیر الامم کے لقب سے سرفراز ہوئے اس تقریر سے یہ شبہ رفع ہوگیا کہ اس آیت سے بنی اسرائیل کا امت محمدیہ سے افضل ہونا لازم آتا ہے جواب یہ ہے کہ آیت میں اس وقت کی تفضیل کا ذکر نہیں گزشتہ زمانہ کی تفضیل کا ذکر ہے وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے۔

آئندہ انکے ایک شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ اگر تمکو یہ خیال ہے کہ باوجود نہ ایمان لانے کے قیامت کے دن ہم اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے تو سمجھ لو کہ قیامت کے دن نمرود اور فرعون سامری اور قارون کی طرح انبیاء اللہ سے انحراف کرنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہ ہوگی چنانچہ ارشاد ہے۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ اور ڈرو تم اس دن سے کہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ بھی کام نہ آئیگا اور نہ اسکی طرف سے کوئی سفارش اور نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ لیا جائیگا اور نہ انکی کوئی مدد کی جائے گی۔ البتہ اہل ایمان کی مدد کی جائے گی انسان جب کسی بلا میں گرفتار ہوتا ہے تو شفاعت و سفارش فدیہ دیکر رستگار ہونا چاہتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے اعوان و انصار کو جمع کر کے آمادۂ پیکار ہوتا ہے اور وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ سے یہی مراد ہے کہ تمہارا کوئی حامی اور مددگار بھی نہ ہوگا۔ جو تم کو زور اور قوت کے ذریعے سے عذاب سے چھڑائے۔

ف جو لوگ مال کی محبت میں زیادہ گرفتار ہوتے ہیں وہ یہ چاہا کرتے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو سفارش سے کام چل جائے۔ مال نہ خرچ کرنا پڑے اور بعض عزت اور وجاہت کے دلدادہ ہوتے ہیں انکو مال خرچ کرنا آسان ہوتا ہے اس لیے حق جل شانہ، نے اس مقام پر شفاعت کو فدیہ پر مقدم فرمایا اور اسی پارہ کے اخیر میں فدیہ کو شفاعت پر مقدم فرمایا۔ حیث قال وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ

وَلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ تاکہ دونوں قسم کی طرف اشارہ ہوجائے۔

تنبیہ اس آیت شریفہ میں مطلق شفاعت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ فرعون اور ہامان کی طرح انبیاء اللہ سے انحراف کرنے والوں کی شفاعت کی نفی مقصود ہے۔ عُصاۃ مؤمنین یعنی گنہگار مسلمانوں کی شفاعت جو دیگر آیات اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے اس کی نفی مقصود نہیں تفصیل اگر درکار ہے تو تفسیر کبیر کی مراجعت فرمائیں۔

نیز ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالٰے کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی شخص اپنی وجاہت سے سفارش نہ کرسکے گا اور آیت مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ میں لفظ اذن اس کی دلیل ہے کہ خدا تعالٰی کی اجازت سے سفارش ہوسکے گی۔

انعام دوم وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ... الٰی ... مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ اور یاد کرو اس انعام کو جبکہ ہم نے تمکو قوم فرعون سے نجات دی جو تم کو سخت ترین عذاب کی تکلیف دے رہے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ غیور طبیعتیں سمجھ سکتی ہیں کہ عورتوں کا زندہ چھوڑنا بیٹوں کے ذبح سے سخت ہے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ تم نے دیکھ لیا کہ سوائے خدا تعالٰے کے کسی نے بھی دنیا میں ان سختیوں میں تمہاری کوئی مدد نہ کی پس سمجھ لو کہ آخرت میں جبکہ نفسی نفسی ہوگی کون تمہاری مدد کرسکے گا۔ فرعون نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے جس نے مصر کا احاطہ کرلیا ہے۔ ہر قبطی کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور اسکو جلاتی ہے بنی اسرائیل سے کوئی تعرض نہیں کرتی۔ کاہنوں نے اسکی یہ تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیرے اور تیری قوم اور تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا اس لیے فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اسکو قتل کردیا جائے اس زمانہ میں نجوم کا بڑا چرچا تھا۔ اور نجومیوں کو خواب کی تعبیر کا بھی ملکہ تھا اسی زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ فرعون ہی کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی۔

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود قصۂ فرعون زیں افسانہ بود

انعام سوم وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِکُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰکُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ۔ اور اے بنی اسرائیل اس نعمت کو بھی یاد کرو جب کہ ہم نے محض تمہاری وجہ سے دریا کو پھاڑا یعنی محض تمہارے صحیح سالم گذر جانے کی وجہ سے ہم نے اپنے ارادہ اور مشیت سے دریا کو شق کیا۔ اتفاقی طور پر جزر و مد نہ تھا پس تم کو نجات دی دشمن سے بھی نجات ملی۔ اور خدا تعالٰے کے علم و قدرت میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں جو شبہات تھے ان سے بھی تم کو نجات ملی۔ سارے شبہے رفع ہوئے اور فقط تمہارے

نجات دینے پر کفایت نہیں کی۔ بلکہ قوم فرعون کو جو تمہاری دشمن تھی غرق کیا۔ تاکہ آئندہ بھی دشمنوں کا خطرہ دل سے نکل جائے اور پھر غرق بھی انکو ایسی حالت میں کیا کہ تم انکو غرق ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس میں اب کسی قسم کے شک وشبہ کی بھی گنجائش نہ رہی تھی اور دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے غرق ہوتے ہوئے دیکھنا یہ بہت ہی بڑی نعمت ہے اور ایسی نعمت کا تو بہت ہی شکر چاہیئے۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ دن جس میں بنی اسرائیل کو نجات اور قوم فرعون کو غرق کیا گیا عاشورہ کا دن تھا۔ اس نعمت کے شکر میں موسیٰ علیہ السلام نے اس روز کا روزہ رکھا۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا تو فرمایا کہ تم سے زائد موسیٰ کا حقدار میں ہوں۔ خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ کا حکم دیا۔ فرعون سے نجات دینا تو نعمت تھا ہی لیکن دریا کو ان کے گزرنے کے لیے راستہ بنا دینا ایک مستقل انعام تھا اس لیے فلق بحر کو علیحدہ ذکر فرمایا۔

انعام چہارم

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ فرعون کے غرق ہونے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے توریت عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا اور یہ بھی وعدہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چالیس شب کا اعتکاف فرمائیں۔ موسیٰ علیہ السلام تو کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ سامری جو کہ منافق تھا اس نے بعد میں گوسالہ پرستی کا فتنہ کھڑا کر دیا جسکا مفصل قصہ آئندہ آئے گا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اے بنی اسرائیل اور تم ہمارے اس انعام کو یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ تیس راتیں ذی قعدہ کی اور دس راتیں ذی الحجہ کی۔ رات کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ رات کی عبادت میں مجاہدہ زیادہ ہے کما قال تعالیٰ۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا	تحقیق رات کا اٹھنا نفس کے روندنے اور پامال کرنے اور بات کے سیدھا نکلنے میں شدید موثر ہے۔

نیز سماء دنیا کی طرف حق جل جلالہٗ کا نزول اجلال شب ہی میں ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے اور رحمتیں اور برکتیں بھی اکثر رات ہی میں نازل ہوتی ہیں۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ۔ ہم نے قرآن کو مبارک رات میں اتارا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ علاوہ ازیں قرب الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے رات سے بہتر کوئی وقت نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے۔

عَنْ عمرو بن عنبسة رضی	عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

الله تعالیٰ عنه انه سمع النبی صلی الله علیه وسلم یقول اقرب ما یکون الرب من العبد فی جوف اللیل الاخر فان استطعت ان تکون ممن یذکر الله فی تلک الساعة فکن رواه الترمذی و اللفظ له و ابن خزیمة فی صحیحه وقال الترمذی حدیث حسن صحیح غریب۔

کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حق جل شانہٗ بندہ کے ساتھ سب سے زائد قریب اور نزدیک وسط شب میں ہوتے ہیں پس اگر تم سے یہ ممکن ہو کہ تو اس وقت میں اللہ کے ذکر کرنے والوں میں سے ہو تو ضرور ہو جا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا اور یہ لفظ ترمذی کی روایت کے ہیں اور ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں اسکو روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن اور صحیح اور غریب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپکے صحابہ کو قیام لیل کا حکم ہوا۔ یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ۔ اور رات ہی میں تہجد کا حکم ہوا۔ وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ اور رات ہی میں آپکو آسمان کی سیر کرائی گئی۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا۔ الآیۃ۔

عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب سفر کرنے تو رات کو چلتے اور دن کو ٹھہرتے اس لیے کہ رات میں راستہ جلد قطع ہو جاتا ہے اسی طرح سیر الی اللہ کیلئے رات کو خاص کیا گیا تاکہ سالک جلد منزل مقصود پر پہنچ جائے رہا یہ امر کہ چالیس کا عدد کیوں خاص کیا گیا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اعداد کے مختلف مرتبے ہیں آحاد (اکائیاں) عشرات (دہائیاں) مات (سینکڑے) اُلوف (ہزار) جن میں سے دس کا عدد فی حد ذاتہٖ فی نفسہٖ کامل اور مکمل ہے جیسا کہ حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ (یہ دس کامل ہیں) پس جس چیز کی خاص طور پر تکمیل مقصود ہوتی ہے تو اس عدد یعنی دس کو چار گنا کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی مٹی کا خمیر چالیس دن تک کیا گیا اور حدیث میں ہے کہ بطن مادر میں چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے پھر چالیس روز تک علقہ (خون بستہ) پھر چالیس روز تک مضغہ یعنی پارۂ گوشت اسکے بعد روح پھونکی جاتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عدد کو عروج اور ترقی سے کوئی خاص مناسبت ہے پس جس طرح جسمانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد منتخب ہوا اسی طرح حق جل شانہٗ نے اپنی اس قدیم سنت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے باطنی اور روحانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد خاص فرمایا۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا

وروی عن ابن عباس ان رسول الله صلی الله علیه

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے

وسلم قال من اخلص لله اربعین یوما ظهرت ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه ذکرہ رزین العبدری (ترغیب وترہیب ص۲۵ ج۱)

ارشاد فرمایا جو چالیس دن تک عمل خاص اللہ کے لیے کرے تو علم اور حکمت کے چشمے اسکے قلب سے نکل کر اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔ (رواہ رزین العبدری)

٭ ٭ ٭

بینی اندر خود علوم اولیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اور اسی طرح نبوت و رسالت پیغمبری اور بعثت کے لیے چالیس کا عدد خاص کیا گیا۔ علاوہ ازیں اصل عمر انسان کی چالیس سال ہے اس کے بعد انحطاط اور زوال ہے جیسا کہ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۔ (سورۂ احقاف) سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے حضرات اہل اللہ (حشرنا اللہ تعالیٰ فی زمرتھم و اماتنا علی حبھم و سیرتھم آمین۔) نے مجاہدہ اور ریاضت خلوت اور عزلت کے لیے چلہ تجویز فرمایا۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ؎

شنیدم رہروے در سرزمینے ہمی گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے

الحاصل۔ ہم نے موسیٰ سے توریت دینے کے لیے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے موسیٰ کے جانے کے بعد ہی کہ جن کی ساری عمر ہی مدعی الوہیت کے مقابلہ اور غیر اللہ کی عبادت اور پرستش سے روکنے میں صرف ہوئی اُن کے جاتے ہی تم نے عجلت اور جلد بازی میں ایک عجل (گوسالہ اور بچھڑا) بنا کر کھڑا کر لیا اور لوگوں سے یہ کہا کہ دیکھو تمہارا خدا یہ ہے جو اس گوسالہ کی صورت میں ظاہر اور نمودار ہوا ہے اور جو تمہارے پاس ہے اور موسیٰ خدا کو کوہ طور پر ڈھونڈتا پھرتا ہے جیسا کہ آج کل ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ خدا کسی جسم میں حلول کر سکتا ہے اصطلاح متکلمین میں اس فرقہ کا نام فرقہ حلولیہ ہے سامری نے لوگوں کو یہی سمجھایا کہ تمہارے پروردگار نے اس گوسالہ کی صورت میں ظہور کیا ہے غرض یہ کہ سامری نے گوسالہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ اول تو گوسالہ بنانا ہی بُرا تھا اس لیے کہ ذی روح کی تصویر بنانا قطعاً حرام ہے پھر یہ کہ گوسالہ بنا کر کیا کیا وہ زبان پر لانے کی چیز نہیں۔ اندیشہ ہے کہ کہیں زمین اور آسمان نہ پھٹ جائیں اور تم بڑے ہی ظالم تھے۔ کہ خدائے عز و جل کو چھوڑ کر ایسے جانور کہ جو حماقت میں ضرب المثل ہے اس کی محض ایک تصویر کو اپنا خدا بنا لیا۔ بیل حماقت میں ضرب المثل ہے اور بیل کا بچہ تو بیل سے بھی کم ہے اس لیے کہ وہ بے شعوری اور بے عقلی میں اس سے بڑھا ہوا ہے۔ کیا یہ انتہائی ظلم نہیں۔ ذرا تم اپنے عدل اور انصاف فہم اور فراست کا کچھ تو اندازہ لگاؤ کیا ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز بھی خدا اور معبود ہو سکتی ہے۔

نیز تم نے یہ نہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب تمکو فرعون کی عبادت سے روکتے تھے حالانکہ وہ کسی درجہ میں نفع وضرر پر بھی قدرت رکھتا تھا تو اس بے عقل اور بے جان حیوان کی عبادت کی کیسے اجازت دے سکتے ہیں۔ آخر فرعون بیل کے بچہ سے تو بہتر ہی تھا۔ اس عمل شنیع کا مقتضا تو یہ تھا کہ تم کو فوراً ہلاک کر دیا جاتا مگر ہم نے اپنی کمال رحمت اور غایت رأفت سے درگزر کیا جیسا کہ آئندہ آیت میں فرماتے ہیں۔

انعام پنجم ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

پھر ہم نے اس جرم عظیم کے بعد بھی تم کو معاف کیا تاکہ تم احسان مانو کہ ہم نے اپنے فضل اور رحمت سے تم کو معاف کیا آل فرعون کی طرح ہلاک نہ کیا، ورنہ یہ جرم قابل عفو نہ تھا عفو سے اس جگہ مراد ترک مؤاخذہ ہے کہ تمکو اس جرم کے بعد نیست و نابود کر کے نہیں چھوڑا۔

حکایت بارگاہِ خداوندی میں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار تو نے بے شمار نعمتیں مجھ کو عطا فرمائیں اور ان پر شکر کا حکم دیا تیری نعمتوں کا شکر خود ایک عظیم الشان نعمت ہے پھر کس طرح شکر کروں۔ اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ بندہ کا یہ سمجھ لینا کہ جو نعمت بھی ہے وہ میری ہی طرف سے ہے یہی بس اس کے لیے کافی ہے۔ (خازن)

انعام ششم وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ اور اے بنی اسرائیل اس انعام کو بھی یاد کرو جبکہ ہمنے موسیٰ کو کتاب یعنی توریت دی جو احکام الٰہی کی جامع[1] تھی اور جو حق اور باطل روا اور ناروا میں فرق کرنے والی تھی۔ شاید کہ تم راہ راست پاؤ۔ علامہ زمخشری کے نزدیک اس جگہ الکتاب اور الفرقان دونوں سے توریت ہی مراد ہے۔ اور یہ دونوں توریت کی صفتیں ہیں۔

اور بعض مفسرین کے نزدیک کتاب سے توریت مراد ہے اور الفرقان سے معجزات مراد ہیں کہ جن سے حق اور باطل کا فرق واضح اور نمایاں ہوتا ہے جب بنی اسرائیل نے سامری کے اغواء سے گوسالہ کی پرستش شروع کر دی تو بنی اسرائیل میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک حضرت ہارون علیہ السلام اور اُن کے متبعین کا کہ خود بھی اس سے علیحدہ رہے اور دوسروں کو بھی منع کیا۔ دوسرا فریق سامری اور اسکے متبعین کا اور تیسرا فریق ساکتین کا کہ نہ خود گوسالہ پرستی کی اور نہ دوسروں کو منع کیا۔ پہلے فریق کو توبہ کی حاجت نہ تھی دوسرے اور تیسرے فریق کو توبہ کا اس صورت سے حکم ہوا کہ تیسرا فریق یعنی ساکتین دوسرے فریق یعنی سامری اور اس کے متبعین اور مرتدین کو قتل کریں تاکہ مقتول ہونے سے مرتدین کی توبہ ہو جائے اور قتل

[1] اشارۃ الی ان اصل الکتاب ھو الجمع وسمی الکتاب کتابا لکونہ جامعًا للعلوم والقواعد واللہ اعلم ۱۲ منہ

سے ساکتین کی توبہ ہو جائے اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض تھا اس سے سکوت کیسے جائز تھا اس لیے اس سکوت کی توبہ یہ ہے کہ تم اپنے اُن خویش اور اقارب اور احباب و مخلصین کو کہ جو گوسالہ پرستی کی وجہ سے مرتد ہو گئے ہیں انکو اپنے ہاتھ سے قتل کرو جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔

انعام ہفتم وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ الآیۃ۔ اور اے بنی اسرائیل اس انعام کو بھی یاد کرو جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنی جانوں پر بڑا ہی ظلم کیا اس بچھڑے سے تو فرعون اور ہامان ہی بہتر تھا۔ جب ایک انسان کی پرستش کفر اور شرک ہوئی تو ایک احمق حیوان کی پرستش کیسے کفر اور شرک نہ ہو گی۔ لہٰذا فوراً ہی بلا کسی تاخیر اور مہلت کے اپنے اس خالق کی طرف رجوع کرو۔ جس نے تم کو کفر اور شرک سے پاک اور بَری منزہ اور مبرا پیدا کیا اس علیم و حکیم نے تم کو حنیف اور فطرۃ اسلام پر پیدا کیا تھا تم نے اپنی جہالت اور نادانی سے اس کو شرک اور ظلم عظیم کے ساتھ آلودہ اور ملوث کیا۔ لہٰذا تم اپنے خالق کی طرف[1] رجوع کرو اور اسی کو اپنی مرجع اور اپنا منتہی سمجھو اور پھر اس توبہ کی تکمیل اس طرح کرو کہ اپنے آپکو قتل کرو[2] یعنی ساکتین مرتدین کو خنجر لیکر قتل کریں موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کو یہ حکم خداوندی سنایا تو سب نے کہا کہ ہم دل و جان سے اپنے مولیٰ کے حکم پر راضی ہیں۔ چنانچہ سب ایک میدان میں جمع ہو گئے جن لوگوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی تھی خنجروں اور تلواروں سے گوسالہ پرستی کرنے والوں کو قتل کرنا شروع کیا جیسا کہ حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور حسن بصری اور سعید بن جبیر اور مجاہد اور قتادہ اور ابو العالیہ وغیرہم سے مروی ہے اور توریت سفر خروج کے بتیسویں باب میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی۔ جب ستر ہزار آدمی قتل ہو گئے تو حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ نے نہایت تضرع اور ابتہال کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں عفو کی درخواست کی۔ حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی مقتولین کی بھی مغفرت فرمائی اور بقیۃ السیف کو بھی معاف فرمایا۔ جو مارا گیا اس نے مرتبہ شہادت پایا اور جو زندہ رہا وہ گناہوں سے پاک ہوا۔

ف امام رازی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہماری شریعت میں قاتل عمد کی توبہ کی

---

[1] ہذا تفسیر کلمۃ الی التی ھی لانتہاء الغایۃ فی قولہ الی بارئکم ۱۲۔

[2] آثار صحابہ اور تابعین اور توریت سب سے یہی ثابت ہے کہ یہ قتل تلواروں اور خنجروں سے تھا لہٰذا فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے نفس کشی مراد لینا صحیح نہیں۔ نیز نفس کشی ایک امر خفی ہے جسکا علم بہت دشوار ہے۔

تکمیل اور تتمیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ قاتل اپنے کو اولیاء مقتول کے سپرد کرے کہ چاہیں قتل کریں اور چاہیں معاف کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مرتدین کی توبہ جب مکمل ہوگی کہ جب وہ اپنے کو قتل کے لیے سپرد کردیں اھ (تفسیر کبیر) یہی تمہارے لیے ہر طرح سے بہتر اور نافع ہے تمہارے خالق کے نزدیک۔ جب تم نے اللہ کے حکم کی دل و جان سے تعمیل کی تو اللہ نے تم پر توجہ فرمائی اور تمہاری توبہ قبول کی۔ اگرچہ تمہارا جرم فرعون سے بھی زیادہ سخت تھا اس لیے کہ وہ ابتداء ہی سے کافر تھا اور تم نے ایمان کے بعد کفر کیا اور مرتد ہوئے۔ دین الٰہی کی بے حرمتی اور آبروریزی کی۔ بے شک وہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے اور بڑا ہی مہربان ہے کہ ایک گھڑی کی تکلیف برداشت کرلینے پر ہمیشہ کی عزت اور کرامت عطا فرماتا ہے۔ وہ حیات جس کی حقیقت لہو و لعب سے زائد نہیں ایسی حیات لیکر حیات سرمدی اور ابدی سے سرفراز فرماتا ہے۔ ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد — آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

واقعۂ قتل کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے باذن الٰہی ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لیجانے کے لیے منتخب فرمایا تاکہ گوسالہ پرستی کی معذرت کریں۔ سب نے روزہ رکھا اور غسل کیا اور عمدہ کپڑے پہنے جب کوہ طور پر پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ بارگاہِ خداوندی میں عرض کیجئے کہ ہمیں اپنا کلام پاک سنائے۔ تھوڑی دیر میں ایک نورانی ابر ظاہر ہوا موسیٰ علیہ السلام اس میں غرق ہوگئے اور بنی اسرائیل نیچے کھڑے رہے۔ سب نے اللہ کا کلام سنا۔ جب کلام الٰہی ختم ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام اس ابر سے برآمد ہوئے اور دریافت کیا کہ تم نے کلام الٰہی سنا تو اس پر یہ کہا ہم تو کلام الٰہی ہونے کا اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک علانیہ طور پر خدا کو نہ دیکھ لیں۔ آئندہ آیت میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

انعام ہشتم

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ اور یاد کرو اے بنی اسرائیل اس وقت کو کہ جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم محض تمہارے کہنے سے اس کا ہرگز یقین نہ کریں گے کہ ہم نے جو کچھ سنا وہ اللہ جل جلالہ ہی کا کلام ہے ممکن ہے کہ پس پردہ کوئی اور کلام کرتا ہو جب تک کہ ہم خود اللہ کو علانیہ طور پر نہ دیکھ لیں اس طرح کہ ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ ہو پس آپکڑا تم کو اس گستاخی پر بجلی نے اور تم اس بجلی کو آتے ہوئے دیکھ رہے تھے بنی اسرائیل اس موقعہ پر دو وجہ سے غضب الٰہی کے مورد بنے۔ اول تو اس کہنے کی وجہ سے کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے اور محض تمہارے بھروسہ اور اعتماد پر اس کا کلام الٰہی ہونا تسلیم نہ کریں گے۔ یہی ایک گستاخی نزول عذاب کے لیے کافی تھی اس لیے کہ اللہ کے نبی پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرنا اور حسن ظن کے بجائے اس سے بدظنی اور بدگمانی ہونا یہ کچھ معمولی

گستاخی نہیں نبی پر اعتماد نہ کرنا صریح کفر ہے۔ نبیؑ ہی کے اعتماد پر اللہ کی باتوں کو ماننا ایمان ہے اور جو شخص نبی پر اعتماد نہیں کرتا آخر وہ یہ تو سوچے کہ نبیؑ کے بعد پھر کس پر وہ اعتماد کرے گا۔ دوم یہ کہ گستاخانہ اور بے باکانہ طور پر یہ کہدینا کہ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً "کہ ہم موسیٰ کی تصدیق جب کریں گے کہ جب اللہ کو علانیہ اور ظاہر طور پر دیکھ لیں ہاں اگر ادب کے ساتھ یہ کہتے کہ اے موسیٰ کہ ہم دیدار الٰہی کے مشتاق اور آرزومند ہیں تو مورد غضب نہ بنتے اسکا جواب تو یہ ہوتا کہ تم ابھی اس نعمت کے قابل نہیں آخرت میں جب آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک ہو جاؤ گے تب دیکھو گے غرض یہ کہ اس گستاخانہ اور بے باکانہ سوال کی وجہ سے عذاب الٰہی نے آگھیرا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ کہہ کر دیدار الٰہی کا سوال کرنا سو اول تو وہ سوال تھا یعنی عاجزانہ اور مؤدبانہ ایک استدعا اور درخواست تھی مطالبہ نہ تھا دوم یہ کہ وہ ایک والہانہ اور عاشقانہ استدعا و نیاز تھی جو سراسر محبت اور اشتیاق پر مبنی تھی۔ حاشا بنی اسرائیل کی طرح تعنت اور عناد اسکا منشا نہ تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر بعض کا مفصل قصہ سورۃ اعراف میں آئیگا۔ ہم نے تمکو زندہ کیا تمہارے مرجانے کے بعد یعنی حقیقۃً تم مرچکے تھے غشی اور سکتہ کی حالت نہ تھی اور نہ کوئی خواب تھا حقیقۃً مرنے کے بعد ہم نے تم کو اپنی رحمت سے دوبارہ زندہ کیا شاید کہ تم شکر کرو کہ حق جل شانہ نے اپنی رحمت سے ہمارا قصور معاف فرمایا اور اپنی عبادت اور بندگی توبہ اور استغفار انابت اور اعتذار کے لیے اور مہلت عطا فرمائی اور بعث بعد الموت کا نمونہ آنکھوں سے دکھلا دیا تاکہ بعث بعد الموت کے بارہ میں تمکو ذرہ برابر شبہ نہ رہے اور تم اس ایمان شہودی کا شکر ادا کرو۔ ایمان استدلالی میں تزلزل آسکتا ہے مگر ایمان شہودی میں تزلزل ممکن نہیں گویا کہ قیامت تم کو آنکھوں سے دکھلا دی گئی۔

انعام نہم

وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی

جب بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ہوا تو بہت شاق اور گراں ہوا اور بالآخر یہ کہہ دیا کہ اے موسیٰ تم اور تمہارا رب جاکر جہاد اور قتال کرلو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں اس جرم میں چالیس سال تک ایک میدان میں حیران و پریشان پھرنے کی سزا ملی اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ایک سفید ابر سایہ کے لیے بھیجا تاکہ دھوپ کی تکلیف نہ ہو اور کھانے کے لیے من وسلوی نازل فرمایا اور ایک نور کا ستون عطا فرمایا جو اندھیری راتوں میں چاند کا کام دیتا تھا آئندہ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور اے بنی اسرائیل سایہ کیا وادی تیہ میں ہم نے تم پر ابر کا۔ قتادہ سے منقول ہے کہ غمام اس ابر کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ ابر نہایت ٹھنڈا اور پاکیزہ تھا ویسا ابر نہ تھا جو لوگوں میں معروف ہے بلکہ وہ اس قسم کا ابر تھا کہ جس میں بدر کے دن فرشتے نازل ہوئے اور جس میں قیامت کے دن ملائکہ اور حق جل شانہ نزول اجلال فرمائیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِیْ

ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ ۔ ابر دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جو بخار یا دخان وغیرہ کے انجماد سے ظاہر ہو دوسرا وہ جو عالم غیب اور عالم مثال سے بدون کسی سبب ظاہری کے ظہور میں آئے لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ ابر دوسری قسم کا تھا اور اسی طرح قیامت کے دن جو ابر ظاہر ہو گا وہ بھی اسی قسم کا ہو گا۔ اور اتارا ہم نے وادی تیہ میں خزانہ غیب سے تم پر من سلویٰ۔ من ایک شیریں چیز تھی۔ دھنیئے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ رات کو اوس میں برستی صبح کو ہر شخص اپنی ضرورت کے موافق چن لیتا اور سلویٰ ایک پرند کا نام ہے جسکو بٹیر کہتے ہیں یا اور کوئی پرند ہے جو مشابہ بٹیر کے ہوتا ہے شام کو لشکر کے گرد ہزاروں جانور جمع ہو جاتے اندھیرا ہونے کے بعد پکڑ لاتے اور کباب بنا کر کھاتے۔ مدت تک اسی طرح کرتے رہے۔

ف اطباء نے من یعنی ترنجبین کے بہت فوائد بیان کیے ہیں منجملہ انکے یہ ہے کہ اسکو باریک پیس کر سونگھا جائے تو مالیخولیا اور وہم اور وساوس اور دماغی ریاح فاسدہ کے لیے بہت مفید پڑتا ہے عجب نہیں کہ بنی اسرائیل کے دماغوں کے تنقیہ کے لیے من تجویز کی گئی ہو تاکہ اُن کے دماغ اس قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہو جائیں اور بٹیر کا گوشت دل کو نرم کرتا ہے یہ اُن کی قساوت قلبی دور کرنے کے لیے تجویز کیا گیا ہو واللہ اعلم كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ اور کہا ہم نے اُن سے کہ کھاؤ تم اُن پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمکو دیں یعنی یہ چیزیں محض تمہارے کھانے کے لیے اتاری ہیں ذخیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں بنی اسرائیل نے اس حکم کی تعمیل نہ کی اور باوجود اسکے کہ خدا کی رأفت و رحمت کا کرشمہ روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے پھر بھی خدا پر بھروسہ اور اعتماد نہ کیا۔ انجام یہ ہوا کہ جو ذخیرہ رکھتے وہ سڑ جاتا۔ اللہ فرماتے ہیں۔ اور ہمارا کچھ بھی نقصان نہیں کیا۔ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے کہ ایسا رزق کھویا جس میں نہ دنیا کی مشقت تھی اور نہ آخرت کا حساب تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی فضیلت دوسرے حضرات انبیاء کے صحابہ پر ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ صحابہ نے دھوپ اور گرمی میں غزوات اور سرایا کے لیے سفر کیئے مگر کبھی اس قسم کے خوارق کے خواہشمند نہ ہوئے کہ بنی اسرائیل کی طرح ہم پر من وسلویٰ نازل کیا جائے۔ اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے ابر بھیجدیا جائے حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر دعا فرماتے تو ضرور ایسا ہو جاتا۔

انعام دہم

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ الآیہ۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قریہ سے بیت المقدس مراد ہے اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل چالیس سال کے بعد میدان تیہ سے یوشع بن نون علیہ السلام کی معیت میں نکلے۔ جمعہ کی شام کو بیت المقدس فتح ہوا اور کچھ دیر کے لیے سورج روکا گیا یہاں تک کہ یوشع بن نون علیہ السلام کو فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت یہ حکم ہوا کہ تم اس شہر کے دروازہ میں سجدۂ شکر کرتے ہوئے

اور زبان سے استغفار اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور اقرار کرتے ہوئے داخل ہو جیسے حق جل جلالہٗ نے اپنے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو حکم دیا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔

جب اللہ کی نصرت اور فتح آپہنچی اور آپنے لوگوں کو دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوتا ہوا دیکھ لیا تو اسکے شکر میں اللہ کی تسبیح اور تحمید اور استغفار کیجئے بیشک اللہ تعالےٰ بڑا توجہ فرمانے والا ہے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ مکرمہ کے لیے تشریف فرما ہوئے تو مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت خشوع اور خضوع تواضع اور تذلل کے آثار آپؐ سے ظاہر اور نمایاں ہو رہے تھے۔ اس شان سے مکہ میں داخل ہوئے اور فتح ہو جانے کے بعد غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز پڑھی بعض علماء کے نزدیک یہ نماز صلوٰۃ الضحیٰ یعنی چاشت کی نماز تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صلوٰۃ الفتح تھی یعنی فتح مکہ کے شکر کی نماز تھی۔ سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ جب ایوان کسریٰ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو محل میں پہنچ کر آٹھ رکعت نماز پڑھی آئندہ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور یاد کرو اس وقت کو جب کہا ہم نے کہ داخل ہو اس شہر میں پس کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو وسعت اور فراغت کے ساتھ اور داخل ہو اسکے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے یہ شکر بدنی ہوا اور بخشش بخشش کہتے ہوئے۔ یعنی توبہ اور استغفار کرتے ہوئے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہوئے داخل ہو۔ یہ شکر لسانی ہوا اور ان دونوں عملوں کی روح ندامت قلبی ہے پس اگر ایسا کرو گے تو ہم تمہاری تمام خطاؤں کو بخش دیں گے اور اخلاص کے ساتھ نیکی کرنیوالوں کے اجر میں بقدر اُنکے اخلاص کے اور اضافہ کریں گے پس بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس طریقہ کے کہ جو اُن سے کہی گئی تھی۔ بجائے سجدہ کے سرین کے بل داخل ہوتے اور حطۃٌ کے بجائے حَبَّۃٌ فِیْ شَعْرَۃٍ (گیہوں کا دانہ جو کے دانہ میں) ایک مہمل لفظ بطور تمسخر کے کہنے لگے۔ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا تھا ایک عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ حکم عدولی کرتے تھے۔ یعنی اس درجہ بے باک تھے کہ بجائے اسکے کہ نعمت کا شکر کرتے بے ادبی کی اور توبہ اور استغفار کی جگہ مسخراپن اور ہنسی کا طریقہ اختیار کیا اس لیے عذاب دیئے گئے اور بجائے علیہم کے عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا۔ کہنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ عذاب تمام بنی اسرائیل پر نازل نہیں کیا گیا۔ بلکہ خاص ان لوگوں پر نازل کیا گیا جنھوں نے حکم عدولی کی اور اللہ کے حکم کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کیا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں رجز سے مراد طاعون ہے۔ اور سعد بن مالک اور اسامۃ بن زیدؓ اور خزیمۃ ابن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ طاعون رجز یعنی عذاب ہے جس سے پہلے لوگوں کو عذاب دیا گیا (رواہ النسائی) کہا جاتا ہے

کہ اس طاعون سے ایک ساعت میں ستر ہزار آدمی مرے۔

تتمہ انعام دہم وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ۔ الآیہ

(ربط) گزشتہ آیات میں آسمانی خوراک یعنی من وسلویٰ کا ذکر تھا اب ان آیات میں غیبی پانی اور غیبی چشموں کا ذکر فرماتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے ظاہر ہوئے کھانے کے بعد پانی درکار ہوتا ہے۔ پھر لطف یہ کہ جس طرح کھانا بطور خرق عادت عطا فرمایا اسی طرح پانی بھی بطور خرق عادت عطا فرمایا تاکہ خداوند ذوالجلال کی قدرت اور کلیم اللّٰہی اعجاز نبوت و رسالت ظاہر ہو کر قلوب کے لیے موجب سکینت وطمانینت ہو اور اس غیبی طعام و شراب کے استعمال سے قلب کی حالت درست ہو چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اُس قت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے استسقار کی دعاء کی اور خاص اپنی قوم کے لیے خدا سے پانی مانگا۔ یہ قصہ بھی میدان تیہ کا ہے۔ جب بنی اسرائیل پیاسے ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالےٰ شانہٗ سے بنی اسرائیل کے لیے پانی کی دعا مانگی۔ پس کہا ہم نے مار اے موسیٰ اپنے عصار سے پتھر کو پس مارتے ہی فوراً ہی خوب رواں ہو گئے اور خوب بہ نکلے موسیٰ علیہ السلام کے مارنے سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندان کے مطابق بارہ چشمے۔ تحقیق خوب جان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ اس آیت میں حق جل شانہ نے فَانْفَجَرَتْ فرمایا جس کے معنیٰ خوب رواں ہو جانے کے ہیں اور سورہ اعراف میں فَانْۢبَجَسَتْ فرمایا جس کے معنیٰ رسنے اور تھوڑا تھوڑا پانی نکلنے کے ہیں۔ عطا فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السّلام اس پتھر پر بارہ مرتبہ عصا مارتے جس سے ہر جگہ پر عورت کے پستان کے مثل ایک شئ ظاہر ہوتی پھر اس سے پانی رسنا شروع ہوتا اسکے بعد وہ رواں ہوتا اور خوب بہتا۔ (معالم التنزیل) امام رازی فرماتے ہیں ممکن ہے کہ جب ضرورت زیادہ ہوتی ہو اس وقت زیادہ بہتا ہو اور جب ضرورت کم ہوتی ہو تب تھوڑا بہتا ہو۔ اور یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا متعدد اعتبارات سے معجزہ تھا۔ اوّل تو پانی کا پتھر سے نکلنا۔ دوسرے یہ کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے اس قدر کثیر پانی نکلنا۔ تیسرے یہ کہ پانی کا بقدر حاجت نکلنا۔ چوتھے یہ کہ محض عصا کے مارنے سے پانی کا بہ پڑنا۔ پانچویں یہ کہ ضرورت پوری ہو جانے پر پانی کا بند ہو جانا۔ ان اعتبارات سے یہ واقعہ قدرت الٰہیہ کا ایک خاص نشان اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا اور اسکے علاوہ بنی اسرائیل کے لیے ایک عظیم الشان نعمت تھی کہ جس کے بغیر حیات اور زندگی کا بقار ناممکن ہے وہ بغیر کسی مشقت کے عطا فرمائی۔

ف موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعار استسقار خاص اپنی قوم کے لیے تھی اس لیے صرف پتھر سے پانی جاری کیا گیا۔ بخلاف نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور دیگر حضرات انبیار کرام کے کہ انہوں نے خاص اپنی اپنی قوم کے لیے استسقار کی دعا نہیں کی بلکہ تمام جہان کے لیے پانی مانگا اس لیے آسمان سے پانی برسایا گیا اور اُس بارانِ رحمت سے مؤمن اور کافر دوست اور دشمن سب ہی منتفع ہوتے۔

ف | موسیٰ علیہ السلام کا استسقاء کے لیے فقط دعا پر اکتفا فرمانا مسئلہ استسقاء میں امام اعظم قدس اللہ سرہٗ کے مسلک کی تائید کرتا ہے کہ استسقاء کے لیے خاص نماز ضروری اور لازم نہیں فقط دعاء پر بھی اکتفاء کیا جاسکتا ہے۔ نماز استسقاء سنت ہے واجب نہیں۔

اور کہا ہم نے بنی اسرائیل سے کھاؤ اور پیو تم اللہ کے خاص رزق سے جو اللہ تعالےٰ نے خاص طور پر بغیر ظاہری اسباب کے توسط کے تمکو عطاء فرمایا ہے اور دل و جان سے اللہ کا شکر کرو اور اللہ کا رزق کھا کر اس کی معصیت اور نافرمانی پر دلیر مت بنو۔ اور زمین میں فساد مچاتے اور پھیلاتے نہ پھرو یعنی زمین پر اللہ کی معصیت نہ کرو۔

ف | لَا تَعْثَوْا عثیٌ سے مشتق ہے جسکے معنی سخت فساد مچانے کے ہیں۔ یعنی مفسد اور فسادی تو تم پہلے ہی سے ہو مگر خیر اس فساد کو تم اپنی ہی ذات تک محدود رکھو۔ اس میں اور کسی قسم کا اضافہ نہ کرو اور نہ لوگوں میں اسکو پھیلاؤ۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم نہ ٹھہریں گے ایک

طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ

کھانے پر سو پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ نکال دے ہم کو جو اگتا ہے

الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا

زمین سے زمین کا ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور

وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ

پیاز بولا کیا تم لیا چاہتے ہو ایک چیز جو ادنیٰ ہے بدلے

هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ

ایک چیز کے جو بہتر ہے اترو کسی شہر میں تو تم کو ملے گا جو مانگتے ہو اور

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

ڈالی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور کما لائے غصہ

مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اللہ کا یہ اس پر کہ وہ تھے نہ مانتے حکم اللہ کے

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا

اور خون کرتے نبیوں کا ناحق یہ اس سے کہ بے حکم

وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔

ذکر شنائع بنی اسرائیل وبیان تعنت ایشان بانبیاء رب جلیل

شناعت اوّل کفرانِ نعمت بنا بر دناءت وخساست

قال تعالیٰ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ..... الی .... ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ٥۔

(ربط) یہاں تک حق تعالیٰ شانہ نے اپنے انعامات اور احسانات کا ذکر فرمایا آئندہ بنی اسرائیل کی شرارتوں اور عادات شنیعہ اور انبیاء اللہ کے ساتھ انکے تعنت اور عناد کو بیان فرماتے کہ جس قدر ہماری طرف سے اُن پر نعمتیں برستی رہیں اسی قدر انکے تمرد اور سرکشی میں اضافہ ہوتا رہا اور پھر اس سلسلہ میں سب سے پہلی شناعت جو ذکر فرمائی تو وہ کفران نعمت اور انکی طبعی دناءت اور خسست کی ذکر فرمائی کہ جو خسیس کو نفیس پر ترجیح دینے کا باعث بنی اس لیے اب انعامات کے بعد ان کی شناعتوں اور شرارتوں اور عقوبتوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ گزشتہ انعامات کو یاد کر کے اللہ کی محبت اور اسکی اطاعت کی رغبت پیدا ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کمال بے ادبی سے موسیٰ علیہ السلام کا نام لیکر پکارا اور تم نے یہ کہا اے موسیٰ مقتضائے ادب یہ تھا کہ یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ اور یا کلیم اللہ کہہ کر ان سے عرض ومعروض کرتے۔ دوسری گستاخی تم نے یہ کی کہ یہ کہا کہ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے یہ کلام بھی تمہاری اندرونی خباثت اور باطنی شرارت کی خبر دے رہا ہے کہ صبر اور تحمل کر تو سکتے تھے مگر قصداً ہرگز ایسا نہیں کریں گے ورنہ اگر حقیقۃً صبر کی طاقت ہی نہ تھی تو یہ کہنا تھا۔ لن نستطیع الصبر یعنی ہم میں صبر کی طاقت نہیں بلکہ مناسب تو یہ تھا کہ بصد شکر اللہ کی نعمت کو قبول کرتے اور پھر بصد ادب رب العزۃ سے یہ درخواست کرتے۔ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا (اے اللہ ہم تیرے عاجز اور ناتواں بندے ہیں ہم کو صبر اور تحمل

عطا فرما۔

غرض یہ کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لیکر یہ کہا کہ ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے اس لیے آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ نکالے ہمارے واسطے ان چیزوں میں سے کہ جن کو زمین اگاتی ہے ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہنا کہ آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اس کلام سے بیگانگی کی بو آتی ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے تو رب ہیں مگر انکے رب نہیں ہیں اس طرح کیوں نہ کہا فَادْعُ لَنَا رَبَّنَا اے موسیٰ علیہ السلام ہمارے لیے ہمارے رب سے دعا کیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم ادنیٰ چیز کو بہتر اور عمدہ شے کے بدلہ میں لینا چاہتے ہو اتنا نہیں سمجھتے کہ مسور اور وہ پیاز جس کی بدبو سے ملائکۃ اللہ کو نفرت ہے اور پیاز کھانے والے کو بیوت اللہ کے پاس آنے کی بھی ممانعت ہے۔ بھلا ایسی چیزوں کو من اور سلویٰ سے کیا نسبت۔ پھر یہ کہ من وسلویٰ براہ راست خدائے عزوجل کا آسمان سے اتارا ہوا رزق ہے۔ دنیا میں کمانے کی محنت اور مشقت نہیں اور آخرت میں اس پر کوئی حساب نہیں خیر اگر تم اپنی پست ہمتی اور طبعی دناءت سے اس بہترین رزق کے بدلہ میں ایک ادنیٰ اور معمولی سی چیز لینا چاہتے ہو تو کسی شہر میں جا کر اترو پس تمہارے لیے ہوگا جو تم مانگتے ہو۔ سبزی منڈی میں مسور اور پیاز وغیرہ بغیر حاجت دعا کے تم کو مل جائیں گی اور میرے لیے یہ لائق نہیں کہ بارگاہِ خداوندی میں ایسی چیزوں کی درخواست کروں جو پستی اور کم ہمتی پر دلالت کرے۔

ف | ہبوط لغت میں بلندی سے پستی کی طرف آنے کو کہتے ہیں۔ انسان جب تک سفر میں رہتا ہے تو علی العموم سواری پر سوار رہتا ہے جب شہر میں پہنچتا ہے تو سواری سے اتر کر قیام کرتا ہے اس لیے سفر سے شہر میں واپس آنے کو ہبوط اور نزول اور فروکش ہونے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس لفظ میں ان کے معنوی ہبوط کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بلند حالت سے پست حالت کی طرف نزول کیا اور اعلیٰ رزق سے ادنیٰ رزق کی طرف تنزل اختیار کیا۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط اور خیمہ کی طرح ذلت اور رسوائی اور بے چارگی اور بے نوائی ان پر لگادی گئی خیمہ کی طرح ذلت اور بے نوائی نے انکو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ یا اس طرح کہیئے کہ ذلت اور مسکنت کی مہر ان پر لگا دی گئی کہ اب وہ کسی طرح ان سے علیحدہ نہیں ہو سکتی یہود جہاں بھی ہیں وہاں دوسروں کے محکوم اور باج گزار ہی ہیں۔ یہ تو ذلت ہوئی کہ دوسروں کی نظر میں ذلیل ہوئے اور مسکنت یہ کہ خود ان کی طبیعت میں دناءت اور پستی پیدا ہو گئی۔ سرکاری محاصل کے خوف سے ہمیشہ اپنے کو مسکین اور فقیر ظاہر کرتے ہیں ہمیشہ اپنے مال کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس ذلت اور مسکنت سے بڑھ کر یہ ہے کہ اللہ کے غضب کو کمایا۔ جسکو کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ یہ ذلت اور مسکنت اور

خدا کا غضب اس لیے ہوا کہ وہ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے یعنی خود بھی اُن کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے اور انکے نزدیک بھی حضرات انبیاء کے قتل کی کوئی وجہ نہ تھی محض عناد اور سرکشی اسکا باعث ہوئی. انبیاء اللہ کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے انکے جرم کی شدت بتلانے کے لیے بطور تاکید بغیر الحق کا لفظ ذکر کیا گیا جیساکہ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ (اے پروردگار حق کے مطابق حکم دیجئے) اس آیت میں بالحق کا لفظ محض تاکید کے لیے ہے یہ مقصد نہیں کہ معاذ اللہ اللہ کے حکم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حق اور ایک ناحق۔ اس لیے کہ حق تعالٰے شانہٗ کا حکم ہمیشہ حق پر ہوتا ہے اسی طرح انبیاء اللہ کا قتل بھی ہمیشہ ناحق ہوتا ہے، یہود بے بہبود کے جرم کی شدت بیان کرنے کے لیے بغیر الحق کا لفظ محض تاکید کے لیے بڑھایا گیا ہے شاید یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انبیاء کا قتل کبھی حق ہوتا ہے اور کبھی ناحق۔ یا بعنوان دیگر اس طرح سمجھئے کہ بغیر الحق سے ظلم اور تعدی مراد ہے، یعنی سوائے ظلم اور تعدی اور سوائے جور و ستم اور سوائے تمرد اور سرکشی کے اور کوئی امر انبیاء کے قتل کا باعث نہ تھا۔ حضرات انبیاءؑ نے توان کو حق کی دعوت دی اور نصیحت کی اور فلاح دارین کی طرف بلایا اور اُن لوگوں نے انکا ناحق مقابلہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو قتل کرتے تاکہ رشد و ہدایت کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے اور فیض عام کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ اسی لیے ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی کے مورد بنے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالٰے عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زائد سخت عذاب والا قیامت کے دن وہ شخص ہو گا کہ جس کو کسی نبیؑ نے قتل کیا یا اس نے کسی نبیؑ کو قتل کیا۔ یا کسی گمراہی کا پیشوا یا تصویر بنانے والا۔ (مسند احمد)

ف عبداللہ بن عباس اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں جن پیغمبروں کو حق جل شانہٗ نے کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم دیا انہی سے دشمنوں کے مقابلہ پر فتح و نصرت کا وعدہ کیا۔ کما قال تعالٰے۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وہ پیغمبر صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ نصر عبدہٗ و ھزم الاحزاب وحدہٗ کے مصداق بنے وہ کبھی دشمنوں کے ہاتھ سے مقتول نہیں ہوئے اس لیے کہ حق جل شانہ کا انکو جہاد کا حکم دینا پھر انکی صیانت اور حفاظت نہ فرمانا بظاہر شان حکمت کے مناسب نہیں معلوم ہوتا ایسے ایسے حضرات ہمیشہ مظفر و منصور ا اور اُن کے دشمن ہمیشہ خائب و خاسر ہوئے اور جن پیغمبروں کو جہاد و قتال کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ اُن سے حق جل و علا نے کوئی عصمت اور نصرت کا وعدہ فرمایا ان میں سے جس کو چاہا جام شہادت پلایا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تاکہ اُن کے مدارج اور مراتب میں عزت اور وجاہت میں اور قربت الٰہی اور رفعت شان میں

اضافہ ہو۔ اور ان کے دشمنوں پر ذلت اور مسکنت خواری اور رسوائی گدائی اور بینوائی کی مہر لگے کذا فی روح البیانؒ و جامع الاحکام للامام القرطبی ص ۴۳۲ ج ۱ ۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ یعنی آیات الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ کے قتل کی جرارت اور دلیری ان میں اس طرح پیدا ہوئی کہ وقتاً فوقتاً اللہ کی نافرمانیاں کی اور حدود الٰہیہ سے تجاوز کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ معصیت اور نافرمانی دلوں میں راسخ ہوگئی اور اس نے آیات الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ کے قتل پر آمادہ کر دیا لیکن اب بھی اگر تم صمیم قلب سے ایمان لے آؤ تو توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے توبہ کر لینے سے تمہارا ہر قسم کا کفر اور پیغمبروں کے قتل کرنے کا جرم بھی معاف ہو سکتا ہے اگر یہ چاہتے ہو کہ ذلت سے نکل کر عزت میں آجاؤ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کفر سے توبہ کرو اور ایمان اور عمل صالح اختیار کرو ۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى

یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوتے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ

وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

اور صابئین جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور

عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا

کام کیا نیک تو انکو ہے اُن کی مزدوری اپنے رب کے پاس اور نہ

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں

ؒ قال ابن عباس والحسن لم یقتل قط من الانبیاء الا من لم یومر بقتال وکل من امر بقتال نصر فظهر انه لا تعارض بین قوله تعالیٰ و یقتلون النبیین بغیر الحق وقوله تعالیٰ انا لننصر رسلنا وقوله تعالیٰ ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین ۱۲ روح البیان ص ۱۰۳ ج ۱ ۔ جامع الاحکام للقرطبی

ذلّت سے نکلنے اور عزّت میں داخل ہونیکا طریقہ

قال تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا ... الی ... وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

تحقیق وہ لوگ کہ جو ایمان لائے پہلے انبیاءؑ پر یا وہ لوگ جو محض زبان سے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان کے مدعی بنے اور دل سے اس دین کو سچا نہیں سمجھتے اور وہ لوگ کہ جو یہودی ہوئے جن کی قباحتیں حد سے گزر چکی ہیں یہاں تک کہ جسم حیوانی میں خداوند قدوس کے حلول کے قائل ہوئے۔ اور خدا کے بعض نبیوں کو قتل کیا اور زنا اور جادو کی تہمت ان پر لگائی اور نصاریٰ جنہوں نے حضرت مسیح بن مریمؑ کو خدا بنایا اور فرقہ صابئین بے دین لوگ جنہوں نے کواکب کی پرستش کی باوجود ان شنائع اور قبائح کے اور باوجود حق سے بعید ہو جانے کے جو شخص بھی ان میں سے اخلاص کے ساتھ اللہ پر بغیر تشبیہ اور بغیر تعطیل اور بغیر تشریک اور تجسیم کے اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اس کے لیے خدا کے یہاں ثواب اور اجر ہے، اور نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ڈر ہے یعنی اس سے نہ ڈریں کہ گزشتہ کفر نقصان اجر کا باعث ہوگا اس لیے کہ الاسلام یھدم ما کان قبلہ۔ اسلام لانا ان تمام گناہوں کو ڈھا دیتا ہے جو اسلام لانے سے پیشتر کیے جا چکے ہیں اور نہ وہ غم کھاویں کہ افسوس ہماری تمام زندگی یوں ہی ضائع اور برباد گئی، اعمال صالحہ سے گزشتہ کی تلافی ہو جائے گی۔

خلاصۂ مطلب یہ کہ کسی فرقہ کی تخصیص نہیں جو بھی ایمان لے آئے وہ عذاب الٰہی سے نجات پا جائے گا

تنبیہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقط اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی ہے انبیاء اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ قرآن کریم کی صدہا نصوص اس بات پر صراحۃً دال ہیں کہ جو شخص انبیاء اور ملائکہ کا انکار کرے وہ قطعًا کافر ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سلسلۂ ایمان میں جن جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اوّل سے آخر تک سب پر ایمان لائے چونکہ سلسلۂ ایمان کی ابتداء اللہ سے ہوتی ہے اور انتہاء آخرت پر ہے اس لیے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کی تخصیص کی گئی۔ جیسا کہ رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ میں ابتداء اور انتہاء کو ذکر کر کے تمام سلسلہ مراد ہے، نیز اللہ اور یوم آخرت پر

ۓ اور بعض مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے وہ لوگ مراد ہیں جو ظاہراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانی ایمان لائے عام اس سے کہ ایمان دل میں داخل ہوا یا نہیں اس تقدیر پر اس میں منافقین بھی داخل ہوں گے اور اخیر آیت مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ میں اخلاص کے ساتھ ایمان لانا مراد ہوگا لہذا ایمان کا ذکر آیت میں مکرر نہ ہوگا۔

ایمان لانا اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک انبیاء اور ملائکہ اور صحف سماویہ پر ایمان نہ لائے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور آخرت کے احوال کی معرفت کا ذریعہ انبیاء اور صحف الٰہیہ ہی ہیں اور وحی اور صحیفۂ ربّانی کا نزول فرشتہ کی وساطت سے ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرت موقوف ہے ایمان بالانبیاء اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب پر اس لیے ان تین چیزوں پر ایمان لانے کو علیحدہ بیان نہیں کیا گیا۔

ف صابئین ایک فرقہ ہے کہ جو کسی آسمانی دین اور شریعت کا قائل نہیں خدا اور بندہ کے درمیان میں روحانیات کو واسطہ قرار دیتے ہیں کہ بندہ کو جو فیض بھی حاصل ہوتا ہے وہ روحانیات کے واسطہ سے ہوتا ہے نبوت و رسالت کے سرے سے قائل نہیں۔ کہتے ہیں کہ پیغمبروں کی کوئی حاجت نہیں تفصیل اگر درکار ہو تو تفسیر ابن کثیر وغیرہ کا مطالعہ فرمائیں۔

علامہ شہرستانیؒ نے اپنی ملل ونحل میں حنفاء اور صابئین کا ایک مناظرہ ذکر فرمایا ہے جو قابل دید ہے اس ناچیز نے اپنے "علم الکلام" میں اسکا ترجمہ بھی کیا ہے جو بحمدہٖ تعالیٰ شائع ہو چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ صابئین کے بارہ میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کا مذہب کیا ہے۔

(۱) قول اوّل مجاہد اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ صابئین ایک قوم اور فرقہ ہے جسکا دین یہودیت اور مجوسیت سے مل کر بنا ہے۔

(۲) قول دوم: قتادہ کہتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتی ہے اور سورج کی طرف منہ کر کے روزانہ پانچ نمازیں پڑھتی ہے اور قتادہ سے یہ بھی منقول ہے کہ دین پانچ ہیں جس میں سے چار تو شیطان کے لیے ہیں اور ایک دین رحمٰن کے لیے سو صابئین جو فرشتوں کو پوجتے ہیں اور مجوس جو آتش پرست ہیں اور مشرکین جو بتوں کو پوجتے ہیں اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ۔ ان سب فرقوں کے دین شیطان کے لیے ہیں۔

(۳) قول سوم: صابئین وہ گروہ ہے جو ستاروں کی عبادت کرتے ہیں امام رازی فرماتے ہیں کہ یہی قول اقرب الی الصواب ہے اور اس فرقہ کے دو عقیدے ہیں ایک تو یہ کہ خالق عالم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اس نے حکم دیا ہے کہ ان ستاروں کی تعظیم کی جائے اور انکو نماز اور دعا کا قبلہ ٹھہرایا جائے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے افلاک اور کواکب کو پیدا کیا پھر تمام عالم کے خیر و شر، صحت و مرض کے مدبر یہی کواکب ہیں اور یہی ان سب چیزوں کے خالق ہیں اس لیے بشر پر انکی تعظیم اور عبادت فرض ہے کیونکہ عالم کے الٰہ اور معبود یہی ہیں اور یہی عالم کے مدبر ہیں۔ پھر یہ کواکب اللہ کی عبادت کرتے ہیں کیدانیوں کا یہی مذہب تھا جنکے رد اور ابطال کے لیے حضرت

ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ (تفسیر کبیر ص۳۸۱ ج۱) امام قرطبی فرماتے ہیں کہ صابئین کے مذہب کا حاصل یہ ہے۔ کہ یہ لوگ موحد تھے مگر تاثیر نجوم کے قائل تھے اور کواکب کو مدبر عالم سمجھتے تھے اسی وجہ سے جب خلیفہ قادر باللہ نے صابئین کے متعلق۔ ابو سعید اصطخری سے دریافت کیا تو ابو سعید نے انکے کفر کا فتویٰ دیا۔ (تفسیر قرطبی ص۴۳۵ ج۱)

اور اہل لغت اس شخص کو صابی کہتے ہیں جو ایک دین سے خارج ہو کر دوسرے دین میں داخل ہو گیا ہو اسی واسطے اہل عرب مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ آبائی دین چھوڑ کر ایک نئے دین یعنی دین اسلام میں داخل ہو گئے اور اس فرقہ کو صابئین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دین موسوی اور دین عیسوی سے نکل کر فرشتوں اور کواکب کی عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحبؒ تفسیر حقانی ص۱۹۰ ج۱ میں لکھتے ہیں صابی ایک قدیم فرقہ تھا حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں اس فرقہ کا بڑا زور تھا۔ شہر بابل اور نینوی کے لوگ بھی یہی مذہب رکھتے تھے یہ معلوم نہیں کہ اس گروہ کی ابتدا کب سے ہوئی اسکا اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ جوہر مجرد ہے بندہ کی جو مادی ہے کسی طرح رسائی ممکن نہیں اس کی پرستش اسکے مظاہر کی پرستش ہے پھر اس کے دو گروہ ہو گئے ایک وہ جو ستاروں اور آفتاب اور ماہتاب اور عناصر کی پرستش کرتے تھے دوم وہ جو اصنام کو رب کا مظہر سمجھ کر پوجتے تھے اس لیے یونان میں زہرہ وغیرہ ستاروں کے نام کے معبد بنے ہوئے تھے۔ پھر آگے چل کر اور بہت سی شاخیں ہو گئیں۔

ایران کے آتش پرست اور ہندوستان کے قدماء وید ماننے والے بھی اسی گروہ کی شاخ ہیں۔ پھر ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں اس مذہب نے ایک نیا رنگ بدلا اور نیا نام پیدا کیا۔ انتہی کلامہ۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا

اور جب لیا ہم نے قرار تم سے اور اونچا کیا تم پر پہاڑ پکڑو جو

مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ

ہم نے دیا تم کو زور سے اور یاد کرتے رہو جو اس میں ہے شاید تم کو

تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ

ڈر ہو پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا فضل

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾

اللہ کا تم پر اور اس کی مہر تو تم خراب ہوتے

شناعت دوم

قال تعالیٰ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ .... الی .... وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(ربط) گزشتہ آیات میں ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے اجر کا وعدہ فرمایا اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رغبت اور خوشی سے احکام خداوندی پر عمل کرنا محبین اور مخلصین کا کام ہے۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ ہے کہ جب تک ان پر تشدد اور سختی نہ کیا جائے اس وقت تک وہ عمل نہیں کرتے۔ نیز گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے جس استبدال کا ذکر تھا وہ نافرمانی کا آغاز تھا اب ان آیات میں اُن کی اُس نافرمانی کا ذکر ہے جو ان سے علانیہ طور پر ظاہر ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ ہمکو کوئی کتاب عطا کی جائے جس میں عبادت اور بندگی کے طریقے مذکور ہوں تو ہم ضرور اس پر عمل کریں گے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے توریت نازل فرمائی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ توریت کو قبول کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں۔ بنی اسرائیل نے بعض احکام شاقہ کی وجہ سے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایک پہاڑ لا کر انکے سروں پر قدآدم اونچا کھڑا کر دو جبرئیل نے حکم الٰہی کے مطابق پہاڑ ان کے سروں پر لا کھڑا کر دیا اور یہ کہا اگر تم تورات کو قبول نہ کرو گے تو یہ پہاڑ تم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ (معالم التنزیل)

بنی اسرائیل فوراً سجدہ میں گر گئے اور توریت پر عمل کرنے کا اقرار کیا۔ اس آیت میں حق جل شانہ نے اسی واقعہ کو یاد دلایا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے توریت پر عمل کرنے کا پختہ عہد لیا۔ اور اٹھایا تم پر کوہ طور کو تاکہ تم توریت کو قبول کرو یعنی مضبوط پکڑو تم اس چیز کو جو ہم نے تم کو عطا کی یعنی توریت اسکو مضبوطی اور قوت کے ساتھ پکڑو اور فقط ظاہر توریت پر عمل کرنے پر اکتفا مت کرو بلکہ جو توریت میں ہے اس کو بار بار کرو اور اسکے اسرار اور فوائد میں غور اور فکر کرو شاید تم دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ۔ اور مقام تقویٰ تم کو حاصل ہو جائے۔

ف | بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے بار بار اس کی درخواست کی کہ آپ اللہ سے استدعا کیجیئے کہ ہم کو کوئی ایسی کتاب عطا فرمائے جو احکام الٰہیہ کی جامع ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے اس کا پختہ عہد لیا کہ جب وہ کتاب عطا ہو تو ضرور اس پر عمل کرنا اگرچہ اس کے احکام تمہاری نفسانی

خواہشوں کے خلاف ہوں۔ بنی اسرائیل نے اقرار کیا کہ ہم ضرور اس پر عمل کریں گے جب اللہ تعالیٰ نے توریت عطا فرمائی تو اسکے قبول کرنے سے اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے سرتابی کی اسس عہد شکنی سے باز رکھنے کے لیے کوہ طور کو ان کے سروں پر لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ پہاڑ کا ان کے سروں پر لاکر کھڑا کر دینا ایمان لانے پر مجبور کرنے کے لیے نہ تھا اس لیے کہ ایمان تو وہ پہلے ہی سے لا چکے تھے۔ فقط نقض عہد سے روکنے کے لیے تھا جیسے مسلمانوں پر حدود اور قصاص اور تعزیرات کا قائم کرنا از قبیل اکراہ نہیں بلکہ زنا اور سرقہ اور شرب خمر، خونریزی اور رہزنی اور اس قسم کے تمام فواحش سے روکنے کے لیے ہے ہاں اگر پہاڑ کا معلق کرنا دین قبول کرنے کے لیے ہوتا تب آیۃ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف ہوتا۔ پہاڑ کا سر پر لا کھڑا کرنا محض عہد شکنی اور بدعہدی اور ایک ناشائستہ حرکت سے روکنے کے لیے تھا نہ کہ دین قبول کرنے کے لیے ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ تم نے پھر اس کے بعد بھی روگردانی کی۔ یعنی پھر تم ان تاکیدوں اور پختہ عہدوں کے بعد بھی احکام توریت سے منحرف ہو گئے پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔ تمہاری بدعہدی اور عہد شکنی کا اقتضا تو یہ تھا کہ تم کو فوراً عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا مگر اسکے فضل اور رحمت نے تمکو عذاب سے بچایا اور تم کو توبہ اور استغفار کے لیے مزید مہلت دی اور اب تک توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے لہٰذا نبی آخر الزمان کی متابعت کی سعادت حاصل کرو اور اگر تم اس نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائے اور کفر پر مر گئے تو پھر اس خسران اور نقصان کی تلافی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ توریت میں جو تم سے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا عہد لیا جا چکا ہے اسکو پورا کرو ورنہ تم بھی عہد شکنی کرنے والوں میں شامل سمجھے جاؤ گے اور عہد شکنی کی سزا کے مستحق ہو گے۔ آئندہ آیت میں بطور نظیر حکم شریعت سے انحراف کے دنیوی زیان اور نقصان کو بیان فرماتے ہیں کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ پہلے لوگوں نے ہفتہ کے بارہ میں توریت کے حکم سے عدول کیا اور پیغمبر کی متابعت سے انحراف کیا سوائے مسخ اور لعنت کے کیا ملا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ

اور جان چکے ہو جنہوں نے تم میں زیادتی کی ہفتے کے دن میں

فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝۶۵ فَجَعَلْنٰهَا

تو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر پھٹکارے پھر ہم نے وہ

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً

دہشت رکھی اس شہر کے روبرو والوں کو اور پیچھے والوں کو اور نصیحت رکھی

لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

ڈر والوں کو

شناعت سوم

قال تعالیٰ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ..... الی.... وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ٥

اور البتہ تحقیق تم خوب جان چکے ہو حال ان لوگوں کا کہ جنہوں نے ہفتہ کے دن حد سے تجاوز کیا پس کہا ہم نے ان سے کہ بن جاؤ بندر ذلیل یعنی دھتکارے ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شہر دریا کے کنارہ آباد تھا جس میں بنی اسرائیل کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت تھی۔

بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے ہفتہ کے روز مچھلیاں دریا کے کنارہ پر بکثرت جمع ہو جاتیں اور ہفتہ گزرنے کے بعد یہ حالت ہوتی کہ ایک مچھلی بھی نظر نہ آتی، بنی اسرائیل نے جب یہ حالت دیکھی تو شکار کرنیکا ایک حیلہ نکالا کہ لب دریا چھوٹے چھوٹے حوض بنائے اور دریا سے پانی اور مچھلیاں آنے کے لیے نالیاں بھی بنائیں ہفتہ کے روز جب وہ حوض مچھلیوں سے بھر جاتے تو وہ نالیاں بند کر دیتے اور یکشنبہ کو ان کا شکار کرتے۔ عرصہ تک اسی طرح کرتے رہے اسی بستی میں اُن کے علاوہ بنی اسرائیل کے اور دو فریق تھے ایک فریق انکو اس حیلہ سے منع کرتا اور دوسرا فریق یہ سمجھ کر کہ انکو نصیحت کرنا بے سود ہے اس لیے خاموش رہتا نصیحت کرنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو بستی کو تقسیم کر لیا اور درمیان میں ایک لمبی دیوار کھینچ لی اس طرح سے شہر دو حصوں پر منقسم ہو گیا اور آمد و رفت کے لیے درمیان میں دروازہ رکھ لیا اور ہر فریق علیحدہ رہنے لگا جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت فرمائی۔ نبیؑ کی بددعا سے بندر بنا دیئے گئے۔ مرد بندر اور عورتیں بندریاں بنا دی گئیں جب صبح ہوئی اور کوئی چلتا پھرتا نظر نہ آیا تو وہ لوگ جنکو اللہ نے اس عذاب سے محفوظ رکھا تھا آپس میں کہنے لگے کہ کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے جو بنی اسرائیل نظر نہیں آتے اور سخت متردد ہوئے جا کر دیکھا تو مکانات کے دروازے بند تھے۔ کسی طرح دروازے کھول کر اندر داخل ہوتے دیکھا سب بندر بنے ہوئے ہیں جو شخص ان کو دیکھنے آتا تو بطور توبیخ اور ملامت یہ کہتا کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو وہ کمال حسرت سے سر ہلاتا کہ بیشک تم نے منع کیا تھا۔ اور یہ لوگ آنکھوں سے پہچانے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہے اور وہ فلاں تین دن تک اسی حالت میں رہے پھر سب مر گئے یہ تمام تفصیل امام ابن جریر

طبری اور حافظ ابن کثیر نے اپنی اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حقیقۃً بندر بنا دیئے گئے تھے یعنی صورتیں اور شکلیں بندروں کی بن گئیں وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ط۔ اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں اور آثار صحابہ اور تابعین بھی اسکی شہادت دے رہے ہیں اور اسی پر تمام امت کا اجماع ہے کہ وہ لوگ حقیقۃً بندر بنا دیئے گئے تھے۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ حقیقۃً بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ اُن کے اخلاق اور عادات بندروں جیسے ہو گئے تھے تو یہ صریح خطا ہے۔ ظاہر قرآن اور ظاہر روایات اور اجماع سلف کے خلاف ہے۔ کافروں کے اخلاق تو ہر زمانہ میں بندروں سے بھی بڑھ چڑھ کر رہے ہیں اور اب تو ترقی کا دور ہے اور اس زمانہ کے کافر تو اخلاق میں بندر اور سور سے بھی بڑھ کر ہیں یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کی خصوصیت نہیں۔

ف مسخ کی تین قسمیں ہیں۔

اوّل: مسخ حقیقی۔ یعنی حقیقت اور ماہیت کا بدل جانا جیسے گوشت کا پتھر ہو جانا جیسا کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے۔

دوسرے: مسخ صوری۔ یعنی حقیقت انسانیہ تو باقی رہے اور فقط صورت اور شکل بدل جائے جیسے اس قصہ میں ہوا کہ بنی اسرائیل کی فقط صورتیں اور شکلیں مسخ کی گئیں کہ بجائے صورت انسانی کے بندر کی صورت بنا دیئے گئے مگر حقیقت انسانی جسکے ذریعہ سے انسان ادراک اور احساس کرتا ہے وہ بحالہ باقی تھی گویائی اور بولنے کی قوت سلب کر لی گئی تھی مگر عقل باقی تھی جس کے ذریعہ سے اپنی صورت بدلنے کا ادراک کرتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ ہماری نافرمانی کی سزا ہے مسخ سے فقط اُن کی انسانی صورت زائل ہوئی اور فہم اور شعور انسانی سب باقی رہا۔ اسی لیے خَاسِئِيْنَ ذوی العقول کی جمع لائی گئی تاکہ ادراک انسانی کی بقاء پر دلالت کرے۔

قِرَدَةً کے لفظ سے بندر کی صورت ہونا معلوم ہوا اور کُوْنُوْا کے خطاب اور خَاسِئِيْنَ سے عقل اور انسانی شعور کا باقی رہنا معلوم ہوا۔ اور جب ڈاروِن کی تحقیقات پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک بندر ترقی کر کے انسان بن سکتا ہے تو اگر انبیاء اللہ کے مقابلہ میں ترقی معکوس ہو کر انسان سے بندر بن جاتے تو کیوں محال ہے حرکت کی مسافت ایک ہے حیوانیت سے انسانیت کی طرف ہو یا انسانیت سے حیوانیت کی طرف ہو۔ حیوان کو انسان بنتا تو کسی نے دیکھا نہیں اور ہزارہا انسانوں کو بندر بنتے ہوتے لاکھوں انسانوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قرآن اور حدیث نے اسکی خبر دی۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ — جسکا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔

عطاء خراسانی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آواز دی گئی۔

یا اھل القریۃ کُونُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ۔ — اے بستی والو ہو جاؤ بندر ذلیل۔

اسکے بعد لوگ اُن کے پاس آتے اور یہ کہتے کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو سر سے اشارہ کرتے کہ بے شک۔

تیسرے: مسخ معنوی یعنی صفات نفسانیہ کا بدل جانا۔ مثلاً قناعت کا حرص اور طمع سے فہم و فراست کا سفاہت و بلادت سے بدل جانا کہ پہلے قانع تھا اب حریص بن گیا۔ پہلے متواضع تھا اب متکبر ہو گیا اس کو مسخ معنوی کہتے ہیں جسکو حق تعالیٰ نے ختم اور طبع کے ساتھ تعبیر کیا ہے اور آیت کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا اور فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ میں۔ گدھے اور کتے کی مثال سے مسخ معنوی مراد ہے۔

بنی اسرائیل کا مسخ معنوی پہلے ہو چکا تھا اس وقت تو فقط مسخ صوری ہوا کہ بجائے شکل انسانی کے بندر کی شکل بنا دیئے گئے اس لیے کہ مسخ معنوی تو اُسی وقت ہو چکا تھا کہ جب انبیاء اور علماء کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کَمَثَلِ الْحِمَارِ اور کَمَثَلِ الْكَلْبِ کا مصداق بن چکے تھے۔

آئندہ آیت میں اس مسخ صوری کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے بندر بنائے گئے تاکہ نافرمانوں کو عبرت اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ نافرمانوں کو مسخ صوری ہی سے عبرت ہو سکتی ہے۔ مسخ معنوی میں تو دوسرے نافرمان بھی انہی کے شریک اور ہم پلہ ہیں۔

ف | ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جنکو اللہ تعالیٰ نے بندر بنایا وہ تین دن سے زائد زندہ نہیں رہے اور نہ انکی نسل چلی اور یہ بندر جو فی الحال موجود ہیں انکی نسل سے نہیں بلکہ یہ اصل بندر ہیں (ابن کثیر)

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ؁ پس بنایا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان بستیوں کے لیے جو اس شہر کے سامنے اور پیچھے آباد تھیں اور نصیحت بنایا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے یعنی تاکہ نافرمانوں کو اس واقعہ سے عبرت ہو اور فرمانبرداروں کو نصیحت ہو۔ مثل مشہور ہے۔

العبد یقرع بالعصا	غلام کو لکڑی سے تنبیہ کی جاتی ہے
والحر تکفیہ الملامۃ	اور شریف کو ملامت ہی کافی ہوتی ہے۔

(ربط) اب آئندہ آیات میں ان کی روگردانی کا ایک اور واقعہ ذکر فرماتے ہیں کہ وحی الٰہی پر اطمینان نہ کیا اور معاندانہ سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ
اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ فرماتا ہے تم کو کہ
تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ
ذبح کرو ایک گائے بولے کیا تو ہم کو پکڑتا ہے ٹھٹھے میں کہا پناہ
بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا
اللہ کی اس سے کہ میں ہوں نادانوں میں بولے پکار ہمارے واسطے
رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
اپنے رب کو کہ بیان کردے ہم کو کہ وہ کیسی ہے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے
لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا
نہ بوڑھی اور نہ بن بیائی میانہ ہے ان کے بیچ اب کرو جو
مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا
تم کو حکم ہے بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کردے ہم
لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ
کو کیسا ہے رنگ اس کا کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے زرد
فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ
ڈہڈہا رنگ اس کا خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب
يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ
کو بیان کردے ہمکو کس قسم میں ہے وہ گایوں میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
اللہ نے چاہا تو راہ پالیں گے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک

بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ج

گائے ہے محنت والی نہیں کہ باہتی ہو زمین کو یا پانی دیتی ہو کھیت کو

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ط قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط

بدن سے پوری ہے داغ کچھ نہیں اسمیں بولے اب لایا تو ٹھیک بات

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ ع

پھر اسکو ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ کریں گے

ع ۸ ۱۰

شناعت چہارم معاندانہ سوالات

قال تعالیٰ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ... الیٰ ... وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

اور یاد کرو اس وقت کو کہ بنی اسرائیل میں ایک متمول اور مالدار شخص جسکا نام عامیل کہا جاتا ہے سوائے بھتیجے کے اور کوئی اسکا وارث نہ تھا ایک مدت تک اسکے مرنے کا منتظر رہا جب دیکھا کہ وہ مرتا ہی نہیں تو ایک روز موقعہ پاکر قتل کر ڈالا اور شب میں اسکی نعش کو محلہ میں لا ڈالا جب صبح ہوئی تو اہل محلہ پر خون کا دعویٰ کیا۔ تاکہ ترکہ کے علاوہ اہل محلہ سے مقتول چچا کی دیت اور خون بہا بھی وصول کرے۔ جیساکہ ہماری شریعت میں قسامت کا حکم ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل محلہ سے دریافت کیا تو اہل محلہ نے قسم کھاکر بیان کیا کہ واللہ نہ ہم نے قتل کیا اور نہ ہمکو قاتل کا کوئی علم ہے۔ اے بنی اللہ اور اے کلیم اللہ آپ ہی بارگاہِ خداوندی میں عرض معروض کیجئے تاکہ اس واقعہ کی حقیقت منکشف ہو (تفسیر ابن کثیر)

اس وقت اللہ کی یہ وحی نازل ہوئی کہ تحقیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمکو یہ حکم دیتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس گائے کا ایک ٹکڑا اس مقتول پر لگا دو تھوڑی دیر کے لیے وہ مقتول زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام اور پتہ بتلا دے گا۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ انکار کی گنجائش نہ رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر بذریعۂ وحی اسکا نام بتلا دیتے تو ممکن تھا کہ یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرتے اور انکی بات کا یقین نہ کرتے اور کفر میں مبتلا ہوتے۔ اور جب ایک مردہ زندہ ہو کر خبر دے گا تو اس میں نہ تو کذب کا احتمال ہوگا اور نہ کسی کو چون وچرا کی گنجائش ہوگی اس لیے کہ جو شخص ابھی عالم غیب سے آیا ہو وہ کیسے جھوٹ بول سکتا ہے نیز اس میں ایک حکمت یہ تھی کہ لوگ

یہ سمجھ جائیں کہ گائے اور بچھڑا جس کو بنی اسرائیل نے معبود بنا لیا تھا وہ اس قابل نہیں کہ اسکی پرستش کی جائے وہ تو ذبح ہونے کے قابل ہے۔

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔
بنی اسرائیل یہ حکم سنکر بولے کیا آپ ہم سے تمسخر کرتے ہیں۔ بھلا گائے کے ذبح کرنے اور قاتل کے معلوم ہونے میں کیا مناسبت۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ بتلاؤ اور آپ فرماتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کرو۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے اسکی کہ میں نادانوں سے ہوں سوال کے مطابق جواب نہ دینا اور استہزاء اور تمسخر کرنا جاہلوں کا کام ہے معاذ اللہ انبیاء اللہ کا کام نہیں۔ اور پھر وہ بھی احکام الٰہیہ میں۔

بنی اسرائیل اپنے زعم میں اس سوال کو فلسفہ سمجھے مگر حقیقت میں سراسر جہل اور سفہ تھا۔ یہ نہ سمجھا کہ احکام الٰہیہ کے اسرار سوائے مقربین بارگاہِ خداوندی کے کس کو معلوم ہو سکتے ہیں اور اسباب اور مسببات کے ارتباط اور مناسبت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ گائے کے پارچہ لگا دینے سے مردہ کا بول اٹھنا گائے کا ذاتی اور طبعی خاصہ نہیں بلکہ قدرتِ الٰہیہ کا کرشمہ اور بارگاہ کلیم اللہی کا معجزہ ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کہنے کے بعد یہ سمجھے کہ یہ حکم تو اللہ کی طرف سے آہی چکا ہے جس کی تعمیل ناگزیر ہے اس لیے یہ خیال ہوا کہ جس گائے کے ذبح کا حکم ہوا ہے غالباً وہ کوئی عجیب و غریب گائے ہوگی اس لیے بار بار سوالات کیے کہ وہ کیسی گائے ہے اُسکا رنگ کیسا ہے اسکی عمر کیا ہے وغیرہ ذلک۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کسی گائے کو بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا لیکن انہوں نے تشدد کیا تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی اس لیے کہ حق تعالیٰ نے کسی خاص اور معین گائے کے ذبح کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً میں لفظ بقرۃً نکرہ مستعمل ہوا ہے جس سے صاف ظاہر تھا کہ تعین مقصود نہیں بلکہ تعمیل مقصود ہے اگر تخصیص اور تعیین مطلوب ہوتی تو اَنْ تَذْبَحُوا الْبَقَرَةَ الف لام کے ساتھ معرفہ لایا جاتا۔

آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کے تعنت آمیز سوالات کا ذکر ہے قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ۔ کہا انہوں نے کہ آپ اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ بیان کرے کہ وہ گائے کیا چیز ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے کیونکہ یہ خاصیت نہ تو متعارف گائے کی ہے نہ نیل گائے کی معلوم ہوا کہ جس گائے کی یہ خاصیت ہے اس کی حقیقت ہی کچھ اور ہوگی اگرچہ نام اسکا گائے ہوگا مگر ماہیت نوعیہ اسکی بالکل جدا ہوگی۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے

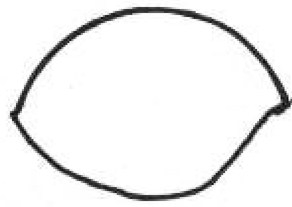
کہ تحقیق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے یعنی اسی جنس کی ہے کسی دوسری جنس کی گائے نہیں اور نہ اسکی کوئی نئی حقیقت ہے اسی قسم کی ایک گائے ہے حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں البتہ سن اور عمر کے اعتبار سے کچھ فرق ہوگا وہ یہ کہ وہ نہ بوڑھی۔ نہ جوان بلکہ متوسط اور بین بین ہو یعنی میانہ سال ہو جسکو ادھیڑ کہتے ہیں۔ پس فوراً کر گزرو جو حکم دیئے گئے ہو۔ کوئی دشوار امر نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو خواب کے اشارہ پر بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے اور تم ایک گائے کے ذبح میں ہزار حجتیں کر رہے ہو۔ رہا خواص اور آثار کا پیدا ہونا سو وہ محض اللہ کے ارادہ اور مشیت پر ہے حقیقت اور ماہیت کے اقتضاء پر موقوف نہیں۔ وہ جب چاہے اپنی قدرت سے یہ خواص پیدا کر سکتا ہے مگر انکو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور مکرر سوال کیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ط قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ کہا انہوں نے کہ آپ اپنے پروردگار سے استدعا کیجئے کہ ہمارے لیے بیان فرمائے کہ اسکا رنگ کیا ہے۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ تحقیق اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے زرد رنگ والی ہے رنگ اس کا تیز اور کھلا ہوا ہے۔ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور پھر سوال کیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ - قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ط قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ - کہا انہوں نے کہ آپ دعا کیجئے اپنے رب سے کہ بیان فرمائے ہمارے لیے کہ اس گائے کی حقیقت مشخصہ کیا ہے جس کی یہ خاصیت ہے۔ اگرچہ اس کا سن اور سال رنگ اور جمال سب بتلا دیا گیا لیکن اب بھی آپکو پورا انکشاف نہیں ہوا تحقیق گائیں ہم پر مشتبہ ہو گئیں ہیں۔ یہ اوصاف بہت سی گایوں میں پائے جا سکتے ہیں کوئی وجہ ترجیح بیان فرمایئے کہ یہ خاصیت اس گائے میں کس بناء پر ہے لہذا مزید توضیح کے لیے کچھ اوصاف بیان فرما دیئے جائیں۔

اور انشاء اللہ تعالےٰ یعنی اگر خدا نے چاہا تو ہم ضرور پتہ چلا لیں گے کہ اس گائے میں یہ خاصیت عجیبہ کس بناء پر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی پتہ نہ چلتا یعنی اس کلمہ کی برکت سے انکا تحیر اور تردد رفع ہوا۔ جب تک اپنے عجز کا اقرار و اعتراف اور اسکی قدرت اور مشیت سے استعانت نہ ہو کوئی عقدہ حل نہیں ہو سکتا۔

ف (۱) | مَا هِيَ ۔ یہ پہلے سوال کا اعادہ ہے۔ مزید توضیح اور مزید انکشاف کے لیے دوبارہ سوال کیا گیا کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے ہے محنت والی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو اور نہ پانی دیتی ہو کھیتی کو یعنی نہ ہل جوتنے کی محنت اس سے لی گئی ہو اور نہ

آب پاشی کی مشقت اس پر ڈالی گئی ہو۔ بے عیب ہو اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ کہا انہوں نے کہ اب لائے آپ حق بات کو یعنی واضح اور مفصل بات آپ نے اب فرمائی جس سے ہمارا تردد رفع ہوا کہ ایسا حیوان تمام حیوانوں میں حیات کا مظہر اتم ہو گا۔ پس ممکن ہے کہ اس کی حیات کے اثر سے دوسرے میں بھی حیات کا اثر آجائے پس ایسی گائے کو خرید کر ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ وہ کریں گے۔ اُن کے لعنت آمیز استفسارات سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ غالباً ذبح نہ کریں گے۔ مگر خیر انشاء اللہ کہنے کی برکت سے کر گزرے۔

ف (۲) بنی اسرائیل چونکہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوئے تھے اور یہ سمجھا تھا کہ معاذ اللہ یہ جانور خدا ہو سکتا ہے تو اس کے رد کرنے کے لیے بھی گائے کے ذبح کا حکم دیا گیا۔



وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ

اور جب تم نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو۔ پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو نکالنا ہے

مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ

جو تم چھپاتے تھے پھر ہم نے کہا مارو اُس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

اسی طرح جلا دے گا اللہ مردے اور دکھاتا ہے تم کو اپنے نمونے شاید تم

تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

بوجھو۔

قتل نفس (۵)

قال تعالیٰ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ... الی ... وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۰

اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ تم نے ایک محترم نفس کو قتل کر ڈالا پھر اس قتل کو ایک دوسرے

کے سر تھوپنے لگے وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا اور وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا۔ اور جن چیزوں کو تم دلوں میں چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ انکو اندر سے باہر نکالنے والا ہے۔ جس سے تمہارے اندرونی خطرات اور دلی خیالات اس طرح عیاں اور آشکارا ہو جائیں جیسے کسی محسوس شئی کو کسی بند صندوق سے نکال کر مجمع میں لاکر سب کے سامنے رکھ دیا جائے۔ کہ سب اسکو اچھی طرح دیکھ لیں۔ پس کہا ہم نے کہ لگاؤ اس مردہ پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا زبان یا دُم میت پر رکھ دو جی اٹھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مقتول فوراً زندہ ہوگیا اور اپنے قاتل کا نام بتا کر گر پڑا اور مر گیا۔ قاتل کو پکڑا گیا اور قصاص لیا گیا اور میراث سے بھی محروم رکھا گیا۔ اور اسی وقت سے یہ حکم ہو گیا کہ قاتل ہمیشہ میراث سے محروم رہے گا اگرچہ قاتل مقتول کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف (۱) مقتول کا قول مرکر زندہ ہونے کے بعد اس وجہ سے معتبر مانا گیا کہ وہ عالم برزخ کو دیکھ چکا ہے لہٰذا اس کے قول میں اب کذب کا احتمال باقی نہیں رہا اور نہ وہم وخیال اور خطاء اور نسیان کا۔ جیسے شجر اور حجر کا گواہی دینا نبیؐ کا معجزہ ہے اسی طرح مردہ کا زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلانا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح اس واقعہ میں اللہ نے محض اپنی قدرت سے عدل اور قصاص جاری کرنے کے لیے عارضی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ایک خاص ضرورت اور مصلحت کے لیے ایک مردہ کو تمہارے روبرو زندہ فرمایا اور اُس مردہ کا کلام تم نے اپنے کانوں سے سُنا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن محض جزا دینے اور عدل قائم کرنے کے لیے اور انصاف کے لیے دوبارہ اپنی قدرت کاملہ سے مردوں کو محض اپنی قدرت سے زندہ فرمائیگا اور سب کا انصاف کریگا اور مظلوم کا ظالم سے قصاص اور بدلہ لے گا اور وقتاً فوقتاً اپنی قدرت کے نمونے اور کرشمے دکھلاتا رہتا ہے تاکہ تم سمجھو کہ اس قسم کے خوارق اور عجائب وقتاً فوقتاً قدرت کا انکار بے عقلوں کا کام ہے۔

امام المتکلمین عبدالکریم شہرستانی ملل ونحل میں فرماتے ہیں کہ جس طرح بیل اور گدھے انسانوں کے عجیب وغریب افعال کو بنظر استعجاب تکتے ہیں فلاسفۂ دوران اور بڑے بڑے سائنسدان، انبیاء ومرسلین کے آیات بینات اور خوارق ومعجزات کو اس سے کہیں زائد حیرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اگر کسی فلسفی اور سائنسدان کا اپنی ناقص اور ہوا پرست عقل سے انبیاء ومرسلین کے معجزات کا انکار حجت ہے تو بیل اور گدھوں کا انسانی عجائب قدرت سے کیوں حجت نہیں خوب سمجھ لو کہ شعور انسانی کو شعور پیغمبری سے وہی نسبت ہے جو شعور حیوانی کو شعور انسانی سے ہے۔ عجب نہیں کہ یہ نسبت بھی نہ ہو۔ انتہی کلامہ مشرحًا۔

ف (۲) اس آیت میں جو مضمون مذکور ہے وہ قصۂ مذکورہ بالا کا ابتدائی حصہ ہے۔ اس تقدیم وتاخیر کی وجہ یہ ہے کہ اگر قصہ کو ترتیب سے بیان کیا جاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ فقط ایک واقعہ کا بیان مقصود ہے۔ ترتیب کے بدلنے سے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا اول اس طرف کہ حکم الٰہی کا فوراً امتثال کیوں

نہیں کیا۔ اور حکم خداوندی میں معاندانہ حجتیں کیوں نکالیں۔ ایک صریح اور واضح حکم سُن لینے کے بعد اس قسم کے گستاخانہ اور تعنت آمیز سوالات کیوں کیے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کی کوئی عظمت اور وقعت تمہارے دلوں میں نہیں اور یہی سخت بیماری ہے جو تباہی اور بربادی کی نشانی ہے۔

اور وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا الآیہ۔ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ تم نے اموال دنیا کے طمع میں ایسے محترم نفس کو قتل کیا کہ جو تمہارے لیے بمنزلہ باپ کے تھا اس لیے کہ چچا بھی بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

عم الرجل صنو ابیہ   انسان کا چچا اسکے باپ کی مانند ہے

اور پھر اس کوشش میں پڑے کہ یہ خون دوسروں کے سر لگا دیا جائے۔

(ربط) یہاں تک بنی اسرائیل کی عادات شنیعہ کا بیان فرمایا کہ ہمیشہ احکام خداوندی میں حیلے اور بہانے کرتے رہے۔ آئندہ آیات میں اسکا منشار بیان فرماتے ہیں کہ منشاء اسکا قساوت قلب ہے اور اس قساوت پر اظہار تعجب بھی فرماتے ہیں کہ لیل و نہار آیات قدرت اور معجزات نبوت کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو مگر پھر بھی دل نرم نہیں ہوتے کہ نصیحت قبول کریں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد سو وہ

كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ

ہیں جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت اور پتھروں میں تو

الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا

وہ بھی ہیں جن سے پھوٹتی ہیں نہریں اور ان میں تو وہ بھی

لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا

ہیں جو پھٹتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں تو وہ بھی ہیں

يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا

جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے

تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۴﴾

کام سے

استعجاب بر قساوت بعد مشاہدۂ عجائب قدرت

قال تعالیٰ ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ... الیٰ ... وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ٥

پھر تمہارے دل خدا کی ان عجیب نشانیوں کے دیکھنے کے بعد بھی سخت ہو گئے حالانکہ ہر ایک نشانی رقت قلب کے لیے ایک نسخۂ جامعہ تھی خصوصاً مقتول کا زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتلانا ایک عجیب و غریب کرشمہ تھا۔ یہ نشانی دلیل قدرت بھی تھی اور دلیل نبوت و رسالت بھی تھی اور دلیل قیامت بھی تھی مگر پھر بھی دل نرم نہ ہوئے پس وہ مثل پتھروں کے سخت ہیں یا سختی میں پتھروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ تشبیہ اور تمثیل میں لوہے اور تانبے کا اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ لوہا اور تانبا آگ پر رکھنے سے پگھل جاتا ہے مگر ان کے دل اس قدر سخت ہیں کہ تخویف اور ترہیب کی آگ سے بھی نہیں پگھلتے پتھر کی طرح ہیں کہ جو کسی حال میں بھی نرم نہیں ہوتا یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں اس لیے کہ بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اگرچہ اُن سے نہریں تو نہیں جاری ہو جاتیں لیکن پھٹ جاتے ہیں پھر اُن سے پانی آہستہ آہستہ نکلتا رہتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح بعض قلوب ایسے ہیں کہ جن سے علوم و معارف کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں کہ جن سے دنیا سیراب ہوتی ہے۔ یہ علماء راسخین اور ائمہ ہادین کی شان ہے کہ جن کے کلمات طیبات نے مردہ دلوں کے حق میں آب حیات کا کام دیا۔ اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ ان سے نہریں تو نہیں مگر علم و حکمت کے چشمے رواں ہو گئے اور لاکھوں اور ہزاروں کو اُن سے نفع ہوا۔ یہ علماء ربانیین کی شان ہے۔ اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ اللہ کی عظمت اور جلال کے سامنے پست ہیں۔ تکبر اور غرور سے پاک ہیں کبھی اسکے حکم کے خلاف سر نہیں اٹھاتے یہ عُبّاد اور زُہاد کی شان ہے۔

مگر ان کافروں کے دل پتھر سے بھی زائد سخت ہو گئے ہیں کہ غرور اور تکبر عناد اور سرکشی سے کبھی حق کے سامنے جھکتے بھی نہیں اللہ کی ہدایت کو قبول کرنا تو درکنار اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

بعض سلف سے منقول ہے کہ وَ اِنَّ مِنَ الۡحِجَارَۃِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنۡہُ الۡاَنۡہٰرُ سے وہ لوگ مراد ہیں جو خوف خداوندی سے بکثرت روتے ہیں اور وَ اِنَّ مِنۡہَا

لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ. سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو کم روتے ہیں اور وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دل سے تو روتے ہیں مگر آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے. ہم سب کو اللہ سے یہ دعا مانگنی چاہیئے۔ ؎

عیش و عشرت سے دو عالم کے نہیں مطلب مجھے   چشم گریاں سینہ بریاں کر عطا یارب مجھے ۔ آمین

ف عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سوائے اللہ کے ذکر کے اور کثرت سے کلام نہ کیا کرو اس لیے کہ زیادہ کلام کرنا قلب میں قساوت (سختی) پیدا کرتا ہے اور سخت دل ہی خدا سے سب سے زائد دور ہے (ترمذی)

اس مقام پر بھی بنی اسرائیل کی جس قساوت کا ذکر ہے وہ بھی اسی سبب یعنی کثرت کلام کی وجہ سے ہے کہ جب گائے کے ذبح کا حکم ہوا تو معاندانہ سوالات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا. ان بیہودہ سوالات کا یہ نتیجہ نکلا کہ دل پتھر سے بھی زائد سخت ہو گئے۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل اگرچہ تم اپنی قساوت قلبی کی وجہ سے خدا سے غافل ہو گئے ہو مگر خوب سمجھ لو۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ. کہ اللہ تمہارے اعمال و افعال سے غافل اور بے خبر نہیں۔

قساوت قلبی کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ خدا سے غافل بناتی ہے اس لیے حدیث میں آیا ہے

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الۡقَسۡوَةِ وَالۡغَفۡلَةِ۔	اے اللہ میں دل کی سختی اور غفلت سے پناہ مانگتا ہوں۔

ایک شبہ پتھروں میں تو فہم و ادراک ہی نہیں پھر خدا کے خوف سے پتھروں کے گرنے کا کیا مطلب۔ ؟

جواب اہلسنت والجماعت کے نزدیک حیوانات اور جمادات میں بھی روح اور حیات ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا شعور و ادراک ہے جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے جیسا کہ امام قرطبی اور علامہ بغوی اور حافظ ابن کثیر نے اس کی تصریح فرمائی ہے. اسی وجہ سے قرآن کریم میں جا بجا حیوانات اور جمادات کی تسبیح و تحمید اور صلوٰۃ کا ذکر ہے۔

قال تعالےٰ۔

(۱) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ	ساتوں آسمان اور زمین اور اُن میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی شئ ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کرتی ہو لیکن تم انکی تسبیح

تَسْبِيْحَهُمْ ط	کو سمجھتے نہیں
(۲) كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط	ہر شئی کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے
(۳) وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ط.	گھاس اور درخت اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں .
(۴) قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ	کفار قیامت کے دن اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تمنے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی . وہ جواب میں کہیں گی کہ ہم کو اس خدا نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے .
(۵) يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا .	اُس روز بیان کرے گی (زمین) اپنی خبریں اس وجہ سے کہ اسکو خدا تعالےٰ نے حکم دیا ہو گا . !

اور اسی طرح اشجار و احجار حیوانات وجمادات کا انبیاء و مرسلین کی اطاعت اور فرمانبرداری اور اُن سے کلام کرنا احادیث صحیحہ اور متواترہ سے ثابت ہے .

(۱) ستونِ حنانہ کا واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری میں مذکور ہے جس میں کسی مؤوّل متفلسف کو تاویل کی ذرہ برابر گنجائش نہیں .

عارف رومی فرماتے ہیں

اُستُنِ حنّانہ از ہجرِ رسول	نالہ میزد ہمچو اربابِ عقول
فلسفی کو منکرِ حنّانہ است	از حواسِ انبیاء بے گانہ است

(۲) صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جبلِ احد کو دیکھ کر یہ فرمایا ھذا جبل یحبنا و نحبہ یہ پہاڑ ہم کو محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں اور محبت بدون معرفت اور ادراک کے ممکن نہیں .

(۳) صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اب بھی اس پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جو نبوت سے پیشتر مجھ کو سلام کیا کرتا تھا .

(۴) صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ جبل اُحد یا حراء پر چڑھے تو پہاڑ کو جنبش ہوئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قدم مبارک پہاڑ پر مارا اور یہ فرمایا کہ اے پہاڑ ٹھہر - تجھ پر ایک نبیؐ ہے

اور ایک صدیق اور دو شہید۔

(۵) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ ہم جب کبھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ مکہ سے باہر جاتے تو جس درخت یا پہاڑ پر گزر ہوتا تو یہ آواز آتی۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللہ (اخرجہ البغوی باسنادہ فی المعالم)

اس قسم کے اور صدہا واقعات ہیں جو کتب حدیث اور سیر میں مذکور ہیں۔ بطور نمونہ ہم نے چند واقعات ذکر کر دیئے ہیں۔

عارف رومی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں۔

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

آب و باد و خاک و نار پر شرر
بے خبر با ما و با حق باخبر

ما بعکس آں زغیر حق خبیر
بیخبر از حق واز چندیں نظیر

پیش تو آں سنگریزہ ساکت ست
پیش احمد او فصیح و ناطق است

پیش تو استون مسجد مردہ است
پیش احمد عاشق دل بردہ است

جملہ اجزائے جہاں پیش عوام
مردہ و پیش خدا دانا ودام

مردہ زیں سو یند وز انسو زندہ اند
خامش اینجا وانطرف گویندہ اند

اور اسی پر تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع ہے کہ جمادات میں ایک روح مجرد ہے جو حق تعالیٰ شانہ کو پہچانتی ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل کرتی ہے ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے بے تعلق اور بے خبر ہونا عقلاً ممکن بلکہ واقع ہے۔

لیکن مخلوق کا خالق سے بے تعلق ہونا عقلاً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ عارف رومی فرماتے ہیں۔

ع بے تعلق نیست مخلوقے ازو

اور بے شمار آیات اور احادیث اسکی شاہد ہیں جو اہل علم پر مخفی نہیں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ

اب کیا تم مسلمان توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ایک لوگ تھے اُن میں کہ

مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ

سنتے تھے کلام اللہ کا پھر اسکو بدل ڈالتے بوجھ لے کر

مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾

اور ان کو معلوم ہے

شناعت ششم (۶)

متضمن بدفع کلفت ناصحین مشفقین از انتظار وطمع ایمان معاندین

قال تعالیٰ۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ ..... الیٰ ... وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

گزشتہ آیات میں یہود کی قساوت کو بیان فرمایا۔ اب اُن مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ جو ازراہِ شفقت انکو وعظ ونصیحت کرتے رہتے تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ یہ کسی طرح ایمان لے آئیں مسلمانوں کو گمان یہ تھا کہ یہود توحید۔ اور انبیاء کرام کی نبوت کے قائل ہیں شاید یہ لوگ ایمان لے آئیں اللہ تعالیٰ نے انکی امید قطع کرنے کے لیے فرمایا کہ انکی قساوت انتہاء کو پہنچ چکی ان سے ایمان کی طمع مت رکھو۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ اے مسلمانو کیا تم بنی اسرائیل کی اس شدید قساوت کے بعد بھی توقع رکھتے ہو کہ وہ شخص تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں کا ایک فرقہ بلا واسطہ اللہ کے کلام کو سنتا تھا۔ اور پھر خوب سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف و تبدیل کرڈالتا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اللہ کے کلام میں تحریف کر رہے ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ کلام خداوندی میں تحریف کرنا کس قدر جرم عظیم ہے۔ اس فریق سے وہ ستر لوگ مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے اور بلا واسطہ اللہ کے کلام اور اسکے اوامر ونواہی اور احکام کو سنا۔ جب واپس آئے تو یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرما دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو کرنا اور نہ ہو سکے تو نہ کرنا۔ کلام الٰہی میں سے کچھ گھٹانا یا اپنی جانب سے کچھ اضافہ کردینا اسی کا نام تحریف ہے پس ان لوگوں نے کلام الٰہی میں اپنی طرف سے حروف اور الفاظ کا اضافہ کیا اور ایجاب اور لزوم کو تخییر سے بدل ڈالا۔

اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ سے توریت مراد ہے اور يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ سے بواسطہ انبیاء کرام سننا مراد ہے۔ اور تحریف سے آیات توریت میں لفظی اور معنوی تحریف کرنا مراد ہے۔ مثلاً توریت میں جو آپ کا حلیہ مبارک مذکور تھا اس میں ابیض کے بجائے آدم بنا دیا اور ربعة مائلا الی الطول کے بجائے طوالا۔ بنا دیا اور بہت سی جگہ تاویل فاسد کر کے معنی

میں تحریف کی اور پہلی تفسیر یہ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ سے ستر آدمیوں کا اللہ کے کلام کو بلا واسطہ سننا مراد تھا اور تحریف سے یہ مراد تھی کہ ان ستر آدمیوں نے جب قوم سے جا کر اللہ کا کلام نقل کیا تو اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ.

ان استطعتم ان تفعلوا هٰذه الاشياء فافعلوا وَان لم تفعلوا فلا بأس۔ — یعنی یہ چیزیں اگر تم سے ہو سکیں تو کر لینا اور اگر نہ کرو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ف جاننا چاہیئے کہ توریت میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے اور معنوی تحریف بھی. اور یہی علماء محققین کا مسلک ہے. اور اصل تحریف تو تحریف لفظی ہے اس لیے کہ تحریف کے معنی حروف اور الفاظ کے بدل ڈالنے کے ہیں. اور تاویل فاسد کر کے معنی کو بدل ڈالنا مجازاً اس کو تحریف کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں جہاں کہیں توریت کی تحریف کا ذکر آیا ہے اس سے تحریف لفظی ہی مراد ہے کیونکہ تحریف معنوی تو قرآن میں بھی ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اور حق جل شانہٗ کا یہ ارشاد۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اور فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اس قسم کی آیتیں صراحۃً تحریف لفظی پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر ابن جریر اور تفسیر درمنثور میں ان آیات کے شان نزول سے صاف ظاہر ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوتے اور جب اکیلے ہوتے

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ

ہیں ایک دوسرے پاس کہتے ہیں تم کیوں کہہ دیتے ہو ان سے جو کھولا

اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا

ہے اللہ نے تم پر کہ جھٹلاویں تم کو اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم کو

تَعْقِلُوْنَ ۝۷۶

عقل نہیں

شناعت ہفتم (۷)

قال تعالیٰ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ... الیٰ ... عِنۡدَ رَبِّکُمۡ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ٥

اور جب منافقین یہود مسلمانوں سے ملتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تصدیق کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول اور پیغمبر ہیں جن کی بشارتیں توریت میں مذکور ہیں۔ اور جب تنہا ایک دوسرے کے پاس ہوتے ہیں تمام مجمع ہیں ان کے سوا مسلمانوں میں سے کوئی نہیں ہوتا تو پھر علماء یہود جو اعلانیہ طور پر کافر ہیں وہ ان منافقین سے یہ کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں سے خوشامد میں وہ چیزیں کہہ ڈالتے ہو جو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں۔ اور وہ خزائن علمیہ جو توریت اور زبور اور دیگر صحف انبیاء میں مخزون ہیں کہ جن میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپ کی امامت کے اوصاف اور آپ کے اتباع اور اطاعت کی تاکید مذکور ہے تم مسلمانوں کو ان خزائن علمیہ کا کیوں پتہ دیتے ہو۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ اس اقرار اور اعتراف کی وجہ سے مسلمان خدا کے نزدیک تم سے حجت کریں گے اور تم کو ملزم ٹھہرائیں گے۔ کہ باوجود اس اعتراف و اقرار کے پھر بھی ایمان نہ لائے کیا تم اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے کہ

الانسان ماخوذ باقرارہ   یعنی انسان اپنے اقرار میں پکڑا جاتا ہے

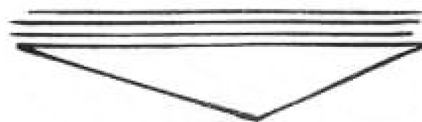
یعنی تمہارا زبان سے اقرار کرنا اور پھر نہ ایمان لانا قیامت کے دن یہ زیادہ رسوائی کا باعث ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص زبان سے اقرار یا دستاویز لکھ دینے کے بعد حاکم کے سامنے انکار کرے تو زیادہ رسوائی ہے اور اگر حاکم کو معلوم ہو اور گواہ بھی موجود ہوں مگر اس شخص نے اقرار نہ کیا ہو تو حاکم کے سامنے انکار کرنے سے رسوا تو ضرور ہوگا مگر اتنی رسوائی نہ ہوگی جتنی کہ اقرار کے بعد ہوتی۔

اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے   جو چھپاتے ہیں

وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾

اور جو کھولتے ہیں



تحمیق یہود بے بہبود

قال تعالیٰ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ..... الی..... وَمَا یُعْلِنُوْنَ ہ

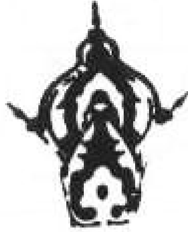
یعنی کیا انکو یہ گمان ہے کہ اس چھپانے سے اللہ کے نزدیک ان پر کوئی حجت قائم نہ ہوگی اور کیا ان کی یہ ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویزیں (یعنی توریت اور زبور کی وہ آیتیں جس میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی صریح صریح بشارتیں مذکور ہیں۔) خداوند ذوالجلال کو قیامت کے دن ہم نہ پہنچ سکیں گی۔ کیا انکو معلوم نہیں کہ تحقیق اللہ تعالے ان تمام چیزوں کو خوب جانتا ہے جنکو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ جو جلوت میں آپکی نبوت و رسالت کا اقرار کرتے ہیں انکو بھی جانتا ہے اور جو خلوت میں اعتراف کرتے ہیں انکو بھی جانتا ہے۔ خلوت کا اقرار اگرچہ مسلمانوں کی نظر سے مخفی ہے مگر ہماری نظر سے تو مخفی اور پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ تم نے اگرچہ بندوں کے سامنے اقرار نہ کیا مگر اس خداوند ذوالجلال کے سامنے تو اقرار کر لیا جو کہ ہر جلوت اور خلوت غیب اور شہادت کا حاضر و ناظر ہے۔ یہ احمق اتنا نہیں سمجھتے کہ اصل معاملہ تو خدا کے ساتھ ہے جسکے یہاں ظاہر و باطن سر اور علن جلی اور خفی سب یکساں ہے۔

تنبیہ توریت اور انجیل کی تحریف کے متعلق حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "اعجاز عیسوی" ملاحظہ فرماویں جو اس باب میں بے نظیر ہے۔

رسالہ موصوفہ میں اس امر کو نہایت بسط و شرح سے ثابت فرمایا ہے کہ توریت اور انجیل میں ہر قسم کی تحریف ہوئی ہے لفظی بھی اور معنوی بھی۔ کمی اور بیشی زیادتی اور نقصان۔ تغیر اور تبدیل غرض یہ کہ تحریف کی کوئی نوع ایسی نہیں کہ جس سے توریت و انجیل خالی ہو۔

یہ رسالہ اردو زبان میں ہے۔ مولانا موصوف کی دوسری کتاب اظہار الحق جو عربی زبان میں ہے اس میں بھی تحریف توریت و انجیل کی کافی اور شافی تحقیق فرمائی۔ اور بہت سے علماء یہود نصاریٰ بھی تحریف لفظی کے مقر اور معترف ہیں حضرات اہل علم اسکی مراجعت فرمائیں۔

(ربط) ان آیات میں یہود کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں ان کے ناخواندوں کا ذکر کرتے ہیں



وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ

اور ایک ان میں ان پڑھے ہیں خبر نہیں رکھتے کتاب کی مگر باندھ لی اپنی آرزوئیں اور

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

ان پاس نہیں مگر اپنے خیال

شناعت ہشتم (۸)

قال تعالیٰ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۚ ثُمَّ

سو خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر

يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا

کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے کہ لیویں اس پر مول

قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ

تھوڑا سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھ کے لکھے سے اور خرابی ہے

مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

ان کو اپنی کمائی سے

شناعت نہم (۹)

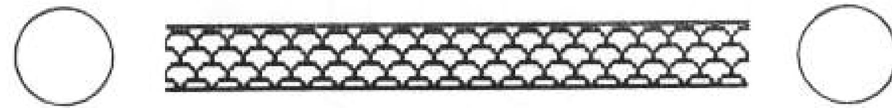
قال تعالیٰ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ... الیٰ ... وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ

اور بعض ان میں سے ناخواندہ اور ان پڑھ ہیں۔ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ویسے ہی ہیں۔ اسی وجہ سے اَن پڑھ کو اُمّی کہتے ہیں کہ اسکو صرف ام یعنی ماں سے نسبت ہے۔ باپ سے لکھنا اور پڑھنا کچھ نہیں سیکھا۔ کتاب کو جانتے ہی نہیں نہ الفاظ سے واقف نہ معنے سے آگاہ بسوائے آرزؤں کے کچھ معلوم نہیں کہ جو تحریف کرنے والوں نے انکی خواہش کے مطابق انکے دلوں میں بٹھلا دی ہے مثلاً۔

لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی کہ جنت میں سوائے یہود یا نصاریٰ کے اور کوئی نہ جائیگا.

اور اگر بالفرض جہنم میں گئے بھی تو لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً یعنی صرف چند روز جہنم میں رہیں گے یہ آرزوئیں ان جاہلوں کے علماء سوء نے انکے دل خوش کرنے کے لیے دل نشین کردی ہیں جس پر کوئی دلیل نہیں اور نہیں ہیں یہ لوگ مگر محض گمان اور خیال کی پیروی کرنے والے بخود بھی انکو اسکا یقین نہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اس لیے انکو بہ نسبت علماء کے کم عذاب ہوگا ان پر عذاب فقط اپنی گمراہی کا ہوگا اور علماء پر اپنے گمراہ ہونے اور دوسرے کے گمراہ کرنے کا بھی عذاب ہوگا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے پس خرابی اور بربادی ہے ان لوگوں کے لیے کہ جو کتاب کو خود اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہدیتے ہیں کہ یہ ہمارا لکھا ہوا اللہ ہی کی طرف سے ہے خوب جانتے ہیں کہ یہ تحریف ہے نادان اور بے خبر نہیں اس لیے کہ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے.

یہ محض اس لیے کرتے ہیں تاکہ اپنے رؤسا اور عوام سے اس ذریعہ سے کچھ قلیل معاوضہ حاصل کریں پس ایسے لوگوں کے لیے دو وجہ سے عذاب ہے ایک عذاب اس وجہ سے کہ انکے ہاتھوں نے تحریف کی کتابت کی ہے اور دوسرا عذاب اس وجہ سے کہ اس تحریف کے ذریعہ سے لوگوں سے روپیہ کماتے ہیں، اوّل تو لوگوں کے خوش کرنیکے لیے کتاب الٰہی میں تحریف کی اور پھر چند پیسوں کی طمع میں آخرت کے اجر عظیم کو برباد کیا. ثَمَنًا قَلِیۡلًا سے دراہم معدودہ مراد نہیں بلکہ مال کثیر مراد ہے اس لیے کہ اگر بالفرض حق اور ہدایت کی قیمت لگائی جائے تو روئے زمین کے خزانے اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔



وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً ؕ قُلۡ

اور کہتے ہیں ہم کو آگ نہ لگے گی مگر کئی دن گنتی کے تو کہہ

اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا فَلَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰهُ

کیا لے چکے ہو اللہ کے ہاں سے اقرار تو البتہ خلاف نہ کریگا اللہ اپنا

عَهۡدَهٗۤ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

اقرار یا جوڑتے ہو اللہ پر جو معلوم نہیں رکھتے.

بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے

فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾

سو وہی ہیں لوگ دوزخ کے وہ اسی میں رہ پڑے۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ

اور جو یقین لائے اور عمل کئے نیک وہ لوگ ہیں

الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾ ع

جنت کے وہ اسی میں رہ پڑے۔

ع ۱۱

تشاعت دہم (۱۰)

وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً ... الیٰ ..... ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ

اور یہود یہ بھی کہتے ہیں کہ دوزخ ہم کو ہرگز نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم نے اللہ سے اس بارہ میں کوئی عہد لیا ہے۔ کہ تمکو فقط اس قدر مدت عذاب ہوگا۔ اس لیے کہ عذاب کی مدت دلیل عقلی سے معلوم نہیں ہو سکتی اس کے لیے دلیل سمعی چاہیئے ایسا عقیدہ بغیر عہد خداوندی کے نہیں ہو سکتا تو بتلاؤ کہ کیا خدا نے تم سے کوئی ایسا عہد کیا ہے کہ اللہ اپنے اس عہد کے ہرگز خلاف نہ کریگا۔ یا اللہ پر افترا کرتے ہو، بے سند باتیں جن کی سند تم کو معلوم نہیں اور خود اپنی طرف سے ایسی من گھڑت باتیں کرتے ہو بتلاؤ کس کتاب میں اللہ نے یہ حکم نازل کیا ہے۔ آئندہ آیت میں حق جل شانہ، ارشاد فرماتے ہیں کہ یہود کا یہ عقیدہ کہ ہم جہنم میں صرف چند روز رہیں گے بالکل غلط ہے۔ جنت میں داخل ہونا اللہ اور پیغمبر آخر الزمان پر ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے پر موقوف ہے چنانچہ فرماتے ہیں بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۔ کیوں نہیں تم جیسے پیغمبر آخر الزمان سے سرکشی کرنے والے ضرور جہنم میں جائیں گے۔ اس لیے کہ جس شخص نے بھی گناہ کو کمایا اور گناہوں نے اسکا ہر طرف سے احاطہ کر لیا۔ اور کوئی جانب گناہ سے خالی نہیں رہی۔ جدھر دیکھئے گناہ ہی گناہ ہے نیکی کا نام و نشان نہیں۔ گناہوں نے ہر طرف

سے ایسا گھیر کر اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہی بس ایسے ہی لوگ دوزخ کے ہمیشہ کے ساتھی ہیں یہ دوزخ سے جدا نہ ہونگے اور دوزخ ان سے جدا نہ ہوگی ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے یعنی ابدالآباد تک اسی میں رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور انکے دل نور ایمان سے منور اور روشن ہوئے اور نیک عمل کیے جس سے اعضا اور جوارح روشن ہوتے ایسے لوگ جنت کے ساتھی ہیں کہ یہ جنت سے علیحدہ نہ ہونگے اور جنت ان سے علیحدہ نہ ہوگی۔ ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے کبھی جنت سے نہ نکلیں گے۔

ف (۱) احاطہ کی جو تفسیر بیان کی گئی وہ کافر ہی پر صادق آسکتی ہے کہ کافر دولت ایمان سے تہی دست ہونے کی وجہ سے فقیر اور گدائے بے نوا ہے۔ اعمال صالحہ اگر کچھ ہیں تو وہ نہ ایمان لانے کی وجہ سے سب بیکار ہیں۔

کما قال تعالیٰ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے یعنی ایمان کے بعد مرتد ہو جائے تو اس شخص کے تمام اعمال غارت اور برباد ہوئے۔ اور وہ شخص آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

اور جو شخص ایمان نہیں لایا خواہ وہ کتنے ہی صدقات اور خیرات کرے اُس کے صدقات وخیرات کو اعمال صالحہ نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ ان اعمال کو شیر قالین کی طرح اعمال صالحہ کی ہم شکل اور ہم صورت سمجھنا چاہیئے حقیقۃً اعمال صالحہ نہیں۔ کما قال تعالےٰ۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۔ اور کافروں کے اعمال سراب کی طرح بے حقیقت ہیں۔ دیکھنے والا انکو پانی کی طرح اعمال صالحہ سمجھتا ہے اور حقیقت کچھ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس کے پاس ایمان نہیں اُسکے پاس کچھ بھی نہیں۔ گناہوں میں ہر طرف سے گھرا ہوا ہے بخلاف مؤمن کے کہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو۔ گناہوں میں گھرا ہوا نہیں بالفرض کوئی عمل صالح اسکا معین اور مددگار نہ ہو تو ایمان تو ضرور اسکا نگہبان اور پاسبان بنا ہوا ہے جو شیطان کے قاتلانہ وار کو روکے ہوئے ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ گناہ کے گھیر لینے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا۔ اھ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حال کافر ہی کا ہوسکتا ہے۔ مؤمن کا نہیں ہوسکتا

ف (۲) اہلسنت والجماعت کے نزدیک جو فریق ایمان لایا اور اعمال صالحہ بھی کیئے اسکا ثواب دائمی اور غیر متناہی ہے اور جو فریق نہ ایمان لایا اور نہ اعمال صالحہ کیے اسکا عذاب دائمی اور غیر متناہی ہے فریق اوّل میں ایمان اور عمل صالح دونوں موجود ہیں اور فریق ثانی میں دونوں نہیں۔ اس لیے فریق اول کا ثواب دائمی ہے اور فریق ثانی کا عذاب دائمی ہے۔ اور جو فریق ایمان تو لایا مگر اعمال صالحہ نہیں کیے اسکی جزا ثواب اور عقاب سے مرکب اور ملی جلی ہے لیکن اوّل عذاب دیں گے اور بعد میں بہشت میں داخل کریں گے۔ بہشت میں داخل کرکے پھر بہشت سے نکالنا اور دوزخ میں ڈالنا خلاف حکمت ہے۔ عزت دینے کے بعد ذلت کے گڑھے میں ڈالنا لطف اور عنایت کے خلاف ہے۔ یہ تین احتمال ہوئے۔ چوتھا احتمال یہ ہے کہ اعمال صالحہ تو ہوں مگر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ صورت شرعاً محال ہے اس لیے کہ شریعت میں کوئی عمل صالح بدون

ایمان کے معتبر نہیں۔ ہر عمل صالح کے لیے ایمان شرط ہے۔

وَ اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ جب شرط فوت ہوئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔

اسی وجہ سے کفار کے صدقات کو صرف صورۃً اعمال صالحہ کہا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت میں اعمال صالحہ نہیں کما قال تعالٰی

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً کافروں کے اعمال سراب کی مانند ہیں کہ دور سے پیاسا انکو پانی گمان کرتا ہے۔

جس طرح لکڑی کا گھوڑا اور تصویر قالین اصلی گھوڑے اور اصلی شیر کی صورت میں مشابہ ہے اسی طرح کافر کا عمل ظاہر صورت میں عمل صالح کے مشابہ ہوتا ہے مگر حقیقۃ میں نیک نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ عمل صالح کی روح ایمان ہے اور وہ موجود نہیں۔

ف (۳) ہر شریعت میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ کافر مخلد فی النار ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ اور ابد الآباد تک جہنم میں رہے گا۔ اور مومن عاصی چند روز دوزخ میں عذاب پاکر جنت میں داخل کر دیا جائے گا کما قال تعالٰی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ بیشک اللہ تعالٰی اس بات کو نہ بخشیں گے کہ انکے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جاوے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جسکے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے۔

اور یہود جو یہ روایت کرتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام سے اللہ تعالٰی نے یہ عہد کیا کہ تمہاری اولاد کو عذاب نہ دوں گا مگر تحلۃً للقسم یعنی محض قسم پورا کرنے کے لیے یا یہ فرمایا کہ فقط چند روز کے لیے جہنم میں رہیں گے۔ یہ روایت بالفرض اگر صحیح ہو تو اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے صلبی بیٹے مراد ہیں جنہوں نے یوسف علیہ السلام سے اپنا قصور معاف کرایا اور بارگاہ خداوندی میں بہزار عجز و نیاز توبہ اور استغفار کی اور اللہ تعالٰی نے انکی توبہ قبول فرمائی۔ یہ تابعین جہنم میں نہیں جائیں گے اور ان کی اولاد میں سے جو چند روز کے لیے جہنم میں جائے گا اس سے مومن عاصی مراد ہے جیسا کہ تمام شریعتوں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص مومن ہو اور گناہ گار رہا اس پر دائمی عذاب نہیں۔

بنی اسرائیل یہ سمجھے کہ یہ حکم ذاتی طور پر ہمارے لیئے مخصوص ہے اس لیے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً کا دعویٰ کرنے لگے۔ اللہ تعالٰی نے اس شبہ کا ازالہ فرمایا کہ یہ حکم بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو دین حق کا اتباع کرے اسکا یہی حکم ہے گزشتہ زمانہ میں چونکہ بنی اسرائیل ملت حقہ اور دین حق کے متبع تھے۔ اگرچہ گناہوں اور خطاؤں میں ملوث تھے اس لیے یہ حکم تھا کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کی طرح ہمیشہ جہنم میں نہ رہیں گے بلکہ صرف چند روز کے لیے جہنم میں جائیں گے جیسا کہ مومن عاصی کا حکم ہے اور اب

وہ صورت باقی نہیں رہی اس وقت تم دین حق اور نبی برحق کے اتباع سے انحراف کیے ہوئے ہو۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر ہو اور نبی کی نبوت کا انکار کفر ہے۔ اس لیے تمہارا عذاب دائمی ہو گا جیسا کہ کافر کا تمام شریعتوں میں یہی حکم ہے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہے گا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ

اور جب ہم نے لیا اقرار بنی اسرائیل کا بندگی نہ کرو

اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى

مگر اللہ کی اور ماں باپ سے سلوک نیک اور قرابت والے سے

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ

اور یتیموں سے اور محتاجوں سے اور کہو لوگوں سے نیک بات اور

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا

کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ پھر تم پھر گئے مگر

قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۸۳

تھوڑے تم میں اور تم کو دھیان نہیں۔

شناعت یازدہم (۱۱)

قال تعالیٰ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔۔۔۔ الی ۔۔۔۔ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں یہود کے اس زعم فاسد کا کہ ہم کو سوائے چند گنتی کے دنوں کے دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں اور فرمایا کہ یہ خیال خام ہے۔ نجات کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ خاندانِ نبوت سے تعلق پر نہیں۔ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے خواہ وہ کسی خاندان اور کسی قوم کا ہو اس کی نجات ہوگی اور جو کفر کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا۔ جیسے نوح علیہ السلام کا بیٹا۔ یہ آخرت کا معاملہ ہے۔

ع کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

علاوہ ازیں تمہاری عہد شکنیوں کا مقتضیٰ بھی اس کے خلاف ہے کہ تم کو صرف چند روزہ عذاب دیا جائے جس قوم نے خدا تعالیٰ سے پختہ عہد اور پیمان کر کے توڑے ہوں اس قوم کو چند روز عذاب دیکر چھوڑ دینا خلاف حکمت ہے بخصوصاً جبکہ عہد شکنی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو اور نیت بھی یہ ہو کہ ہمیشہ ان گناہوں پر قائم رہیں گے۔ اس لیے آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے توریت میں بنی اسرائیل سے چند باتوں کا پختہ عہد لیا۔ اول یہ کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہیں کرو گے دوم یہ کہ والدین کے ساتھ خاص احسان کرو گے جو احسان کی تمام انواع واقسام کو شامل ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں (۱) ترک ایذاء (۲) خدمت مالی (۳) خدمت بدنی۔ سوم اہل قرابت کے ساتھ حسب قرابت احسان کرنا اور چہارم یتیموں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اور پنجم عام غرباء اور محتاجوں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اور ششم یہ کہ تمام لوگوں کے ساتھ خواہ مومن ہوں یا کافر اچھی طرح اور نرمی سے بات کرنا حسن خلق اور مدارات میں کسی کی تخصیص نہیں اور ہفتم یہ کہ نماز کو قائم رکھنا اور ہشتم یہ کہ زکوٰۃ ادا کرتے رہنا۔ یہ وہ عہد تھے جو تم سے لیے گئے پھر تم نے ان مضبوط اور محکم عہدوں سے روگردانی کی۔ مگر تم میں کے بہت ہی تھوڑے افراد ان عہدوں پر قائم رہے اور تم احکام خداوندی سے اعراض اور انحراف کے عادی اور خوگر ہی ہو گئے ہو اور یہ اعراض تمہاری عادت ثانیہ بن گئی ہے۔ اور پھر اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے محب اور محبوب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں چند روز رکھنے کا تو تم سے کوئی عہد نہیں کیا تھا البتہ تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ احسان کرنا اور یتیموں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنا اور لوگوں کے ساتھ عمدہ اخلاق سے پیش آنا مگر تم نے یہ عہد بھی توڑ ڈالا اور بہت ہی قلیل لوگ تم میں سے اس عہد پر قائم رہے مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

فائدۂ اولیٰ والدین کی تربیت تربیتِ خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔ والدین عالم اسباب میں اسکے وجود کے ایک ظاہری سبب ہیں۔ ماں باپ اولاد کے ساتھ جو کچھ احسان کرتے ہیں وہ کسی غرض اور عوض کے لیے نہیں اولاد کی تربیت سے ماں باپ کسی وقت ملول نہیں ہوتے۔ اولاد کے لیے جو کمال ممکن ہو والدین دل و جان سے اس کی آرزو کرتے ہیں۔ اولاد کی ترقی اور عروج پر کبھی حسد نہیں کرتے ہمیشہ اپنے سے زیادہ اولاد کو ترقی اور عروج پر دیکھنے کے خواہشمند اور آرزومند رہتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد تعظیم والدین کا حکم دیا اور انہی وجوہ کی بناء پر والدین کی تعظیم تمام شریعتوں میں واجب رہی اور چونکہ یہ حق محض ماں باپ ہونے کی وجہ سے ہے اس لیے وَ بِالْوَالِدَيْنِ میں ایمان کی قید نہیں لگائی گئی اشارہ اس طرف ہے کہ والدین کی تعظیم والدین ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں واجب اور لازم ہے۔ والدین خواہ کافر و فاجر ہوں یا منافق و فاسق ہوں۔ اسی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام نے آذر کی دعوت و تلقین میں ہمیشہ تلطف اور نرمی کو ملحوظ رکھا۔ جیسا کہ سورۂ مریم میں مفصل قصہ مذکور ہے۔ اور قرآن اور حدیث میں جابجا

کافر اور مشرک ماں باپ کے ساتھ بھی سلوک اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدۂ دوم محتاج تو یتیم اور مسکین دونوں ہی ہیں۔ مگر یتیم کم سن ہونے کی وجہ سے کمانے کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے یتیم کو مسکین پر مقدم فرمایا۔

فائدۂ سوم مالی سلوک اور احسان زیادہ تر اقارب کے ساتھ ہوتا ہے مالی احسان ہر ایک کے ساتھ ممکن نہیں اس لیے وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا میں اجانب کے ساتھ قولی احسان کا ذکر فرمایا اس لیے کہ تواضع اور حسن خلق کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ ممکن ہے۔

فائدۂ چہارم دعوت اور تذکیر یعنی وعظ و نصیحت کے موقعہ پر نرمی اور ملاطفت معہود ہے، کما قال تعالیٰ وَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى وقال تعالیٰ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وقال تعالیٰ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وقال تعالیٰ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ غرض یہ کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ و مناظرہ میں تلطف اور لین مناسب ہے جیسا کہ ان آیات سے صاف ظاہر ہے۔ البتہ جہاد اور قتال میں غلظت اور شدت مناسب ہے کما قال تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ جہاد اور نصیحت کے فرق کو خوب سمجھ لو۔

فائدۂ پنجم

دربیان فرق مدارات و مداہنت

بہت سے لوگ مداراۃ اور مداہنت میں فرق نہیں سمجھتے۔ حالانکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اپنی دنیوی اور جسمانی راحت اور منفعت کو دوسرے کی دنیوی راحت اور منفعت کے خیال سے چھوڑ دینا اس کا نام مداراۃ ہے۔ اور کسی دنیوی لحاظ کے خاطر اپنے دین کو چھوڑ دینا اور اس میں سستی کرنا اسکا نام مداہنت ہے۔ مداراۃ شریعت میں مستحسن اور پسندیدہ ہے اور مداہنت قبیح اور مذموم ہے کما قال تعالیٰ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۔

خلاصہ یہ کہ دین میں سستی اور نرمی کا نام مداہنت ہے اور دنیوی امور میں نرمی اور سستی کا نام مدارات ہے۔

وَاِذْ	اَخَذْنَا	مِيْثَاقَكُمْ	لَا تَسْفِكُوْنَ	دِمَآءَكُمْ	
اور جب	لیا ہم نے	اقرار تمہارا کہ	نہ کرو گے	خون	آپس میں

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ

اور نہ نکالدو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر

اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

تم نے اقرار کیا اور تم مانتے ہو پھر تم ویسے ہی خون کرتے ہو

اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز

آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقے کو ان کے وطن سے

تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ

چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ سے اور ظلم سے اور اگر وہی آویں تم

اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط

پاس کسی کی قید میں پڑے تو انکو چھڑائی دیتے ہو اور وہ بھی حرام ہے تم پر انکا نکال دینا

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا

پھر کیا مانتے ہو تھوڑی کتاب اور منکر ہوتے ہو تھوڑی سے پھر کچھ

جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ

سزا نہیں اس کی جو کوئی تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط

میں اور قیامت کے دن پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے وہی ہیں جنہوں نے

اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

خرید کی دنیا کی زندگی آخرت دے کر سو نہ ہلکا ہوگا ان پر

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

شناعت دوازدہم (۱۲)

قال تعالیٰ. وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ .... الیٰ ... وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ہ

(ربط) علاوہ ازیں تمہاری دوسری عہد شکنیوں کا بھی مقتضیٰ یہی ہے کہ تم کو چند روز عذاب نہیں بلکہ دائمی عذاب دیا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تم سے اس امر کا پختہ عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرو گے اور نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالو گے۔ اپنے ہم مذہبوں کو قتل کرنا اور انکو جلا وطن کرنا درحقیقت اپنے ہی کو قتل کرنا اور جلا وطن کرنا ہے۔ اسی وجہ سے بجائے اَقَارِبَكُمْ وَاَهْلَ مِلَّتِكُمْ کے اَنْفُسَكُمْ۔ کا لفظ استعمال فرمایا اور پھر تم نے اسکا اقرار بھی کر لیا کہ یہ عہد اور پیمان ہم کو منظور اور قبول ہے اور فقط اقرار پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ تم اس پر شہادت اور گواہی بھی دیتے ہو کہ بیشک ہمارے بزرگوں نے یہ عہد کیا تھا اور پھر اس صریح اقرار اور صریح شہادت کے بعد تم ہی وہ لوگ ہو کہ باہم ایک دوسرے کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنی قوم کے ایک فریق کو جلا وطن بھی کرتے ہو۔ اس طرح کہ تم ان کے مقابلہ میں اللہ کے گناہ اور معصیت اور بندوں پر ظلم اور تعدی کے ساتھ قتل کرنے اور جلا وطن کرنے میں اُنکے مخالفین کی امداد کرتے ہو۔ توریت کے ان دو حکموں کو تم نے پس پشت ڈالا اور تیسرا حکم جو آسان تھا اس پر عمل کرنے کے لیے تیار رہتے ہو اور وہ یہ کہ اگر تمہارے ہم مذہب لوگ اسیر اور گرفتار ہو کر آتے ہیں تو انکا فدیہ دیکر انکو قید سے چھڑاتے ہو اور حالانکہ تم پر ان کا نکالنا اور جلا وطن کرنا بھی تو قطعاً حرام تھا اور قتل کرنا تو اس سے بھی بڑھ کر جرم تھا۔ مگر تعجب ہے کہ جو جرم شدید تھا اس کا تو ارتکاب کرتے رہے اور جو جرم ذرا خفیف تھا اس سے اجتناب کیا اور وہ اجتناب بھی اتباع شریعت کی بناء پر نہ تھا بلکہ اس بناء پر تھا کہ وہ حکم غرض اور طبیعت کے موافق تھا لہٰذا ایسے شخص کے لیے چند روزہ عذاب کافی نہیں دائمی عذاب چاہیئے۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو فریق تھے۔ ایک بنی قریظہ۔ اور دوسرے بنی نضیر۔

اسی طرح مدینہ میں مشرکین کے بھی دو فریق تھے ایک اوس اور دوسرے خزرج اور ہر فریق دوسرے فریق کا دشمن تھا آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بنی قریظہ تو قبیلۂ اوس کے حلیف اور دوست تھے اور بنی نضیر قبیلۂ خزرج کے حلیف اور دوست تھے۔ جب کبھی اوس اور خزرج میں لڑائی ہوتی تو حلف اور دوستی کی وجہ سے بنو قریظہ تو اوس کی حمایت اور مدد کرتا اور بنی نضیر قبیلۂ خزرج کی حمایت اور امداد کرتا اور ہر قبیلہ اپنے

خلفاء کے ساتھ مل کر اپنے دشمن کو مارتا اور جلاوطن کرتا۔ اور اگر کوئی یہودی جنگ میں اسیر ہو جاتا تو سب مل کر روپیہ جمع کرتے اور زر فدیہ دیکر اسکو قید سے چھڑا کر لاتے اور اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ تم آپس میں جنگ و جدال اور قتل و قتال کرتے ہو اور ایک دوسرے کو گھروں سے نکالتے ہو تو پھر انہی قیدیوں کو جن کو گھروں سے نکالا تھا زر فدیہ دیکر کیوں چھڑاتے ہو تو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ توریت میں حق تعالےٰ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ کہ جس وقت تمہارے ہم مذہب بھائی کسی کے ہاتھ میں قید ہو جائیں تو ان کو قید سے چھڑانا ہم پر واجب ہے۔ اور رہی آپس کی جنگ تو وہ دنیوی مصالح کی بناء پر ہے اس میں اگر اپنے حلفاء کا ساتھ نہ دیں تو موجب عار و ننگ ہے۔ حق جل شانہ نے اس آیت میں یہود کی اس شناعت کو ذکر فرمایا جسکا حاصل یہ ہے کہ تم کو توریت میں قتل کرنے اور جلاوطن کرنے کی اور ظلم اور تعدی میں مدد کرنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ اور قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑانے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان تمام احکام میں سے تم نے فقط فداء اسیران کے حکم پر عمل کیا اس لیے کہ وہ تمہاری نفسانی خواہش کے موافق اور مطابق تھا۔ یہ درحقیقت خدا کی اطاعت نہیں بلکہ اپنے نفس کی اطاعت ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی حماقت ہے کہ اپنے بھائیوں کے قتل کو اور گھروں سے نکالنے کو تو جائز سمجھتے ہیں اور اگر کسی غیر کے ہاتھ میں اسیر ہو جائیں تو فدیہ دیکر اُن کے چھڑانے کو واجب سمجھتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ تم شریعت کے بعض عہدوں اور بعض حکموں کو بے دھڑک توڑتے ہو اور شریعت کا وہ حکم جو تمہاری خواہش نفس اور طبیعت کے موافق ہو اس پر عمل کرتے ہو پس کیا تم کتاب خداوندی یعنی توریت کے بعض حکموں پر تو ایمان لاتے ہو۔ اور بعض احکام کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ ایمان میں تجزی اور تقسیم جاری نہیں ہوتی۔ سارے ہی حکموں کے ماننے کا نام ایمان ہے جو شخص ایک حکم کا بھی انکار کرے وہ کافر ہے اور کافر کی سزا دائمی ہے نہ کہ ایام معدودہ پس کیا جزاء ہے اس شخص کی جو ایسا شنیع کام کرے کہ اللہ کے بعض حکموں کو مانے اور بعض کو نہ مانے۔ خصوصاً تم میں سے جو اپنے کو اہل کتاب اور اہل علم بتلاتے ہیں مگر خواری اور رسوائی دنیاوی زندگانی میں جیسے قتل و غارت اور کمال ذلت و اہانت کے ساتھ ان سے جزیہ اور خراج وصول کرنا اور انکے جرم کے لحاظ سے یہ سزا کوئی بڑی سزا نہیں۔ البتہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پہنچائے جائیں گے اور خوب سمجھ لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالےٰ تو اس سے غافل اور بے خبر نہیں ہاں تم ہی غفلت اور بے خبری میں ہو۔ دیکھ لو بے عقل لوگوں کا گروہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جنہوں نے اس دنیا سے دنی اور فانی کی حقیر زندگی کو آخرت کے عوض میں بصد رغبت خرید لیا ہے پس یہ نادان آخرت کے منافع سے تو کیا منتفع ہوتے۔ ان سے تو عذاب اخروی ہلکا بھی نہیں کیا جائیگا اور نہ انکی کسی قسم کی مدد کی جائے گی کہ کوئی زور آور بزور اللہ کے عذاب کو ان سے دفع کردے پس معلوم ہوا کہ یہ لوگ دائمی عذاب کے مستحق ہیں اس لیے کہ کفر نے انکا ہر طرف سے احاطہ کیا ہے لہذا یہ لوگ اپنے قول لن تمسنا النار الا ایامًا معدودہ میں جھوٹے ہیں۔

فائدہ معلوم ہوا کہ جو شخص شریعت کے اس حکم کو تو مانے جو اسکی طبیعت اور مزاج کے موافق ہو اور جو حکم

مخالف طبیعت ہو اسکو قبول نہ کرے وہ کافر ہے مسلمان نہیں دنیاوی حکومتوں میں بھی ایک قانون کا انکار بغاوت ہے جو شخص حکومت کے کسی حکم کے ماننے سے انکار کردے اس پر بغاوت کی دفعہ لگ جاتی ہے اور کفر اللہ کی بغاوت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اسکے پیچھے

بِالرُّسُلِ ز وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ

رسول اور دیتے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ

قوت دی اس کو روح پاک سے پھر بھلا جب تم پاس لایا کوئی رسول

بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ج فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز

جو نہ چاہا تمہارے جی نے تم تکبر کرنے لگے پھر ایک جماعت کو جھٹلایا

وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور ایک جماعت کو مار ڈالتے

شناعت سیزدہم (۱۳)

قال تعالیٰ۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ .... الی ..... وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۔

اور البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کی ہدایت اور اصلاح کا بڑا اہتمام کیا چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو ایک روشن کتاب یعنی توریت عطا کی اور پھر انکے دنیا سے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل کی اصلاح اور تربیت کے لیے مسلسل یکے بعد دیگرے پیغمبروں کو بھیجا کہ اللہ کے عہدوں کو یاد دلاتے رہیں اور شریعت موسویہ کی پیروی اور اس پر استقامت کی تلقین کرتے رہیں اور پھر خاندان بنی اسرائیل کے اخیر میں عیسیٰ بن مریم کو نبوت و رسالت کے واضح اور روشن دلائل دیکر بھیجا اور خاص طور سے روح القدس یعنی جبرائیل امین سے

انکو قوت دی جو ہر وقت اُن کے ساتھ رہتے تھے اور دشمنوں سے انکی حفاظت کرتے تھے ولادت سے لیکر رفع الی السماء کے وقت تک جبرائیل آپکے محافظ رہے اور اسکے آثار و ثمرات و انوار و تجلیات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے تو کیا اسکے بعد بھی تم نرم نہ پڑے اور جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسا حکم لیکر آیا کہ جس کو تمہارے نفس پسند نہ کرتے تھے تو تم نے تکبر اور سرکشی کی حالانکہ عقل کا مقتضٰی یہ تھا کہ اللہ کے نبیؑ اور رسولؐ کی دل و جان سے اطاعت کرتے اور نفس سرکش کی مخالفت کرتے۔ تم جیسے نادان یہ تو کیا کرتے پس تم نے الٹی ہی راہ اختیار کی اور پیغمبروں کے ایک گروہ کو جھٹلایا اور انبیاء کی ایک جماعت کو مار ڈالتے ہو اور ظاہر ہے کہ جو مریض بجائے اسکے کہ طبیب کی ہدایت پر چلے۔ الٹا طبیب کی بے حرمتی کرے اور اسکو جھٹلائے بلکہ اسکو قتل کر ڈالے وہ کہاں شفایاب ہو سکتا ہے اور ایسے روحانی مریض کے لیے ایام معدودہ کی سزا کافی نہیں بلکہ دائمی اور ابدی سزا چاہیئے۔

ف یہود انبیاء کی تکذیب تو ایک مرتبہ کر چکے اور قتل کا سلسلہ جاری ہے۔ اب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درپئے قتل ہیں اس لیے کَذَّبْتُمْ بصیغہ ماضی لائے اور تَقْتُلُوْنَ کو بصیغۂ مضارع لائے جو ان کے فعل قتل کے حال اور استقبال میں جاری اور مستمر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نیز قتل کا واقعہ اگرچہ گزشتہ زمانہ میں ہو چکا ہے مگر چونکہ انبیاء کا قتل نہایت ہی عظیم اور سخت ہے اس لیے اس کی عظمت اور شناعت کے ظاہر کرنے کے لیے صیغۂ مضارع سے تعبیر کیا تاکہ وہ پیش نظر ہو جائے گویا کہ وہ اب ہو رہا ہے اور یہ ہولناک اور حیرتناک واقعہ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہے۔

(ربط) یہاں تک بنی اسرائیل کے اُس معاملہ کا ذکر تھا جو انبیاء سابقین اور گزشتہ کتب منزلہ کے ساتھ تھا اب آئندہ آیات میں ان بدبختوں کے اُس معاملہ کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے نبی آخر الزمانؐ اور قرآن کے ساتھ کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ

وہ کہتے ہیں ہمارے دل پر غلاف ہے یوں نہیں لعنت کی ہے اللہ نے انکے انکار سے

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

سو کم یقین لاتے ہیں

شناعت چہاردہم (۱۴)

قال تعالٰی۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ...... الٰی ...... فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ۔

اور ان کے غرور اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ خدا کے پیغمبروں سے بطور فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں سوائے اپنے دین کے کسی نئی بات کا اثر ہمارے دلوں تک نہیں پہنچتا یعنی ہم اپنے دین پر نہایت پختہ اور مضبوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ وجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُنکے انکار اور تکذیب کی وجہ سے ان پر لعنت فرمائی ہے اور اپنی رحمت اور عنایت سے دور ڈال دیا ہے اس لیے حق بات ان پر اثر نہیں کرتی اور ان کے دل حق اور نصیحت کو قبول نہیں کرتے۔ اور حق سے متنفر اور بیزار ہیں یہ غلاف نہیں بلکہ اللہ کی لعنت کی نشانی اور علامت ہے۔ کفر اور لعنت کے زنگ نے انکے دلوں کو اس قدر سیاہ اور زنگ آلود کر دیا ہے کہ آئینۂ دل میں شاید ہی کوئی جز ایسا باقی رہا ہو کہ ایمان اور ہدایت کی روشنی کو قبول کر سکے۔ اس لیے یہ لوگ بہت ہی قلیل ایمان لاتے ہیں یعنی شریعت کے کسی حکم کو کبھی مان بھی لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ایمان قلیل قابل قبول نہیں مثلاً اگر توحید و رسالت کا اقرار بھی کر لیا۔ اور اجمالی طور پر جنت و جہنم پر بھی ایمان لے آیا اور شریعت کے دوسرے احکام کا انکار کر دیا تو ایسے ایمان سے کوئی فائدہ نہیں ایمان قلیل تو کیا معتبر ہوتا۔ نجات کے لیے تو ایمان کثیر بلکہ ایمان اکثر بھی کافی نہیں کہ دین کی کثیر اور اکثر باتوں کو ماننے اور بعض کا انکار کر دے ایمان اللہ کے تمام احکام کے ماننے کا نام ہے محض قلیل و کثیر کے ماننے سے شریعت میں مؤمن نہیں کہلاتا۔

فائدہ حضرات مفسرین نے غُلْفٌ کے دو معنی بیان کیے ہیں اول یہ کہ غلف اَغْلَفُ کی جمع ہے جیسے احمر اور اصفر کی جمع حُمْرٌ اور صُفْرٌ آتی ہے اور اَغْلَفُ اسی شے کو کہتے ہیں جو کسی غلاف اور پردہ میں محفوظ اور مستور ہو۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے کہ ہمارے دلوں پر غلاف اور پردہ پڑا ہوا ہے اس لیے آپکی بات ہمارے دلوں تک پہنچتی نہیں۔ جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّةٍ۔ (اور کہا کافروں نے ہمارے دل پردوں میں ہیں) مجاہدؒ اور قتادہؒ سے یہی معنی منقول ہیں۔

دوم یہ کہ غُلْفٌ غلاف کی جمع ہے دراصل غُلُفٌ بضم اللام تھا جیسے کتابٌ کی جمع کُتُبٌ آتی ہے مگر تخفیف کی وجہ سے لام کو ساکن کر دیا گیا اور ابن عباسؓ غُلُفٌ بضم لام پڑھتے تھے۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہونگے کہ ہمارے دل علم کے غلاف اور برتن ہیں جن میں ہر قسم کا علم بھرا ہوا ہے۔ تمہارے علم کی ضرورت نہیں۔ اللہ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا کہ جھوٹ بولتے ہیں۔ نہ اُنکے دلوں پر پردہ ہے اور نہ ان کے دل علم کے غلاف اور ظرف ہیں بلکہ ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور پھینک دیا ہے اور ان کے دلوں سے قبول حق کی استعداد کو سلب کر لیا ہے اس لیے ان کے دل حق کو قبول نہیں کرتے فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓی اَبْصَارَهُمْ اللہ تعالیٰ نے انکو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے اور وہ مالک مطلق ہے جس کو چاہے ظاہر کا اندھا بنائے اور جس کو چاہے باطن کا اندھا بنائے کسی کی مجال کیا ہے جو یہ پوچھ سکے کہ اس کی ظاہر یا باطن کی آنکھ کیوں پھوڑی؟

اخرج احمد بسند جید عن ابی سعید قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم القلوب اربعة قلب[1] اجرد فیہ مثل السراج یزھر و قلب[2] اغلف مربوط علی غلافه و قلب[3] منکوس و قلب[4] مصفح۔ فاما القلب الاجرد فقلب المؤمن سراجه فیه نوره و اما القلب الاغلف فقلب الکافر و اما القلب المنکوس فقلب المنافق عرف ثم انکر و اما القلب المصفح فقلب فیه ایمان و نفاق فمثل الایمان فیه کمثل البقلة یمدها الماء الطیب و مثل النفاق فیه کمثل القرحة یمدها القیح۔ فای المادتین غلبت علی الاخری غلبت علیه (درمنثور ص۸۷ ج۱)

امام احمدؒ نے سند جید کے ساتھ ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دل چار قسم کے ہیں ایک دل تو وہ ہے جو آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہے اور اس میں کوئی چراغ روشن ہے اور ایک دل وہ ہے جو غلاف میں بند ہے اور غلاف کا منہ تاگے یا رسی سے بندھا ہوا ہے اور ایک دل الٹا اور اوندھا اور ایک دل وہ ہے جس کے دو صفحے یعنی دو جانبیں ہیں ایک سفید ہے اور ایک صفحہ سیاہ۔ پس صاف و شفاف دل تو مومن کا دل ہے جس میں ایمان کا چراغ روشن ہے اور غلاف میں بند کافر کا دل ہے اور الٹا اور اوندھا دل منافق کا ہے۔ کہ جس نے حق کو پہچانا اور پھر اس کا انکار کیا اور دو رویہ دل وہ ہے کہ جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں پس ایمان اس دل میں مثل سبزہ کے ہے کہ پاکیزہ پانی اس کو بڑھاتا ہے اور اس کے دل میں نفاق مثل ناسور کے ہے کہ جو دم بدم پیپ اور خون کو بڑھاتا ہے پس ان دو مادوں میں سے جو نسا مادہ غالب آجائے اسی کا اعتبار ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

⁂ ⁂ ⁂

اللّٰھم نور قلوبنا بانوار طاعتك و معرفتك امین یا ارحم الراحمین۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

اور جب پہنچی ان کو کتاب اللہ کی طرف سے سچ بتاتی ان پاس والی کو

مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ

اور پہلے سے فتح مانگتے تھے

كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ

کافروں پر پھر جب پہنچا ان کو جو پہچان رکھا تھا اس سے منکر ہوئے سو

اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ

لعنت ہے اللہ کی منکروں پر برے مول خرید کیا اپنی جان کو کہ منکر

يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ

ہوئے اللہ کے اتارے کلام سے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے

فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے سو کما لائے غصہ

عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

پر غصہ اور منکروں کو عذاب ہے ذلت کا

شناعت پانزدہم (۱۵)

قال تعالیٰ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ .... الی ... وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

(ربط) گزشتہ آیات میں قلب اغلف کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں قلب منکوس کا ذکر ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ یہود۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خوب پہچانتے تھے کہ یہی نبی آخر الزمان ہیں۔ مگر عناد اور حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسی کتاب آئی یعنی قرآن شریف جسکے اعجاز کو دیکھ کر خود ان کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے اور پھر مزید برآں وہ قرآن جو منجانب اللہ اُن کے پاس آیا اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے یعنی توریت کی تصدیق اور موافقت کرتا ہے حالانکہ آپ اُمّی ہیں۔ آپ تو عربی خط اور عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے تھے جو کتاب عبرانی خط میں ہو اس کے مضامین کی

واقفیت کیسے ہوسکتی ہے سوائے وحی کے اور کوئی ذریعہ علم نہیں اور تعجب ہے کہ یہ لوگ آپکی نبوت میں تردد کرتے ہیں۔ حالانکہ نزول قرآن اور آپکی بعثت سے پہلے ہی لوگ کافروں اور بت پرستوں کے مقابلہ میں آپ کے نام اور برکت سے فتح ونصرت اللہ سے مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ یہود مدینہ اور یہود خیبر کی جب عرب کے بت پرستوں سے لڑائی ہوتی تو یہ دعا مانگتے۔

اللّٰھم ربنا انا نسألك بحق احمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه لنا فی اٰخر الزمان و بکتابك الذی تنزل علیه اٰخر ما تنزل ان تنصرنا علی اعدائنا اخرجه ابونعیم والحاکم والبیھقی وغیرھم عن ابن عباس وابن مسعود وغیرھم بالفاظ مختلفة (درمنثور)	اے اللہ ہم تجھ سے اس احمد مصطفےٰ نبی امی کے حق سے سوال کرتے ہیں جسکے ظاہر کرنے کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور اس کتاب کے واسطہ اور برکت سے سوال کرتے ہیں جس کو تو سب سے اخیر میں نازل کریگا کہ ہم کو ہمارے دشمنوں پر فتح اور نصرت عطا فرما یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود اور دیگر صحابہ سے بالفاظ مختلفہ مروی ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

غرض یہ کہ آپؐ کے ظہور سے پہلے ہی یہود آپکو خوب پہچانتے تھے اور آپکے نام مبارک اور قرآن کریم کے واسطہ اور برکت سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح ونصرت کی دعا مانگتے تھے اور فتح پاتے تھے اور آپؐ کے توسل کو موجب خیر وبرکت سمجھتے تھے پس جب ان کے پاس وہ چیز خود بخود آپہنچی یعنی نبی اُمی اور قرآن جس کو آنے سے پہلے ہی خوب پہچان چکے تھے اور اسکے ظہور کے منتظر تھے آتے ہی محض حسد اور عناد کی وجہ سے ان کا انکار کر بیٹھے ایسے لوگوں کے عذاب میں کیسے تخفیف ہوسکتی ہے یا ایسے لوگوں کا عذاب ایام معدودہ کیسے ہوسکتا ہے پس لعنت ہو اللہ کی ایسے کافروں پر جنہوں نے دیدہ ودانستہ حق کو محض حسد اور عناد کی وجہ سے چھپایا۔ حق تو یہ تھا کہ جن کے نام کی برکت سے فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے تھے اور فتحیاب ہوتے تھے آج دل وجان سے اس نبی اُمی اور اسکے دین کی نصرت اور اعانت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے ۔ اور سب سے پہلے اس نبی اور اس کتاب پر ایمان لاتے نیز جب یہ کتاب توریت کی مصدق تھی تو اس کی تصدیق عقلاً لازم تھی اس لیے کہ اسکی تکذیب توریت کی تکذیب کو مستلزم ہے۔ بہت ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ[1] ڈالا یا اپنے گمان میں اُنکو خرید

[1] یعنی حسد اور طمع کی وجہ سے کفر کے بدلہ میں اپنی جانوں کو فروخت کر ڈالا گویا کہ دوزخ کے فرشتوں کے ہاتھ ہلاکت کے لیے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ اس تفسیر میں اشتراء بمعنی بیع کے ہے اور انکی جان بمنزلہ مبیع ہے اور کفر بمنزلہ ثمن ہے اور دوسری تفسیر میں اشتراء خریدنے کے معنی میں ہے۔ جمہور کے نزدیک مختار پہلا ہی قول ہے ۱۲ منہ

لیا اور اپنے خیال اور زعم فاسد کی بنا پر انکو عذاب الٰہی سے چھٹکارا لیا وہ یہ کہ انکار کرنے لگے اس چیز کا جو اللہ نے اپنے نبی پر نازل کی محض اس حسد اور عناد کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور عطا یعنی وحی سے جس بندہ پر چاہے کچھ نازل فرمائے پس یہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہوئے کہ طرح طرح سے اسباب غضب کے مرتکب ہوئے۔

(۱) جس توریت پر ایمان کے مدعی تھے اس میں سے نبی آخر الزماں کی بشارتوں کے چھپانے کی خاطر تحریف کی۔

(۲) باوجودیکہ اس نبی امی اور قرآن کے واسطہ سے بار بار فتح و نصرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا پھر جب وہ نبی اُمی اور وہ کتاب معجز سامنے آئی تو اقرار اور اعتراف کے بعد اس سے انحراف کیا۔

(۳) نبی برحق پر حسدؔ کیا اور در پردہ اللہ پر اعتراض کیا کہ یہ منصب رسالت کے اہل نہ تھے ان کو یہ منصب کیوں عطا کیا ان وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے قسم ہا قسم کے غضب اور غصہ کے مورد بنے پس جو شخص غضب خداوندی کے پشتارہ کا حامل ہو نہ اس کے عذاب میں تخفیف ہوسکتی ہے اور نہ اسکا عذاب چند روز میں منقطع ہوسکتا ہے اور اگر ان تمام وجوہ غضب سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو دائمی عذاب کے لیے فقط ایک کفر ہی کافی ہے جو ان میں موجود ہے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے اور گنہگار مسلمانوں کو جو عذاب ہوگا وہ اہانت اور تذلیل کے لیے نہ ہوگا بلکہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوگا جیسا کہ میلا اور گندہ کپڑا بھٹی پر میل کچیل صاف کرنے کے لیے چڑھایا جاتا ہے۔ جلانے کے لیے نہیں دشمن کو مارنا تذلیل اور تحقیر کے لیے ہوتا ہے اور بیٹے اور شاگرد کو مارنا اصلاح اور تادیب کے لیے ہوتا ہے ایک مار تعذیب کے لیے ہے اور ایک تہذیب کے لیے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا

اور جب کہیئے اُن کو مانو اللہ کا اتارا کلام کہیں ہم

نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ

مانتے ہیں جو اترا ہم پر اور وہ نہیں مانتے جو پیچھے آیا اس

وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ

سے اور وہ اصل تحقیق ہے سچ بتاتا ان پاس والی کو کہہ پھر کیوں مارتے رہے ہو

اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۱﴾

نبی اللہ کے پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے

شناعت شانزدہم (۱۶)

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا .... الیٰ ...... اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ

اور دلیل اس امر کی (کہ یہود کا یہ معاملہ آپ کے ساتھ محض حَسَدْ کی بناء پر ہے) یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ ہر اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے خواہ کسی پیغمبر پر اس کا نزول ہوا ہو جو چیز بھی خدا نے نازل کی اس پر ایمان لانا واجب ہے خواہ وہ توریت و انجیل ہو یا قرآنِ کریم ہو۔ وجوب ایمان کی علت حکم خداوندی ہوتا ہے جو تمام کتب الٰہیہ میں مشترک ہے وہ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو فقط اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ جو خاص ہم پر ہمارے نبی کے واسطہ سے نازل کی گئی۔ اس قید سے ان کا حسد صاف ظاہر ہے کہ جو کتاب بنی اسرائیل پر اتری اس پر تو ایمان لائیں گے اور جو کتاب بنی اسمٰعیل پر اتری اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور محض حسد کی بناء پر اپنی کتاب کے سوا تمام کتابوں کا انکار کرتے ہیں حالانکہ توریت کے سوا اور جو کتابیں خدا تعالیٰ نے نازل کیں وہ فی نفسہٖ حق ہیں یعنی سچی اور واقع کے مطابق ہیں اور ان کے تمام مضامین محقق اور مدلل ہیں اور فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہیں جو ان کے ساتھ ہے لہٰذا جو چیز فی حد ذاتہٖ حق اور واقع کے مطابق ہو اور پھر اسکے علاوہ اس چیز کے ساتھ مطابق ہو جس کو وہ سچا اور برحق سمجھتے ہیں تو ایسی چیز کو نہ ماننا سراسر خلاف عقل ہے اس لیے کہ مطابق کا مطابق بھی مطابق ہی ہوتا ہے لہٰذا ایک مطابق کو ماننا اور دوسرے مطابق کو نہ ماننا تناقض کو مستلزم ہے اور اگر اس پر بھی وہ توریت پر ایمان کے مدعی ہیں تو آپ ﷺ اُن سے یہ کہیئے کہ اچھا تم یہ بتلاؤ کہ تم اللہ کے پیغمبروں کو کس لیے پہلے ہی سے قتل کرتے چلے آرہے ہو حالانکہ وہ پیغمبر توریت ہی کے مطابق حکم دیتے تھے اور شریعت موسویہ کی تائید اور تجدید کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ جیسے حضرت شعیاؑ اور حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰ علیہم السلام اگر تم حقیقۃً توریت پر ایمان رکھنے والے تھے۔ معلوم ہوا کہ تم توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ توریت اور شریعت موسویہ پر تمہارا ایمان کا دعویٰ غلط ہے۔

وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ

اور آ چکا تم پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر تم نے بنا لیا بچھڑا

مِنۢ بَعۡدِهٖ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۹۲﴾

اس کے پیچھے اور تم ظالم ہو

شناعت ہفدہم (۱۷)

قال تعالیٰ وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ .... الی ..... وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ۔

اور انبیاء کے قتل کا واقعہ تو موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس سے بڑھ کر کفر کر چکے ہو وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس توحید و رسالت کی نہایت واضح اور روشن دلیلیں لیکر آئے جو اس بات پر صاف طور پر دلالت کرتی تھیں کہ عبادت اور بندگی اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں پھر بھی تم نے انکے جانے کے بعد ہی ایک گوسالہ بے عقل کو اپنا معبود بنا لیا اور جب خدا ہی ایک بے عقل حیوان ٹھہرا تو اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ بے عقل حیوان کے بندے کس درجہ بے عقل اور حیوان ہونگے۔ ہندوستان کے ہندو جو گوسالہ پرستی کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکا سلسلۂ سند سامری سے ضرور ملتا ہوگا اور تم بڑے ہی ظالم ہو کہ اپنے ہاتھ سے ایک بے عقل حیوان کی بنائی ہوئی صورت کو تم نے خدا بنا لیا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہو سکتا ہے۔

ف گوسالہ کو معبود بنانا اس لیے تھا کہ یہ لوگ غایت حماقت کی وجہ سے یا تو مجسمہ تھے یا حلولیہ تھے یعنی خدا تعالیٰ کا کسی جسم میں حلول کرنا جائز سمجھتے تھے۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ

اور جب ہم نے لیا اقرار تمہارا اور اونچا کیا تم پر

الطُّوۡرَؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاسۡمَعُوۡاؕ قَالُوۡا

پہاڑ پکڑو جو ہم نے تمکو دیا زور سے اور سنو بولے

سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَاۗ وَاُشۡرِبُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ

سنا ہم نے اور نہ مانا اور رچ رہا ان کے دلوں میں وہ بچھڑا

بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

مارے کفر کے تو کہہ بُرا کچھ سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا اگر

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

تم ایمان والے ہو

شناعت ہشتدہم (۱۸)

قال تعالیٰ. وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ .... الیٰ .... اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

اور ایک اور قصہ سنو جس سے توریت کے ساتھ یہود کے ایمان کا حال معلوم ہوگا. جب ہم نے تم سے اس بات کا عہد لیا کہ جب توریت تمہارے پاس پہنچے تو دل و جان سے اس کو قبول کرنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا مگر تم اپنے اس عہد سے پھر گئے. اور توریت پر عمل کرنے میں حیلے اور بہانے شروع کیے. اس وقت ہم نے تمہارے سروں پر کوہِ طور لاکھڑا کیا اور حکم دیا کہ جو احکام ہم نے تم کو دیئے ہیں ان کو نہایت مضبوطی اور پختگی کے ساتھ پکڑو اور گوشِ ہوش سے انکو سنو مبادا کوئی حکم تم کو یاد نہ رہے اور پھر تمہاری یہ غفلت معصیت کا سبب بن جائے اس کے جواب میں انہوں نے یہ کہا کہ احکام توریت کو سُن لیا ہے مگر مانا نہیں اور اگر اُن کے تمرد اور عصیان کا سب سے بڑا نمونہ دیکھنا چاہو تو یہ ہے کہ ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت پلا دی گئی تھی. اس لیے انکو گوسالہ پرستی لذیذ اور خدا پرستی تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی تھی. ظاہر نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے اسی حالت میں بھی سَمِعْنَا اور عَصَيْنَا دونوں کلمے زبان سے کہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ ایسی خوفناک حالت میں زبان سے عصينا کہنا بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ بالفرض والتقدیر اگر کسی حالت میں زبان سے عَصَيْنَا نکالتے تو اسی وقت کوہِ طور گرا کر انکو چورچور کر دیا جاتا اور سب کے سب ہلاک کر دیئے جاتے کیونکہ کوہ طور کو سروں پر لاکر کھڑا کرنا اس لیے تھا کہ وہ توریت کو قبول کریں ایسی حالت میں بھی اگر زبان سے عَصَيْنَا کہا تھا تو پھر کوہ طور کھڑا کرنے سے کیا فائدہ ہوا. اسی اشکال کی بناء پر بعض مفسرین نے توجیہ کی ہے کہ سَمِعْنَا کہنا بزبان قال تھا اور عَصَيْنَا کہنا بزبان حال تھا زبان سے تو فقط سَمِعْنَا ہی کہا تھا لیکن جب اقرار کے بعد فوراً ہی عصیان اور نافرمانی کرنے لگے تو ان کی حالت کے اعتبار سے عَصَيْنَا کہنا ان کی طرف منسوب کیا گیا گویا کہ وہ اسی حالت میں بزبان حال عَصَيْنَا کہہ رہے تھے حضرت شاہ عبدالعزیز

دہلوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ حقیقت امر یہ ہے کہ بنی اسرائیل باوجودیکہ کوہ طور کو اپنے سروں پر معلق دیکھ رہے تھے مگر یہ گمان کیا کہ یہ محض ڈرانے کے لیے ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی شفاعت سے اور بلاؤں کی طرح یہ بلا بھی ٹل جائے گی۔ اس لیے انہوں نے ابتدائً احکام توریت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور صاف عَصَیْنَا کہدیا کہ کیوں توریت کے احکام شاقہ کی ذمہ داری اپنے سر پر لیں۔ اس گمان پر انہوں نے یہ کلمہ اپنی زبان سے کہا لیکن جب دیکھا کہ پہاڑ ان کے سروں کے نزدیک ہوتا جا رہا ہے تو سمجھے کہ یہ حیلے اور بہانے چلیں گے نہیں اس لیے چار و ناچار سجدہ میں گرے اور زبان سے الفاظ قبول کہے جیساکہ سورۂ اعراف میں ہے۔ وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ جب یہ یقین ہوگیا کہ پہاڑ ٹلنے والا نہیں اس وقت مجبور ہو کر قبول کیا۔ مگر کچھ مدت بعد پھر منحرف ہو گئے کما قال تعالیٰ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قبول کے ایک مدت بعد انحراف کیا اور اس مقام پر ان کے ابتدائی حال کا بیان ہے کہ ابتداء میں انہوں نے قبول نہیں کیا اور سَمِعْنَا کے ساتھ عَصَیْنَا بھی کہا لیکن بعد میں مجبور ہو کر قبول کیا اور پھر ایک زمانہ کے بعد اس سے انحراف کیا۔ بحمد اللہ اس تقریر پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اِنتھٰی کَلَامُہٗ مُحَصَّلًا وَ مُوَضَّحًا۔

خلاصہ یہ کہ جس ایمان کے وہ مدعی ہیں اس ایمان کی حقیقت اور کیفیت یہ ہے جو بیان ہوئی اسے ہمارے نبی آپؐ ان سے مختصراً بس اتنا کہد یجئے کہ بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے کرنے کا تم کو تمہارا ایمان حکم دیتا ہے اگر حقیقۃً تم مومن ہو۔ اور دعوائے ایمان میں سچے ہو۔ یعنی یہ محض تمہارا ساختہ اور پرداختہ ایمان ہے جو ایسے افعال شنیعہ اور اقوال قبیحہ کا حکم دیتا ہے حقیقی ایمان کبھی ایسی قبیح اور شنیع باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ اگر تمہارا ایمان تم کو ایسی ہی باتوں کا حکم دیتا ہے تو بہت برا ایمان ہے مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایمان اگر تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ قادر مطلق کو چھوڑ کر ایک بے زبان اور لا یعقل جانور کو خدا بنالو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم الشان رسول کی تکذیب کرو پس ایسا ایمان جو تمہیں کفر کا حکم کرتا ہے یہ تو بہت ہی برا ایمان ہے۔ ایسے لوگ تو دائمی سزا کے مستحق ہیں ایسوں کے لیے ایام معدودہ کا عذاب ہرگز کافی نہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ

تو کہہ اگر تم کو ملنا ہے گھر آخرت کا اللہ کے یہاں

خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ

الگ سوائے اور لوگوں کے تو تم مرنے کی آرزو کرو

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ

اگر سچ کہتے ہو اور یہ آرزو کبھی نہ کریں گے جس واسطے آگے بھیج

اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ

چکے ہیں ہاتھ انکے اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو اور تو دیکھے ان کو سب

اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ

لوگوں سے زیادہ حرص جینے کی اور شریک پکڑنے والوں سے بھی

يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ

ایک ایک چاہتا ہے کہ عمر پاوے ہزار برس اور کچھ اس کو سرکا نہ

مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع ۱۱

دے گا عذاب سے اتنا جینا اور اللہ دیکھتا ہے جو کرتے ہیں۔

شناعت نوزدہم (۱۹)

قال تعالیٰ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ ...الیٰ... وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

یہود باوجود ان شنائع اور قبائح کے یہ کہتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا اور آخرت کی نعمتیں ہمارے لیے مخصوص ہیں تو اے ہمارے نبی آپ انکے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ اگر دار آخرت فقط تمہارے ہی لیے اللہ کے یہاں خاص ہے اوروں کے لیے نہیں یعنی بہشت اور نعمائے آخرت میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو پھر مرنے کی تمنا اور آرزو کر کے دکھلاؤ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اس لیے کہ دار آخرت کی وہ لازوال اور بیمثال نعمتیں کہ جن میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں اُن تک پہنچنے کا راستہ سوائے موت کے اور کوئی نہیں لہٰذا اگر تم کو یہ یقین ہے کہ اس دار جاودانی کی نعمتیں تمہارے لیے مخصوص ہیں تو پھر اس دار فانی اور کلبۂ احزان و پریشانی سے خلاصی اور نجات کی تمنا کرو۔ قصر عالی شان اور اعزاز شاہی کے مقابلہ میں جیل خانہ کی ذلت اور مشقت کو ترجیح دینا کسی عاقل کا کام نہیں خصوصاً جبکہ جدال و قتال کا بازار گرم ہے اور یہود کے مرد مارے جا رہے ہیں اور بچے اور عورتیں غلام بنائے جا رہے ہیں مال و

اسباب ٹوٹا جارہا ہے اور جزیہ اور خراج ان پر قائم کیا جارہا ہے تو ایسی حیات سے بلاشبہ موت افضل اور بہتر ہے تمکو معلوم ہے کہ لذائذ دنیوی۔ نعمِ اخروی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور تم اس وقت مسلمانوں سے جنگ و جدال کی وجہ سے تکلیف اٹھارہے ہو تو موت کی تمنا کرو تاکہ اس رنج و محن سے چھٹکارا ملے اور چونکہ اپنے دعوے کے موافق خاصانِ خدا سے ہو اس لیے تمہاری دعا بھی ضرور قبول ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اور ہم موت اور حیات کے مالک ہیں۔ جس وقت بھی تم موت کی تمنا کرو گے اسی وقت موت واقع کردیں گے۔ جیساکہ حدیث میں ہے کہ اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو پانی ہی کے گھونٹ سے گلا گھٹ کر مر جاتے وجہ اسکی یہ ہے کہ جو شئی ممکن الوقوع ہو۔ تحدی اور اظہار معجزہ کے وقت اسکا وقوع اور تحقق واجب اور لازم ہو جاتا ہے لیکن یہ وجوب اور لزوم اُن کی تمنا اور آرزو پر موقوف تھا لہذا جب انہوں نے تمنا نہ کی تو موت بھی متحقق نہ ہوئی اور چونکہ انکو یقین تھا کہ اللہ اور اسکے رسول کی تحدی کے بعد اگر ہم نے موت کی تمنا کی تو موت ضرور آجائے گی اس لیے ڈر کے مارے موت کی تمنا نہیں کی۔ خوب جانتے تھے کہ موت کی تمنا کرنے سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ظاہر ہو جائے گا اس لیے موت کی تمنا کرنے سے عاجز رہے جیساکہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں اور ہم ابھی سے خبر دیتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اُن اعمال شنیعہ کے خوف کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ پہلے کرچکے ہیں یہ جملہ بطور پیشین گوئی اور غیب کی خبر کے ہے جو حضورؐ کا معجزہ اور یہود کے عجز کی دلیل ہے اور اللہ تعالے ظالموں کو خوب جانتا ہے اگرچہ وہ موت کی تمنا نہ کریں اور موت سے کتنا ہی بھاگیں۔ ایک نہ ایک دن ضرور موت آئے گی اور ان سب اعمال کفریہ کی انکو سزا ملے گی۔

ف: ۱ جاننا چاہیئے کہ یہ ایک قسم کا مباہلہ تھا۔ حق اور باطل کا فیصلہ اکثر مناظرہ اور مجادلہ سے ہوتا ہے اور کبھی مباہلہ سے۔ اس لیے کہ فیصلہ کے دو۲ طریق ہیں۔ ایک طریقہ معتاد اور ایک طریقہ غیر معتاد۔ معتاد طریقہ یہ ہے کہ مناظرہ اور مباحثہ سے فیصلہ کیا جائے۔ اور غیر معتاد طریقہ یہ ہے کہ فیصلہ ایسے طریقہ سے کیا جائے جو خارق للعادۃ اور اسباب ظاہری کے دائرہ سے بالا اور برتر ہو یعنی بطریق معجزہ اور کرامت اس کا فیصلہ کیا جائے چنانچہ اس مقام پر جب حجت اور دلیل اور نظر اور فکر کے تمام مراحل ختم ہو گئے تو خصم کے افحام اور الزام کے لیے ایک خارق عادت طریق اختیار کیا گیا وہ یہ کہ ایک مرتبہ زبان سے یہ کہہ دیں کہ اے اللہ ہم کو موت دے اسی وقت انکا صدق و کذب ظاہر ہو جائیگا اور اگر یہود کو اس کا یقین نہ ہوتا تو جوش عداوت میں ضرور کہہ ڈالتے تاکہ حضور کا معجزہ ظاہر نہ ہو۔

ف: ۲ یہ خطاب اور یہ تحدی ان یہودیوں کے ساتھ مخصوص تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے اور خوب جانتے تھے کہ یہی وہ نبیٔ برحق ہیں جن کی پیشین گوئی توریت میں ہے اور ہر زمانہ کے یہود سے یہ خطاب نہیں جیساکہ روح المعانی صـ۲۹۶ ج ا عبداللہ بن عمر رضی

اللہ عنہما سے منقول ہے اور ابداً کا لفظ انہی کے عمر کے لحاظ سے فرمایا گیا۔

ف : ۳ یہود نے نہ زبان سے تمنا کی ورنہ ضرور منقول ہوتی اور نہ دل سے تمنا کی ورنہ اگر دل سے تمنا کرتے تو خجالت اور الزام کے دور کرنے کے لیے زبان سے ضرور اسکا اظہار کرتے۔

ایک شبہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ سوال تو یہود کی طرف سے مسلمانوں پر بھی وارد ہو سکتا ہے کہ تم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ سوائے مسلمانوں کے اور کوئی جنت میں نہیں جائیگا لہذا تم کو بھی چاہیئے کہ موت کی تمنا کرو۔

ازالہ جواب یہ ہے کہ یہود کا عقیدہ فقط یہی نہیں تھا کہ ہم اہل حق ہیں اور ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جائیگا بلکہ ساتھ یہ بھی اعتقاد تھا کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں کما قال تعالیٰ حاکیا عنہم نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَ اَحِبَّآءُهٗ ہمارے اعمال وافعال اور اقوال واحوال کیسے ہی ناشائستہ اور ناگفتہ ہوں ہم ضرور جنت میں جائیں گے جنت ہماری جدی اور خاندانی میراث ہے مرتے ہی ہم بہشت میں داخل ہو جائیں گے اور مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ اور جنت ہمارے لیے مخصوص ہے ہمارے اعمال اچھے ہوں یا بُرے ہر حال میں ہم جنت میں جائیں گے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا دارو مدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اس لیے مسلمان ہمیشہ اپنی ناز یبا افعال واقوال سے ڈرتے رہتے ہیں بخلاف یہود کے کہ وہ بیدھڑک گناہ کرتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں۔ سَیُغْفَرُ لَنَا یعنی ہم کوئی گناہ کرلیں سب بخشے جائیں گے کسی قسم کی معصیت ہمارے لیے مضر نہیں اور نہ ہم سے کوئی حساب وکتاب ہوگا اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا اس لیے ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ زندگی اور بڑھ جائے تاکہ گزشتہ تقصیرات کی توبہ اور استغفار سے کچھ تلافی کر سکیں اور کچھ اعمال صالحہ کر کے سفر آخرت کے لیے زاد اور راحلہ تیار کر سکیں۔

موت کی تمنا کا حکم شرعی

احادیث میں بلا ضرورت موت کی تمنا کرنے کی یا دنیاوی مصائب سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ عمر کا زیادہ ہونا اور توبہ اور اعمال صالحہ کے لیے وقت کا میسر آجانا ایک نعمت عظمیٰ اور غنیمت کبریٰ ہے البتہ اگر قلب پر لقاء خدا وندی کا شوق غالب ہو تو پھر موت کی تمنا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ فرط شوق سے اس درجہ مغلوب الحال ہو جائے کہ دنیاوی منافع اسکی نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور غلبۂ شوق میں اس کو اسکا بھی خیال نہ رہے کہ جسقدر عمر زیادہ ہوگی اسی قدر قرب خداوندی کے اسباب

زیادہ حاصل کرسکوں گا۔ اور حضرات صحابہ سے جو اس قسم کی آرزو منقول ہے سو وہ اس وقت میں تھی کہ جب
اسباب موت کے سامنے آگئے اور دنیا کی زندگی سے مایوسی ہوگئی اس وقت موت کی فرحت اور مسرت
میں کچھ کلمات زبان سے نکلے اور یہ وقت محل بحث سے خارج ہے تفصیل کے لیے تفسیر عزیزی اور
تفسیر مظہری کی مراجعت کی جائے۔ اور یہ لوگ موت کی تمنا اور آرزو ہرگز نہیں کرسکتے اس لیے کہ البتہ تحقیق
آپ انکو سب لوگوں سے زیادہ اس فانی زندگی پر حریص پائیں گے حتیٰ کہ ان لوگوں سے بھی زیادہ حریص پائیں
گے۔ جو لوگ مشرک اور بت پرست ہیں اور اخروی حیات کے بالکل قائل نہیں دنیوی ہی حیات کو حیات
سمجھتے ہیں اور یہود باوجودیکہ حیات اخروی اور آخرت کے ثواب اور عقاب کے قائل ہیں انکا سب سے
زیادہ زندگی پر حریص ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ انکو اپنے مجرم ہونے کا یقین کامل ہے ہر ایک ان میں
سے یہ چاہتا ہے کہ اسکو ہزار برس کی عمر دیجائے حالانکہ ہزار برس کی عمر دیا جانا بھی اللہ کے عذاب کو دفع نہیں
کرسکتا ہزار برس کے بعد بھی موت ہی ہے اور ان لوگوں کو اگر ہزار برس سے بھی زیادہ عمر ملجائے تب بھی کوئی
فائدہ نہیں جس قدر انکی عمر زیادہ ہوگی اسی قدر انکا کفر زیادہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھ
رہا ہے کہ دمبدم کفر اور معصیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے حق میں تخفیف عذاب کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ
تو کہہ جو کوئی ہو گا دشمن جبریل کا سو اس نے اتارا ہے یہ کلام تیرے
بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ
دل پر اللہ کے حکم سے سچ بتاتا اس کلام کو جو اس کے آگے ہے اور راہ دکھاتا اور خوشی
لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ
سناتا ایمان والوں کو جو کوئی ہوگا دشمن اللہ کا اور اسکے فرشتوں کا اور اسکے رسولوں
وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ﴿٩٨﴾
کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔

شناعت بستم (۲۰)

قال تعالیٰ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ ... الی ... فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ۔

ان آیات میں یہود کے نہ ایمان لانے کے لیے ایک خاص بہانہ کو ذکر کر کے اس کا رد فرماتے ہیں ۔ وہ یہ کہ ہم قرآن پر اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ اسکو جبریل لیکر آتے ہیں اور وہ ہمارے دشمن ہیں وہی ہم پر ہمیشہ اللہ کا عذاب لیکر آتے ہیں اس لیے ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔ البتہ میکائیل ہمارے دوست ہیں جو رحمت اور بارش کے فرشتہ ہیں وہ اگر وحی لیکر آتے تو ہم مان لیتے اس پر اللہ تعالے نے فرمایا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اگر یہودی یہ کہیں کہ ہم قرآن کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ جبریل کے واسطہ سے نازل ہوا ہے اور جبریل ہمارے دشمن ہیں۔ اور محمد رسول اللہ کو ہمارے پوشیدہ اسرار سے مطلع کرتے ہیں اور اس سے پہلے بھی جس قدر بلائیں اور مصیبتیں اور احکام شاقہ نازل ہوئے وہ سب جبریل ہی لیکر آئے اس لیے ہم قرآن کو نہیں مانتے بخلاف توریت کے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو بلا واسطہ عنایت ہوئی۔ تو آپ انکے جواب میں یہ کہدیجیئے کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہو وہ درحقیقت اللہ کا دشمن ہے اس لیے کہ جبریل نے اس قرآن کو آپکے قلب پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے جس میں جبریل کا کوئی دخل اور اختیار نہیں وہ تو محض سفیر یعنی ایلچی ہیں تم تو اس پر نظر کرو کہ نازل کرنیوالا کون ہے۔ حق جل شانہ اگر بجائے جبریل کے یہ کام میکائیل کے سپرد فرماتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

ع۔ او بجز نائی و ماجز نی نیم

نیز اس قرآن کے اوصاف پر نظر ڈالو کہ وہ کیسا ہے سو اس میں تین صفتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ تمام پچھلی کتابوں کا تصدیق کرنے والا ہے لہٰذا قرآن کریم کی تصدیق تمام کتب الٰہیہ کی تصدیق ہے اور اس کی تکذیب تمام کتب الٰہیہ کی تکذیب ہے۔ دوم یہ کہ وہ خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بتلاتی ہے اور سیدھا راستہ تو اگر دشمن بھی بتلائے تو اسے فوراً قبول کرنا چاہیئے۔ سوم یہ کہ یہ کتاب اہل ایمان کے لیے جو خداوند ذوالجلال کے لقاء کے مشتاق اور متمنی ہیں۔ ایک عظیم بشارت ہے۔ پس اب تم ہی بتلاؤ کہ جو فرشتہ تمہارے لیے خداوند ذوالجلال کی طرف سے ہدایت کے الوان نعمت کا خوان لیکر آیا ہو اور پھر محبین اور مشتاقین کے لیے ساتھ ساتھ خوشخبری بھی لیکر آیا ہو وہ کمال محبت اور غایت الفت کا مستحق ہے یا دشمنی اور عداوت کا۔ افسوس ان لوگوں نے نہ اللہ کے پیغام ہدایت کو قبول کیا اور نہ بشارت میں داخل ہوتے یہ نہ سمجھا کہ اللہ کے فضل کو لیکر آنے والے سے دشمنی کرنا اللہ سے دشمنی کرنا ہے اور جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور اس کے فرشتوں اور پیغمبروں کا اور خاص کر جبریل اور میکائیل کا تو اس کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالے تمام کافروں کا دشمن ہے لہٰذا جو شخص جبریل کا دشمن ہوگا وہ خدا اور اُس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کا دوست کیسے ہو سکتا ہے۔ سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ جو شخص بھی ان میں سے کسی سے عداوت رکھے وہ کافر ہے اور اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے دوستوں سے دشمنی کرنا اللہ سے لڑائی مول لینا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب یہودیوں نے یہ کہا کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں اور میکائیل ہمارے

دوست ہیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے یہ سوال کیا کہ یہ بتلاؤ کہ جبریلؑ اور میکائیل کو بارگاہ خداوندی میں کیا مرتبہ اور کس درجہ کا قرب حاصل ہے۔ یہود نے کہا کہ جبرئیل اللہ کے دائیں جانب ہیں اور میکائیل بائیں جانب حضرت عمرؓ نے فرمایا پس خدا کی قسم یہ ناممکن ہے کہ جبریل۔ میکائیل کے دشمن ہوں۔ اور یہ بھی ناممکن ہے کہ میکائیل۔ جبرئیل کے دشمنوں سے دوستی اور صلح کریں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب ان دونوں کو خدا سے یہ قرب ہے تو یہ ناممکن ہے کہ یہ دونوں آپس میں دشمن ہوں۔ (کذا فی الدر المنثور ص ۹۰ ج ۱)

نکتہ کسی کلام کے نازل ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کلام اوّل کان پر پہنچے اور پھر کان سے دل تک پہنچے یہ طریقہ عام اور متعارف ہے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ اوّل دل پر اُترے اور لفظ اور معنی سب سے پہلے دل میں اتریں اور پھر دل سے کان اور زبان پر پہنچیں۔ یہ طریقہ اہل اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن کریم کا نزول نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر اسی طریق پر ہوتا تھا اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے یاد کرنے اور بار بار پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی تھی بلکہ ایک ہی مرتبہ سُنکر آپ کو یاد ہو جاتا تھا۔ اس لیے فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ فرمایا۔ بخلاف امت کے کہ انکو قرآن معروف اور معتاد طریقے سے پہنچا ہے کہ اوّل کانوں سے سنا پھر دلوں تک پہنچا۔

نیز نزول وحی کی حالت میں حواس ظاہری بالکل معطل ہو جاتے ہیں اور بیخودی طاری ہو جانے کی وجہ سے حواس ظاہری اپنا کام نہیں کرتے اس لیے ایسی حالت میں الفاظ وحی کا تمام تر ورود اور نزول قلب ہی پر ہوتا ہے جس طرح انسان خواب میں الفاظ بھی سنتا ہے مگر ان الفاظ کا اصل مدرک قلب ہی ہوتا ہے اس لیے کہ خواب کی حالت میں حواس ظاہری انکے معطل ہو جاتے ہیں یا قلب پر نازل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن آپکے قلب میں ایسا محفوظ ہو جاتا ہے کہ پھر آپ اس کو بھولتے نہیں اور نہ آپ کو اس کی مراد اور معنی میں کوئی اشتباہ لاحق ہوتا ہے۔

○

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا

اور ہم نے اتاریں تیری طرف آیتیں واضح اور منکر نہ ہونگے ان سے مگر

الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ

وہی جو بے حکم ہیں کیا اور جس بار باندھیں گے ایک اقرار پھینک دے گی اسکو ایک جماعت

مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ

ان میں سے بلکہ وہ اکثر یقین نہیں کرتے اور جب پہنچا ان کو

رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

رسول اللہ کی طرف سے سچ بتاتا ان پاس والی کو پھینک دی

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ

ایک جماعت نے کتاب پانے والوں میں کتاب اللہ کی اپنی پیٹھ

ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا

کے پیچھے گویا کہ ان کو معلوم نہیں اور پیچھے لگے ہیں اس علم کے

الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

جو پڑھتے تھے شیطان سلطنت میں سلیمان کی اور کفر نہیں کیا سلیمان نے

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ

لیکن شیطانوں نے کفر کیا لوگوں کو سکھاتے سحر

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ

اور اس علم کو جو اترا دو فرشتوں پر بابل میں ہاروت اور ماروت پر

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ

اور وہ نہ سکھاتے کسی کو جب تک نہ کہتے کہ ہم تو ہیں آزمانے کو

فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ

سو تو مت کافر ہو پھر ان سے سیکھتے جس چیز سے جدائی ڈالتے

الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ

مرد میں اور اسکی عورت میں اور وہ اس سے بگاڑ نہیں سکتے کسی کا

إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنفَعُهُمۡۚ
بغیر اذن اللہ کے اور سیکھتے ہیں جس سے انکو نقصان ہے اور نفع نہیں
وَلَقَدۡ عَلِمُواْ لَمَنِ ٱشۡتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنۡ
اور جان چکے ہیں کہ جو کوئی اس کا خریدار ہو اس کو آخرت میں نہیں کچھ
خَلَٰقٖۚ وَلَبِئۡسَ مَا شَرَوۡاْ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمۡۚ لَوۡ كَانُواْ
حصّہ اور بہت بری چیز ہے جس پر بیچا اپنی جانوں کو اگر ان کو
يَعۡلَمُونَ ١٠٢ وَلَوۡ أَنَّهُمۡ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوۡاْ لَمَثُوبَةٞ مِّنۡ
سمجھ ہوتی اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیز رکھتے تو بدلا تھا
عِندِ ٱللَّهِ خَيۡرٞۚ لَّوۡ كَانُواْ يَعۡلَمُونَ ١٠٣ ع
اللہ کے ہاں سے بہتر اگر ان کو سمجھ ہوتی

شناعت بست و یکم (۲۱)

قال تعالیٰ وَلَقَدۡ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ءَايَٰتٍ۔۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ لَوۡ كَانُواْ يَعۡلَمُونَ٥

اور آپکی نبوت فقط قرآن پر موقوف نہیں کہ جسکے متعلق یہ بہانہ کر دیا کہ قرآن تو جبریل لیکر آئے ہیں جو ہمارے دشمن ہیں بلکہ البتہ تحقیق ہم نے آپکی نبوت و رسالت کے ثابت کرنے کیلیے نہایت واضح اور روشن دلائل نازل کیے جن میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس نہیں اور نہ ان میں جبریل کا توسط ہے پس اگر قرآن کو دلیل نبوت نہیں سمجھتے کہ جبرئیل سے دشمنی ہے تو ان آیات بینات کا تمہارے پاس کیا جواب ہے جن میں جبریل امین کا واسطہ نہیں اور انکو خود بھی معلوم ہے مگر عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ ابن صوریا یہودی نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم اپنی نبوت و رسالت کی کوئی ایسی نشانی نہیں لائے جسے ہم بھی پہچانیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم) اور مطلب یہ ہے کہ آپکی نبوت کی ایک نشانی نہیں بلکہ صدہا نشانیاں موجود ہیں اور ان آیات بینات کا نہیں انکار کرتے مگر وہ لوگ جو حد ہی سے گزر گئے

ہیں اور مقتضائے عقل ونقل دونوں ہی کو خیر باد کہہ چکے ہیں کیا یہ لوگ اپنے فسق کے منکر ہیں حالانکہ ان کی عادت مستمرہ یہ رہی ہے کہ جب کبھی ان لوگوں نے کوئی عہد و پیمان کیا ہے تو ایک فریق نے تو اس کو بالکل پس پشت ہی ڈال دیا ہے حالانکہ نقض عہد عقلاً وشرعاً ہر طرح قبیح اور مذموم ہے اور فقط بدعہدی ہی نہیں بلکہ اکثر تو ان میں سے توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے اور توریت میں جو حضور پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا اس کو واجب العمل نہیں سمجھتے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ بدعہدی تو ادنیٰ درجہ کی چیز ہے بہت سے تو توریت ہی پر ایمان نہیں رکھتے اور جب توریت ہی کو واجب الایمان اور واجب العمل نہیں سمجھتے تو بدعہدی کرنے کو وہ کیا گناہ سمجھیں گے۔ اب آئندہ آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں اور جب انکے پاس ایک عظیم الشان رسول آیا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو وہ پہچانتے تھے کہ یہ رسول اللہ کی طرف سے ہے انبیاء سابقین کی بشارتیں اور اس رسول کے معجزات اس کے صدق پر شاہد تھے اور پھر اسکے علاوہ وہ پیغمبر اس کتاب کی تصدیق بھی کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے مثلاً توریت اور زبور جس میں نبی آخر الزمان کی خبر دی گئی ہے مگر باوجود اسکے اہل کتاب کے ایک فریق نے کتاب اللہ یعنی توریت کو پس پشت ڈالا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اللہ کی کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے اور یا یہ معنی ہیں کہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے غرض یہ کہ یہود نے اللہ کی کتاب کو تو پس پشت ڈال دیا جس کی انبیاء کرام تلاوت کرتے تھے اور اُن منتروں کے پیچھے ہو لیے جن کی شیاطین الانس والجن حضرت سلیمان کے دور حکومت میں تلاوت کیا کرتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت چونکہ عام تھی جن اور انس چرند اور پرند سب ان کے زیر حکم تھے اس لیے شیاطین اور جنات اور آدمی سب ملے جلے رہتے تھے۔ شیطانوں نے آدمیوں کو جادو سکھا رکھا تھا اور معاذ اللہ یہ سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ہرگز ہرگز نہ تھا اس لیے کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی کسی قسم کا کفر نہیں کیا نہ عملی اور نہ اعتقادی اور نہ قبل النبوۃ اور نہ بعد النبوۃ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے پیغمبر تھے کفر کے مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے سحر کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرنا سراسر افتراء ہے۔ یہود چونکہ سحر کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے تھے اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ان کی براءت ظاہر فرمادی لیکن شیاطین نے از خود یہ کفر کا کام کیا کہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دینے لگے۔ یہود یہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے نبی نہ تھے بلکہ ساحر اور جادوگر تھے۔ اس کے زور سے جنات اور آدمیوں اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اللہ تعالےٰ نے اسکا رد فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی یہ کام نہیں کیا اس لیے کہ نبیؑ معصوم ہوتا ہے اس سے کفر کا صادر ہونا ناممکن ہے نبیؑ تو کفر اور شرک کے مٹانے کے لیے آتا ہے نہ کہ کرنیکے لیے اور علاوہ ازیں یہود اُس سحر کا بھی اتباع اور پیروی کرتے تھے جو کہ شہر بابل میں دو فرشتوں پر ایک خاص حکمت کی بناء پر نازل کیا گیا تھا جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا وہ حکمت یہ تھی کہ لوگ سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق معلوم کریں تاکہ پیغمبر اور جادوگر میں کوئی التباس اور اشتباہ نہ ہو کیوں کہ

ظاہراً معجزہ کی طرح سحر بھی خارق عادت ہے اس لیے حق تعالیٰ نے دو فرشتے بصورت انسان بابل میں اتار دیے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت سمجھائیں تاکہ لوگوں کو سحر اور معجزہ میں کوئی اشتباہ پیش نہ آئے اور چونکہ مقصود یہ تھا۔ اس لیے یہ دونوں فرشتے کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ جز ایں نیست کہ ہم تو مخلوق کے لیے فتنہ اور آزمائش ہیں کہ کون سحر سیکھ کر کفر اور معصیت میں مبتلا ہوتا ہے اور کون اس کی حقیقت اور قباحت کو معلوم کر کے اُس سے احتیاط اور پرہیز کرتا ہے سو دیکھو اس کو سیکھ کر کفر کا کام نہ کرنا یعنی سحر نہ کرنا اس سے ایمان جاتا رہے گا لیکن اس کے بعد بھی بعض لوگ ان سے وہ باتیں سیکھتے جن سے میاں اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالتے اور یہ سمجھتے کہ یہ چیزیں بدون اللہ کی مشیت کے ضرر پہنچاتی ہیں اور یہ امر یقینی ہے کہ یہ جادوگر اس سحر کے ذریعہ سے کسی کو بھی بغیر اللہ کی مشیت اور ارادہ کے ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے سحر میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے ۔ اور جب چاہتا ہے تو اعمال کی تاثیر کو بند کر دیتا ہے اور سحر کو بے اثر بنا دیتا ہے اور اگر بالفرض والتقدیر سحر میں کوئی کفر اور شرک بھی نہ ہوتا تب بھی عقل کا مقتضیٰ یہی تھا کہ سحر سے احتراز کرتے کیونکہ یہ ایسے علم کو سیکھ رہے ہیں جو دنیا اور آخرت میں ان کے لیے ضرر رساں ہے اور اگر بالفرض مضر نہ ہو تو نافع بھی نہیں اور عاقل کا کام یہ ہے کہ جو چیز نقصان دے اور نفع نہ دے اس سے احتراز کرے اور انکا سحر میں یہ اشتغال اور انہماک لاعلمی اور نادانی کی بنا پر نہیں کہ اس کے ضرر سے بیخبر ہوں۔ البتہ خدا کی قسم انکو خوب معلوم ہے کہ جو کفریات کو خریدے گا اس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا البتہ بہت ہی بُری ہے وہ چیز جسکے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کر ڈالا کاش اس بات کو جانتے کہ ہم سعادت ابدیہ کو فروخت کر کے شقاوت ابدیہ کو خرید رہے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہود نے اپنے دین اور کتاب کے علم کو تو پس پشت ڈال دیا اور علم سحر کے پیچھے ہو لیے اور سحر کا علم لوگوں میں دو طرف سے پھیلا ایک تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں چونکہ جنات اور انسان آپس میں ملے جُلے رہتے تھے اس لیے آدمیوں نے جنات اور شیاطین سے سحر سیکھا اور حضرت سلیمان کی طرف نسبت کر دیا کہ یہ سحر ہمکو انہی سے پہنچا اور اسی کے زور سے حضرت سلیمان جنات اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے سلیمان نے کبھی نہیں کیا۔ اُن کے زمانہ میں شیطانوں نے آدمیوں کو سکھایا ہے۔ دوسرے ہاروت اور ماروت کی طرف سے پھیلا کہ وہ دو فرشتے تھے۔ انسان کی شکل میں شہر بابل میں رہتے تھے اُن کو علم سحر معلوم تھا جو کوئی ان سے جادو سیکھنا چاہتا وہ پہلے ہی اُس سے کہہ دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا لیکن جب وہ اصرار کرتا تو سکھا دیتے اور صاف کہہ دیتے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے ایسے علم سے آخرت میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ دنیا اور آخرت دونوں ہی میں نقصان ہے بغیر اللہ کے حکم کے کچھ نہیں کر سکتے اگر علم دین سیکھتے تو اللہ کے یہاں ثواب پاتے اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے ان پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا جیساکہ آئندہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور بجائے سحر کے اللہ کی کتاب کا اتباع کرتے اور علم سحر اور کتب سحر اور مضر اور بے فائدہ

علوم سے پرہیز کرتے جیسے اس زمانہ میں ناول اور باتصویر رسالے جو تخریب اخلاق میں جادو کا اثر رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو بدلا ملے اگرچہ وہ تھوڑا ہو دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے چہ جائیکہ سحر میں بطور مزدوری برائے نام کچھ مل جائے کاش انکو اتنی عقل ہوتی تو سمجھتے کہ دنیا کے تمام منافع آخرت کے ایک نفع کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

فائدہ شیاطین جس سحر کی تعلیم دیتے تھے وہ صریح کفر اور شرک تھی۔ ارواح کو خدا تعالیٰ کے برابر جانتے تھے اور ان کے لیے وہ افعال اور تاثیرات ثابت کرتے تھے جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کی مدح میں ایسے منتر پڑھتے تھے کہ جیسے خدا تعالیٰ کی عموم علم اور احاطۂ قدرت اور غایت عظمت وجلال ظاہر کرنے کے لیے حمد وثنا کے کلمات پڑھے جاتے ہیں اور فرشتوں کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی۔ نہایت احتیاط کے ساتھ تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ساتھ نصیحت کرتے تھے اور کفر کرنے سے منع کرتے تھے انکا مقصد حقیقت سحر کو واضح کرنا تھا تاکہ نبی اور متنبّی میں اشتباہ نہ ہو اور سحر اور معجزہ کا فرق معلوم ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مؤثر حقیقی سوائے باری تعالیٰ کے کوئی نہیں اور شیاطین کا مقصد اغوا اور اضلال تھا۔

قصۂ ہاروت وماروت

تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر اور در منثور میں عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمر اور مجاہد اور قتادہ وغیرہم سے منقول ہے کہ جب ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں اولاد آدم کے بُرے اعمال کے دفتر کے دفتر آسمان پر جانے لگے تو فرشتوں نے بنی آدم کے حق میں تحقیر اور طعن آمیز کلمات کہے کہ یہ کیسے بندے ہیں کہ اپنے مالک حقیقی کی نافرمانی کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا میں نے بنی آدم کے خمیر میں غصہ اور شہوت رکھا ہے اس لیے ان سے گناہ ہوتے ہیں۔ اگر تم میں بھی قوت شہویہ اور قوت غضبیہ رکھدوں اور زمین پر اتار دوں تو تم بھی ایسے ہی گناہوں میں مبتلا ہو گے۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار ہم ہرگز تیرے گناہ کے پاس بھی نہ جائیں گے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو شخصوں کو منتخب کرلو۔ فرشتوں نے ہاروت اور ماروت کو جو فرشتوں میں کمال عبادت میں مشہور اور ممتاز تھے منتخب کیا۔ حق تعالیٰ نے قوت شہویہ اور غضبیہ کو اُن میں پیدا کر کے حکم دیا کہ زمین پر جاؤ اور لوگوں کے مقدمات کا عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔ اور شرک اور خون ناحق اور زنا اور شراب سے پرہیز کرنا حسب ارشاد خداوندی دونوں فرشتے آسمان سے زمین پر اترے صبح سے لیکر شام تک قضا کے کام میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے ایک مہینہ اسی حالت میں گزرا یکایک امتحان خداوندی پیش آیا کہ ایک عورت مسماۃ زُہرہ جو حسن وجمال میں شہرۂ آفاق تھی اسکا مقدمہ ان کے اجلاس میں پیش ہوا۔ یہ دونوں فرشتے اس عورت کے حسن وجمال کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئے اور اس کو پھسلانا شروع کیا۔ اس عورت نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک تم بت پرستی اختیار نہ کرو اور میرے خاوند کو قتل نہ کرو اور شراب نہ پیؤ میں تمہارے

پاس نہیں آسکتی آپس میں دونوں نے مشورہ کیا کہ شرک اور قتلِ ناحق تو بہت بڑے گناہ ہیں اور شراب پینا اس درجہ کی معصیت نہیں اس لیے اس کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ غرض یہ کہ اس عورت نے پہلے اُن کو شراب پلائی اور پھر بت کو سجدہ کرایا اور پھر شوہر کو قتل کرایا اور ان سے اسم اعظم سیکھا اور پھر ان کے ساتھ ہم بستر ہوئی بعد ازاں وہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور اس کی روح زہرہ ستارہ کی روح کے ساتھ جا ملی اور اس کی صورت زہرہ کی صورت ہوگئی اور وہ فرشتے اسم اعظم بھول گئے۔ اس لیے آسمان پر نہ جا سکے جب ہوش میں آئے نہایت نادم ہوئے اور ادریس علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا اور استغفار کی درخواست کی۔ اور بارگاہ خداوندی میں شفاعت کے خواستگار ہوئے۔ بارگاہ الٰہی سے یہ حکم آیا کہ عذاب تو تم کو ضرور ہوگا لیکن اس قدر تخفیف کی جاتی ہے کہ تم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ دنیوی اور اخروی عذاب سے جس کو چاہو اختیار کر لو۔ فرشتوں نے دنیاوی عذاب کو سہل اور آسان سمجھا کہ یہاں کا عذاب تو عنقریب منقطع ہو جائے گا اس لیے اس کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ وہ اللہ کے حکم سے بابل کے کنویں میں الٹے لٹکا دیئے گئے اور وہیں ان کو آگ سے عذاب دیا جا رہا ہے۔ پھر جو کوئی ان کے پاس جادو سیکھنے جاتا ہے وہ اوّل تو اس کو سمجھا دیتے ہیں اور جب اصرار کرتا ہے تو اس کو سکھا دیتے ہیں۔ (قصّہ ختم ہوا)

تحقیق ہاروت وماروت کا جو قصہ نقل کیا گیا اس میں علماء کے دو فریق ہیں ایک فریق یہ کہتا ہے کہ یہ قصہ سرتاپا موضوع ہے اور یہود کا من گھڑت قصّہ ہے اور انہی کی کتابوں سے ماخوذ ہے حضرات محدثین اس قصّہ کو باعتبار روایت کے غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور حضرات متکلمین باعتبار درایت کے اس کو غیر معتبر کہتے ہیں۔ قاضی عیاض اور امام رازی نے اس قصہ کا شد و مد سے انکار کیا ہے اس لیے کہ یہ قصہ اُصول دین کے خلاف ہے۔

(۱) اول یہ کہ فرشتے معصوم ہیں اُن سے گناہ کا صدور عصمت کے منافی ہے۔

(۲) دوم یہ کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہیں تو ان کو فرصت کہاں سے ملی کہ لوگوں کو جادو سکھلائیں نیز تعلیم و تعلم کے لیے اختلاط شرط ہے جو محبوس ہونے کی وجہ سے مفقود ہے۔ ان کو لوگوں سے اختلاط کیسے میسر ہوا۔

(۳) سوم یہ کہ ایک فاحشہ اور بدکار عورت کا دھوکہ سے اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چڑھ جانا سراسر غیر معقول ہے۔ اسماء الٰہی کے لیے تقویٰ اور طہارت شرط ہے۔

(۴) چہارم یہ کہ مسخ اور تبدیل صورت عقوبت کے لیے ہوتا ہے اور عقوبت کے لیے تحقیر اور اہانت لازم ہے اور آسمان پر پہنچ کر ستارہ بن جانے میں نہ کوئی عقوبت ہے اور نہ کوئی تحقیر اور اہانت ہے

(۵) پنجم یہ کہ زہرہ تو ایک مشہور ستارہ ہے جو ابتداء آفرینش عالم سے موجود ہے اور اس قصّہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کو مسخ کر کے زہرہ ستارہ بنا دیا گیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ستارہ اس واقعہ کے بعد وجود میں آیا اور اس واقعہ سے پہلے یہ ستارہ موجود نہ تھا اور یہ سراسر غیر معقول ہے ان وجوہ

کی بنا پر ان علماء نے اس قصّہ کا انکار کیا لیکن جلال الدین سیوطی اور ملا علی قاری وغیرہم فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں روایات مرفوعہ اور آثار صحابہ باسانید صحیحہ کے ساتھ اس قدر کثرت سے آئے ہیں کہ جن کا انکار ناممکن ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصّہ بے اصل نہیں۔ انتہی۔ لہٰذا اس قصّہ کی صحت اور عدم صحت کے بارہ میں توقف اور سکوت مناسب ہے اور جن حضرات مفسرین نے اس قصّہ کو ذکر کیا ہے ان پر تشنیع اور نازیبا کلمات سے انکا ذکر کرنا سراسر خلاف ادب ہے بہت سے اکابر محدثین اور مفسرین نے بغرض تحقیق و تنقیح اپنی کتابوں میں رطب و یابس کو جمع کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ اس قصّہ کے بارہ میں جس قدر روایتیں آئی ہیں اگر تتبع کر کے ان تمام روایات کو جمع کیا جائے تو اُن کا قدر مشترک حد تواتر کو پہنچ جاتا ہے اگرچہ واقعہ کی خصوصیات میں اختلاف ہو لیکن جو قدر مشترک حد تواتر کو پہنچ چکا ہے اس کا انکار دشوار ہے انفرادی طور پر اگرچہ ہر طریق اور ہر سند ضعیف اور واہی ہو لیکن ضعیف روایتوں کا تواتر بھی ترجیح صدق کا موجب ہوتا ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ بجائے انکار اور تکذیب کے قصّہ کی کوئی مناسب توجیہ کی جائے جس سے اصول دین کی مخالفت باقی نہ رہے۔

(۱) وہ توجیہ یہ ہے کہ فرشتوں کی عظمت اس وقت تک ہے جب تک فرشتے اپنی اصلی حالت اور اصلی حقیقت پر رہیں اور جب ان میں بھی کسی حکمت اور مصلحت سے شہوت اور غضب کی کیفیت پیدا کر دی گئی تو وہ خالص فرشتے نہ رہے اس لیے اب ان کے لیے عصمت بھی لازم اور ضروری نہ ہو گی۔

(۲) نیز عذاب اور گرفتاری کی حالت میں تعلیم سحر کا جاری رہنا محال تو کیا مستبعد بھی نہیں۔ کیا جیل خانہ میں رہ کر افادہ اور استفادہ ممکن نہیں۔ ایک حاذق طبیب اگر اسکے ہوش و حواس سالم ہوں تو بیماری کی حالت میں بھی علم طب کی تعلیم دے سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی قوت ادراکیہ انسان کی قوت ادراکیہ سے کہیں اکمل اور اتم ہے عذاب اور گرفتاری کی حالت ان کے لیے تعلیم سے مانع نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ غیب سے انکو مدد بھی پہنچتی ہو۔ کیونکہ آسمان سے اس تعلیم کے لیے اتارے گئے تھے۔ جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے کہ ہر سال اُن کے پاس ایک شیطان جاتا ہے اور تازہ سحر سیکھ کر آتا ہے اور لوگوں میں پھیلاتا ہے جس شخص کو کسی علم کا ملکہ ہوتا ہے تو وہ بیماری اور لاچاری کی حالت میں اس علم کی تعلیم دے سکتا ہے اور بسبب مزاولت اور ممارست اور بوجہ ملکۂ مہارت اس کو تعلیم و تلقین میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

(۳) نیز وہ عورت اگرچہ بدکار تھی لیکن مقصود اسکا قرب الٰہی کو حاصل کرنا تھا اپنے حسن و جمال کو اسم اعظم کے معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ خرابی جو کچھ تھی وہ ذریعہ اور وسیلہ میں تھی۔ اصل مقصد میں کوئی قبح نہ تھا حسن نیت کی برکت سے کامیاب ہوئی۔

(۴) اور جس طرح بغرض ابتلاء فرشتے بشکل بشر بنا کر آسمان سے زمین پر اتارے گئے اسی طرح ایک ستارہ کی روح ایک حسین وجمیل عورت کی شکل میں ہاروت اور ماروت کی عصمت کے امتحان کے لیے نمودار ہوئی اور امتحان ہو جانے کے بعد اصلی صورت کی طرف لوٹ گئی یعنی صورت بشریہ سے صورت کوکبیہ کی طرف واپس ہو گئی۔ جس طرح جنات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر اپنی اصلی صورت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ لہٰذا جن روایات میں اس عورت کا زہرہ ستارہ کی صورت میں مسخ ہونے کا ذکر آیا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی روح کا تعلق زہرہ کی روح کے ساتھ کر دیا گیا اور یہ مطلب نہیں کہ یہ ستارہ پہلے ہی سے موجود نہ تھا اور اب اس عورت کے مسخ ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

(۵) اور صورت کوکبیہ اگرچہ کتنی ہی شرافت اور عظمت رکھتی ہو لیکن صورت انسانیہ کے اعتبار سے بہت حقیر اور ذلیل ہے۔ کما قال تعالیٰ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔

خلاصہ کلام بعض علماء نے اس قصّہ کو اصولِ دین اور قواعدِ شریعت کے خلاف سمجھا اس لیے اسکو غیر معتبر قرار دیا اور بعض علماء نے کثرۃ طرق اور کثرۃ اسانید کی بناء پر اس قصّہ کا بالکلیہ انکار مناسب نہیں سمجھا۔ بیس سندوں سے زیادہ اس قصّہ کا مروی ہونا اس کی خبر دیتا ہے کہ اس قصّہ کی اصل ضرور ہے بالکل بے اصل نہیں روایات مختلفہ کا جو قدر مشترک تھا یہ حضرات اسکے قائل ہوئے اور خصوصیات کے بارہ میں توقف اور سکوت کیا اور جو باتیں بظاہر اصول شریعت کے خلاف معلوم ہوتی تھیں انکی مناسب توجیہ اور تاویل فرمائی اور یہ طریق نہایت اسلم اور معتدل ہے۔ روایت کا دارومدار طرق اور اسانید پر ہے اگرچہ وہ طرق اور اسانید ضعیف اور واہی کیوں نہ ہوں چند ضعفاء کے مل جانے سے بھی ایک گونہ قوت آ جاتی ہے اس لیے جو ضعیف حدیث متعدد طرق سے مروی ہو اصطلاح محدثین میں اسکو حسن لغیرہ کہتے ہیں۔ لہٰذا کسی ضعیف روایت کے کثرت طرق اور کثرت اسانید سے یک لخت قطع نظر کر لینا اور اپنی مزعوم درایت کی بناء پر اس روایت کا بالکلیہ انکار کر دینا خود خلاف درایت ہے یہ کیا ضروری ہے کہ جو چیز آپ کے نزدیک خلاف درایت ہے وہ دوسرے عالم کے نزدیک بھی خلاف درایت ہو ممکن ہے کہ آپ کی درایت نے غلطی کی ہو۔ فَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ فَهْمٍ فَهِیْمٌ اور محض اسرائیلیات میں سے ہونا بھی تکذیب اور انکار کا سبب نہیں بن سکتا الایہ کہ نصوص کتاب وسنت اور قواعد شریعت اور اجماع امت کے خلاف ہو۔ حدیث میں ہے حَدِّثوا عن بنی اسرائیل وَلا حرج (اسرائیلی باتوں کے نقل میں کوئی حرج نہیں)۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ قصّہ قطعاً صحیح ہے اور نہ ناظرین بھی اس کو صحیح مانیں میرا مطلب فقط اس قدر ہے کہ بیدھڑک ہو کر روایات کا انکار نہ کریں باقی رہی آیات کی تفسیر تو وہ اس قصّہ کے صحیح ہونے پر موقوف نہیں جیسا کہ ناظرین نے تفسیر کو پڑھ کر دیکھ لیا ہو گا۔

ایک شبہ اور اسکا ازالہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ایک وعظ میں فرماتے ہیں کہ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ سحر تو حرام اور کفر ہے باقی اسکا جاننا اور بضرورت شرعی اسکا سیکھنا خصوصاً جبکہ اس پر عمل کرنے کی مخالفت بھی ساتھ ساتھ ہو تو حرام نہیں جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے مگر اس کی خاصیت معلوم کرنا اور اس کو بیان کرنا حرام نہیں۔ فقہار نے کلمات کفر یہ کے لیے ایک مستقل باب رکھا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کن باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے فلسفہ کے بہت سے مسائل کفر ہیں لیکن اس کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ اسکی حقیقت معلوم کر کے اس کا جواب دیا جا سکے۔

ایک اور اشکال اور اس کا جواب رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کے لیے فرشتے کیوں نازل کیے گئے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی سے یہ کام کیوں نہ لے لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیار علیہم الصلوٰۃ والسلام ہدایت محضہ کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ انکی تعلیم سحر میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان سے سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول اور مبتلا ہو جائے تو اس طرح حضرات انبیار علیہم الصلوٰۃ والسلام گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو اُن کی شانِ ہدایت محضہ کے منافی ہے اس لیے حق تعالیٰ نے انکو ضلالت کا سبب بعید بھی بنانا گوارا نہیں فرمایا بخلاف فرشتوں کے کہ اُن سے تشریع اور تکوین دونوں قسم کے کام لیے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں اسی طرح وہ کافروں کی بھی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں حالانکہ ہمارے لیے شرعاً کافر کی اعانت اور امداد ناجائز ہے انبیار کرام کے تشریعی نظام سپرد ہوتا ہے اور ملائکہ کے تکوینی نظام سپرد ہوتا ہے اس لیے تعلیم سحر کی خدمت ملائکہ کے سپرد ہوئی کہ اگر وہ اس میں ضلالت کا سبب بن جائیں تو ان کی شان کے خلاف نہ ہو گا۔ اور حضراتِ انبیار کے لیے گمراہی کا سبب بعید بننا بھی خلافِ شان ہے۔ کذا فی تعمیم التعلیم ص ۵۱ نمبر ۱۳۔ از تبلیغ۔

جس طرح حضرات انبیار کرام نے یہ بتلایا کہ رشوت حرام ہے مگر رشوت کی حقیقت نہیں بتلائی اسی طرح حضرات انبیار نے یہ تو بتلا دیا کہ سحر حرام ہے مگر سحر کی حقیقت نہیں بتلائی۔

فائدہ معلوم نہیں کہ بحالت عذاب وہ خود لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے ہیں یا جنات اور شیاطین کے واسطہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا ہے واللہ اعلم (روح المعانی)

يَا يُّهَا	الَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا	لَا تَقُوْلُوْا	رَاعِنَا	وَ	قُوْلُوْا
اے	ایمان	والو	تم نہ کہو	راعنا	اور	کہو

اُنْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

انظرنا اور سنتے رہو اور منکروں کو دکھ کی مار ہے

شناعت بست و دوم (۲۲)

متضمن بتلقین احباب بآداب خطاب

قال تعالیٰ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ..... الیٰ ..... وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(ربط) گزشتہ آیات میں یہود کے اتباعِ سحر کا ذکر تھا آئندہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سحر کا اتباع یہودیوں کی طبیعتوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہوگیا ہے کہ اُن کی گفتگو اور مخاطبت بھی سحر کے اثر سے خالی نہیں۔ جس طرح سحر ایک ملمع سازی اور حقیقت کی پردہ پوشی ہے اسیطرح انکا کلام بھی سحر لسانی ہوتا ہے صورت اسکی تعظیم و تکریم ہے اور حقیقت اسکی اہانت اور تحقیر ہے۔ بظاہر عظمت کی ملمع کاری کرکے بات کرتے ہیں، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہوتے تو رَاعِنَا سے خطاب کرتے جسکے ظاہری معنی نہایت عمدہ ہیں کہ آپ ہماری رعایت کیجئے اور ہمارے حال پر توجہ فرمائیے۔ لیکن جن معنی کا وہ ارادہ کرتے وہ نہایت فاسد اور گندہ ہیں۔ یہود یہ لفظ بول کر احمق یا چرواہے کے معنی مراد لیتے۔ بہت سے مسلمانوں کو ان فاسد معنیٰ کا علم نہ تھا انہوں نے یہ سمجھ کر کہ علماء اہل کتاب حضرات انبیاء کے آداب سے بخوبی واقف ہیں جب علماء یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ کلمہ تعظیم ہے اس لیے مسلمانوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تلبیس اور دھوکہ سے بچو اگرچہ تمہارا ارادہ دھوکہ کا نہ ہو تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کے وقت رَاعِنَا کا لفظ نہ کہو جس میں فاسد معنی کا ایہام ہے بلکہ اس کے بجائے لفظ انْظُرْنَا کہو یعنی ہم پر نظر عنایت فرمائیے اور ہم پر شفقت اور توجہ فرمائیے اور آپ جو ارشاد فرمائیں اسکو نہایت غور سے سنو کر دوبارہ سوال اور ایسے مُوہم الفاظ کے استعمال کی نوبت ہی نہ آتے اور کافروں کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے کہ جو اس قسم کے الفاظ سے رسول اور اہل ایمان کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور رسول کی ایذاء اور تحقیر بلاشبہ کفر ہے۔

ف (۱) قرآن کریم میں اٹھاسی جگہ اس امت کے مسلمانوں کو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ سے خطاب کیا گیا ہے ان میں سے یہ پہلا موقعہ ہے کتب سابقہ میں صرف انبیاء کو خطاب ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ شرف عطاء فرمایا کہ قرآن کریم میں براہِ راست اس امت کو مخاطب بنایا۔ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعودؓ سے درخواست کی کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے فرمایا کہ جب تو قرآن

پڑھے اور یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب کو سنے تو فوراً اپنے کانوں کو اسکی طرف متوجہ کرنا اور قلب کو حاضر کرنا کہ اللہ تعالیٰ بلا واسطہ تجھ سے خطاب فرما رہا ہے اور کسی اچھی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی بُری چیز سے منع کرتا ہے (رواہ عبداللہ بن احمد فی زوائد المسند والبیہقی فی شعب الایمان)

ف (۲) جس لفظ کے استعمال سے فاسد معنیٰ کا ایہام ہوتا ہو اسکا استعمال نہ کرنا چاہیئے اگرچہ متکلم کی نیت صحیح ہو۔

ف (۳) نبی کی اشارۃً اور کنایۃً تحقیر بھی کفر ہے اس لیے کہ یہود صراحۃً آپ کی تحقیر نہیں کرتے تھے۔ رَاعِنَا کہہ کر اشارۃً اور کنایۃً آپکی تحقیر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کو کافر فرمایا۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا

دل نہیں چاہتا ان لوگوں کا جو منکر ہیں کتاب والوں میں اور

الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

شرک والوں میں یہ کہ اترے تم پر کچھ نیک بات تمہارے رب سے

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی مہر سے جس کو چاہے اور اللہ

ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

بڑا فضل رکھتا ہے۔

شناعت بست وسوم (۲۳)

قال تعالیٰ۔ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ... الی ... وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

شانِ نزول مسلمانوں نے یہود سے کہا کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔ یہودیوں نے کہا کہ خُدا کی قسم ہماری تو دلی خواہش تھی کہ اگر تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ہوتا تو ضرور اس کو قبول کرتے لیکن تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ثابت نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ

نے انکی تکذیب میں یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ سب غلط ہے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تم پر حسد کرتے ہیں۔ اور کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین ذرہ برابر دل سے یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر کوئی خیر نازل کی جائے لیکن اُن کے حسد سے کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُن کا محکوم نہیں اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جسکو چاہے اپنی رحمت سے مخصوص فرمائے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت اور وحی سے سرفراز فرمایا اور اپنے فضل سے آپکو افضل الانبیاء بنایا۔ اور آپ کے دین کا تمام ادیان سے افضل اور اکمل ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔

ف اس جگہ رحمت سے مراد نبوت ہے اور فضل اس احسان اور نکوئی کو کہتے ہیں جو ابتداءً بلا وجہ ہو۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ

جو موقوف کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو پہنچاتے ہیں اس سے بہتر

اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ

یا اسکے برابر کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے

قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کو سلطنت ہے آسمانوں

وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ

اور زمین کی اور تم کو نہیں اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ

وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

مدد والا

شناعت بست وچہارم (۲۴)

قال تعالیٰ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ .... الی .... مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۔

شان نزول یہود اور مشرکین بطور طعن یہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب

کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں اور پھر اسی بات سے منع کرتے ہیں معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے کہتے ہیں۔ اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔ اس قسم کی باتوں سے کافروں کا مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ شک اور شبہ ڈالدیں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے جو ہم پر نازل ہوا وہ سب خیر ہی خیر ہے تو اس کے منسوخ ہونے کے کیا معنی۔ اگر پہلا حکم خیر تھا تو دوسرا شر ہوگا اور اگر دوسرا حکم خیر ہے تو پہلا حکم شر ہوگا اور وحی الٰہی اور حکم خداوندی کا شر ہونا ناممکن اور محال ہے اس شبہ کے ازالہ کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ نسخ کے معنی تبدیل خیر بالشر کے نہیں۔ یعنی خیر کو شر کے ساتھ بدل دینے کے نہیں تاکہ وحی الٰہی اور خیریت میں منافات لازم آئے بلکہ ناسخ اور منسوخ دونوں ہی خیر ہیں اس لیے کہ ہم جب کبھی کسی آیت کا حکم منسوخ کرتے ہیں کہ اس آیت کے حکم پر عمل نہ کیا جائے اگرچہ اس آیت کی تلاوت باقی رہے یا ہم اس آیت ہی کو ذہنوں سے بھلا دیتے ہیں کہ اس آیت کے الفاظ کو کسی حکمت اور مصلحت کی بناء پر قوت حافظہ سے فراموش کر دیں اگرچہ حکم اس آیت کا برقرار رکھیں کہ اس آیت کے ذہنوں سے نکل جانے کی وجہ سے تلاوت کی عبادت اور لذت تو حاصل نہ کر سکیں اس منسوخ التلاوۃ آیت کے حکم پر عمل کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ بہر حال ہم چاہے کسی آیت کے حکم کو منسوخ کریں یا اس آیت کو ذہنوں سے بھلائیں نسخ کے بعد اس آیت منسوخہ یا منسیہ سے کوئی بہتر چیز لاتے ہیں یا اس آیت کے مثل لاتے ہیں یعنی حکم ناسخ حکم منسوخ سے سہولت عمل یا موافقت مصلحت یا کثرۃ ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوتا ہے یا برابر۔ کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اسکو سب اختیار ہے ہر لمحہ اور ہر لحظہ تو اس کے عجائب قدرت اور غرائب مشیت کا مشاہدہ کرتا ہے جیسے مرض کا صحت سے بدلنا اور فقر کا تونگری سے بدلنا اور عزت کا ذلت سے بدلنا اور روشنی کا تاریکی سے بدلنا پس جو ذات ان تغیرات اور تبدلات پر قادر ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک حکم سے دوسرے حکم کو بدل دے اور جس طرح احکام تکوینیہ میں حسب اقتضاء مصلحت تغیر اور تبدل معاذ اللہ جہالت نہیں بلکہ عین حکمت ہے اسی طرح احکام شرعیہ میں بھی باقتضاء زمان و مکان اور باقتضاء طبع تغیر و تبدل عین حکمت اور عین مصلحت ہے اور الہامی کتابوں میں بھی احکام بدلتے رہے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو توریت کے بعد انجیل کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اس تغیر و تبدل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ پہلے ہی سے یہ سب کچھ اس کے علم میں تھا۔ البتہ اس تغیر اور تبدل سے ہمارے علم میں تغیر ہوتا ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو قصور علم کی وجہ سے اس حکم کی مدت معلوم نہ تھی اور قصور فہم کی وجہ سے اس حکم کو دائم اور مستمر سمجھ بیٹھے۔ جب حکم ناسخ نازل ہوا اس وقت اپنے قصور علم کا علم ہوا اور قصور فہم کا فہم ہوا۔ قوانین حکومت میں بھی تغیر اور تبدل ہوتا ہے لیکن وہاں کسی فرو گذاشت اور لاعلمی کی بناء پر پہلا حکم منسوخ ہوتا ہے، اور حق جل شانہ کے احکام میں تغیر و تبدل ہمیشہ حکمت و مصلحت کی بناء پر ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کا علم غلطی سے پاک ہے۔

لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔

مریض کے حالات بدلنے کی وجہ سے طبیب دوا بدلتا رہتا ہے یہ طبیب کی جہالت نہیں بلکہ دلیل حذاقت ہے کہ ہر وقت کی مصلحت اسکی پیش نظر ہے، اور اس قدرت کے علاوہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمینوں کی اور حکومت اور بادشاہت کے لوازم میں سے ہے کہ احکام میں تغیر اور تبدل ہو لہٰذا جس وقت جو حکم دے اسکی تعمیل فرض اور لازم ہے اور اگر اسکے حکم اور فرمان کی تعمیل میں تامل کرو اور یہ کہو کہ ہم تو پہلے ہی حکم کو مانیں گے دوسرے حکم کو نہیں مانیں گے تو سمجھ لو کہ تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں کہ جو تمہیں اس کی گرفت اور باز پرس سے بچا سکے۔

فائدۂ اولیٰ لغت میں نسخ کے دو معنی آتے ہیں ایک نقل اور تحویل جیسے نسخ الکتاب (یعنی کتاب نقل کی)۔ دوسرے معنی رفع اور ازالہ کے جیسے نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ (آفتاب نے سایہ کو زائل کر دیا)۔ آیت میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی حکم اول کو اٹھا دینا۔

فائدۂ دوم کتاب اللہ کا نسخ چند وجوہ پر آیا ہے (۱) ایک تو یہ کہ تلاوت منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا جیسے آیت رجم کہ تلاوت تو اسکی منسوخ ہو گئی اور حکم اس کا باقی ہے (۲) اور ایک یہ کہ حکم منسوخ ہو جائے اور تلاوت باقی رہے جیسے اقارب کے لیے وصیت کرنے کی آیت میراث سے اسکا حکم منسوخ ہو گیا اور تلاوت علیٰ حالہا باقی ہے اور مثلاً وہ آیت جس میں ایک سال کی عدت وفات کا حکم مذکور ہے تلاوت اور قرأت اُسکی باقی ہے مگر ایک سال کی عدت کا حکم چار مہینے اور دس روز کی آیت سے منسوخ ہو گیا (۳) اور ایک صورت یہ ہے کہ تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوں جیساکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ احزاب بقدر سورۂ بقرہ طویل تھی مگر اسکے اکثر حصہ کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو گئے۔

فائدۂ سوم نسخ کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ حکم منسوخ کی جگہ دوسرا حکم نازل کیا جائے جیسے ایک سال کی عدت منسوخ کرکے چار مہینہ اور دس دن کا حکم نازل کر دیا گیا۔ دوسری قسم یہ کہ پہلا حکم اٹھا لیا جائے اور کوئی جدید حکم اس کی جگہ نہ اتارا جائے جیسے ابتداء میں مہاجر عورتوں کے امتحان کا حکم تھا بعد میں اٹھا لیا گیا۔

فائدۂ چہارم نسخ احکام یعنی اوامر اور نواہی میں جاری ہوتا ہے، اخباری یعنی جو چیزیں خبر سے متعلق ہیں ان میں نسخ جاری نہیں ہوتا ہے اور اوامر و نواہی میں باقتضاء مصلحت تغیر و تبدل عقلاء عالم کے نزدیک مسلم ہے۔ بلکہ مصلحت کے بدلنے سے حکم کو نہ بدلنا عقلاً قبیح ہے۔

فائدۂ پنجم ناسخ کا منسوخ سے بہتر یا برابر ہونا باعتبار سہولت عمل یا باعتبار کثرت ثواب مراد ہے۔ نظم اور اعجاز کے اعتبار سے ناسخ اور منسوخ کا برابر ہونا ضروری نہیں لہذا کتاب اللہ کا حدیث سے منسوخ ہونا۔ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا (یعنی ہم اس سے بہتر حکم نازل فرماتے ہیں) کے منافی نہ ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ

کیا تم مسلمان یہی چاہتے ہو کہ سوال شروع کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے

مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ

موسیٰ سے پہلے اور جو کوئی انکار لیوے بدلے یقین کے

فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۱۰۸﴾

وہ بھولا سیدھی راہ سے

شناعت بست و پنجم (۲۵)

قال تعالیٰ۔ أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ ... الیٰ ... سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝

اے مسلمانو! کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے سوالات کیے گئے اسی طرح تم اپنے رسول سے سوالات کرو۔ بنی اسرائیل کی طرح احکام خداوندی میں قیل و قال کرو اور حجتیں نکالو! جیسے بقرہ کے قصہ میں گزرا۔ مثلاً یہ سوال کرو کہ پہلا ہی حکم برقرار رکھا جائے یا ہم اس حکم سے خوش نہیں، اور جو شخص بجائے ایمان کے کفر کو اختیار کرے وہ سیدھے راستہ سے بہک گیا۔ منزل مقصود کو کیسے پہنچ سکے گا مطلب یہ ہے کہ احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا اور اللہ کے نبی سے الجھنا اور لایعنی سوالات کرنا یا اللہ کے کسی حکم کو غیر مناسب سمجھنا یہ سب کفر کی بات ہے تمہارا فریضہ تو یہ ہے۔ ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو
نینگیختن علت از کارِ تو

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنْ

دل چاہتا ہے بہت کتاب والوں کا کسی طرح تم کو پھیر کر

بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم

مسلمان ہوئے پیچھے کافر کر دیں حسد کر کے اپنے اندر سے

مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا

بعد اس کے کہ کھل چکا ان پر حق سو تم درگزر کرو اور خیال

حَتّٰى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

میں نہ لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم اللہ ہر چیز پر قادر ہے

قَدِيرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا

اور کھڑی رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو

تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ ۗ

آگے بھیجو گے اپنے واسطے بھلائی وہ پاؤ گے اللہ کے پاس

إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۱۱۰﴾

اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے

شناعت بست و ششم (۲۶)

قال تعالیٰ۔ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ ... الی ... إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

اے مسلمانو۔ یہ یہود قرآن اور دین میں طرح طرح کے شبہے نکالتے ہیں کبھی نسخ احکام پر اعتراض کرتے ہیں اصل وجہ یہ ہے کہ اکثر اہل کتاب کی دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ کسی طرح تم کو ایمان سے پھیر کر کافر بنا دیں کہ اہل کتاب کی طرح تم بھی جدید حکم کا انکار کر دو اور اپنے نبی پر یہ اعتراض کرو کہ

کہ تم نے پہلے تو یہ حکم دیا تھا اور اب یہ دوسرا حکم اسکے خلاف کیسا؟ اور اس غرض فاسد کا کوئی محرک اور باعث تمہاری جانب سے وقوع میں نہیں آیا بلاوجہ محض حسد کی بنا پر کہ جو خود اُن کے ناپاک اور گندے نفسوں سے پیدا ہوا ہے اور پھر تعجب یہ ہے کہ اُنکی یہ کوشش اور یہ حسد کسی شک اور شبہ کی بنا پر نہیں بلکہ بعد اس کے ہے کہ حق ان کو خوب واضح ہو چکا ہے۔ کہ مسلمانوں کا دین اور اُن کی کتاب اور ان کا رسول سب سچے ہیں۔ نیز انکو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ ہر شریعت میں علیٰ اختلافِ المصالح احکام بدلتے رہتے ہیں۔ بقرہ ہی کے قصہ میں دیکھ لو کہ کتنی مرتبہ نسخ ہوا۔ تم اُن کی باتوں کا خیال مت کرو۔ یہ حسد میں مبتلا ہیں خدا کا شکر کرو کہ تم حاسد نہیں محسود ہو۔ پس تم ان حاسدوں سے معاف کرو اور درگزر کرو۔ یعنی زبان سے بھی انکو کچھ بُرا بھلا نہ کہو اور فی الحال اُن سے کوئی جنگ و جدال اور قتل وقتال نہ کرو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جہاد و قتال اور جزیہ کا حکم نازل فرمائے اور جہاد و قتال کے حکم میں تاخیر عاجز ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ فی الحال بھی قادر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن اس تاخیر میں کچھ حکمتیں ہیں وہ قادر و توانا جب چاہے گا ضعیف کو قوی پر غالب کر دیگا اور اگر تم کو اپنے ان دشمنانِ ایمان سے جہاد کا شوق ہے تو جہاد بالسیف کا حکم آنے سے پہلے جہاد نفس میں مشغول رہو اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ کو دیتے رہو۔ یہ عبادت مالی اور بدنی نفس پر بہت شاق اور گراں ہے۔ بس اس جانی و مالی جہاد میں لگے رہو۔ اور نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ جو نیکی اور بھلائی بھی تم آگے بھیجو گے تمام جمع شدہ ذخیرہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پاؤ گے۔ یہ ناممکن ہے کہ تمہارا کوئی عمل ضائع ہو جائے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو خوب دیکھتا ہے۔ اس عمل کی کمیت اور کیفیت اور تمہارا اخلاص اور شوق اور نیت سب اُس کے نظروں کے سامنے ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ

اور وہ کہتے ہیں ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہونگے یہود یا

نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ

نصاریٰ یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے تو کہہ لے آؤ سند اپنی اگر تم

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۱۱ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ

سچے ہو کیوں نہیں جس نے تابع کیا منہ اپنا اللہ

وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ

کے اور وہ نیکی پر ہے اسی کو ہے مزدوری اسکی اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۱۲﴾

ان پر اور نہ ان کو غم

ثناعت بست وہفتم (۲۷)
باشتراک نصارےٰ

قال تعالیٰ۔ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ ... الیٰ .... وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

اے مسلمانو! یہ اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ تم کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ جنت میں سوائے یہود اور نصاریٰ کے ہرگز کوئی داخل نہ ہو گا تم کو فریب دیکر اور بہشت کا شوق دلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں تم ہرگز ان کی طرف مائل نہ ہونا۔ اور نہ انکی بات کی طرف التفات کرنا۔ یہ سب ان کی خالی آرزوئیں اور دل کے بہلانے کی باتیں ہیں جن پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی۔ آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا تو اپنی کوئی دلیل پیش کرو بغیر دلیل کے کوئی دعویٰ مسموع نہیں البتہ جو امر دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے ثابت ہے اور تمام اہل حق کے نزدیک مسلم ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے وجہ یعنی اپنی ذات کو خدا تعالےٰ کے سپرد کر دے اور اسکے حکموں کے سامنے گردن ڈال دے کہ اللہ کا جو حکم بھی جس وقت پہنچے اس کو سنے اور سر اور آنکھوں پر رکھے اور بیچون وچرا اس کو مانے اور اس اطاعت اور فرمانبرداری میں مخلص اور نیکوکار ہو یعنی جب اللہ کی عبادت کرے تو اس طرح کرے گویا کہ اللہ تعالےٰ اس کو دیکھ رہا ہے تو ایسے شخص کو اللہ کے یہاں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا اجر ملے گا اور نہ ان پر آئندہ کا کچھ خوف ہو گا اور نہ گزشتہ پر غمگین ہوں گے۔ حاصل کلام یہ کہ جنت میں وہ شخص داخل ہو گا جس میں یہ دو صفتیں پائی جائیں اوّل اسلام لوجہ اللہ اور دوسری احسان۔ اسلام سے تصحیح عقائد مراد ہے اور احسان سے اعمال حسنہ اور ان لوگوں میں یہ دونوں صفتیں مفقود ہیں۔ پیغمبر وقت پر ایمان نہیں لائے اور جو احکام پہلے حکموں کے نسخ کے لیے نازل ہوتے انکو قبول نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ ناسخ آجانے کے بعد حکم منسوخ پر عمل کرنے والا مطیع اور فرمانبردار نہیں ہو سکتا اور نہ احسان عمل اُن کو نصیب ہوا۔ اللہ کی شریعت میں تحریف کی اور اللہ پر جھوٹ بولا۔ ایسی حالت میں دخول جنت کی توقع خیال خام ہے البتہ مسلمانوں نے اللہ کی آخری شریعت کو اخلاص کے ساتھ قبول کیا وہ جنت کے مستحق ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو خاصانِ خدا کے انتساب ہی کو مدار نجات سمجھے ہوئے ہیں وہ آگاہ ہو جائیں کہ محض یہ تمنائیں ذریعۂ نجات نہیں ہو سکتیں۔ ایمان

اور اعمال صالحہ شرطِ نجات اور مغفرت ہیں۔ اور یہ دونوں ان میں مفقود ہیں۔



وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّ
اور یہود نے کہا نصاریٰ نہیں کچھ راہ پر اور
قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ
نصاریٰ نے کہا یہود نہیں کچھ راہ پر اور وہ
يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہی ان لوگوں نے جن پاس علم نہیں
مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
انہیں کی سی بات۔ اب اللہ حکم کرے گا ان میں دن قیامت کے
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
جس بات میں جھگڑتے تھے

شناعتِ بست و ہشتم (۲۸)
باشتراکِ نصاریٰ و مشرکین

قال تعالیٰ۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى ... الیٰ ... فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نجران کے نصاریٰ آئے۔ علماء یہود بھی ان کو سن کر آ گئے دونوں فریق کی آپس میں بحث شروع ہو گئی۔ جوش میں آ کر ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور جوش میں آ کر یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ کسی صحیح اور قابل اعتبار چیز پر نہیں۔ بالکل بے بنیاد ہے سرے ہی سے کسی بنیاد پر قائم نہیں اور اسی طرح نصاریٰ یہ کہنے لگے کہ یہود کسی چیز پر نہیں

یعنی انکا دین ہیچ اور بے بنیاد ہے اور حالانکہ دونوں فریق اللہ کی کتاب پڑھتے رہتے ہیں یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے رہتے ہیں اور ہر کتاب میں دوسری کتاب اور اس کے رسولؑ کی تصدیق موجود ہے۔ توریت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تصدیق کرتی ہے اور انجیل موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تصدیق کرتی ہے۔ اصل بنیاد دونوں کی صحیح ہے اگرچہ بعد میں نسخ اور تحریف کی وجہ سے غیر معتبر ہو گئے اور اسی طرح ان جیسی باتیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ جن کے پاس علم نہیں یعنی مشرکین اور مجوس یہی کہتے کہ ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارے سوا سب بے دین اور گمراہ ہیں۔ پس یہ دنیا ہے یہاں جس کا جی چاہے بے دلیل ہانک لے۔ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ اُن کے درمیان ان تمام امور کا عملی طور پر فیصلہ فرما دیں گے جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقت میں صحیح تھیں۔ خاتم الانبیاء کے دین اور کتاب سے تمام ادیان منسوخ ہوگئے اور اب قیامت تک سوائے دین اسلام کے اور کوئی دین مقبول اور معتبر نہیں اور عملی فیصلہ سے مراد یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل کے لیے جزاء اور سزا کا حکم سنا دیا جائیگا جس سے حق اور باطل کے امتیاز کا آنکھوں سے مشاہدہ ہو جائیگا اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہ۔ اور فیصلہ میں عملی کی قید اس لیے لگائی کہ علمی طور پر تو دنیا ہی میں دلائل اور براہین سے حق اور باطل کا فیصلہ ہو چکا ہے اگر طبائع میں تعصب اور عناد نہ ہوتا تو دنیا ہی میں نزاع اور اختلاف ختم ہو جاتا لیکن دنیا میں عملی طور پر حق اور باطل کے اختلاف کا فیصلہ کر دینا خلاف حکمت ہے۔ دنیا دارِ تکلیف اور دارِ ابتلاء و امتحان ہے۔ عملی فیصلہ یوم جزا ہی میں مناسب ہے۔

ف كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ ـــــ میں قول کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود ہے اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ میں مقولہ کیساتھ تشبیہ دینا ہی مقصود ہے لہذا تشبیہ میں تکرار نہیں رہا۔ نیز تاکید کے لیے تکرار عین بلاغت ہے فافھم ذٰلک و استقم۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا

اور اس سے ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ پڑھیئے وہاں

اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ

نام اس کا اور دوڑا ان کے اجاڑنے کو ایسوں کو نہیں پہنچتا

اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا

کہ بیٹھیں ان میں مگر ڈرتے ہوئے ان کو دنیا میں ذلت

خِزۡیٌ وَّلَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ

ہے اور ان کو آخرت میں بڑی مار ہے اور اللہ ہی

الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ۚ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ ؕ

کی ہے مشرق اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۱۵﴾

بر حق اللہ گنجائش والا ہے خبر رکھتا ۔

شناعت بست و نہم (۲۹)
باشتراک نصاریٰ و مشرکین

قال تعالٰی وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ ... الٰی ... اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ۔

یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب ہی اس امر کے مدعی ہیں کہ ہم حق پر ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ حق سے کس قدر دور ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے خواہ دل سے اور خواہ زبان سے اور خواہ اعضاء اور جوارح سے اور فقط اس پر کفایت نہ کرے بلکہ اُن کے ویران اور برباد کرنے کی کوشش کرے مساجد کی بیحرمتی کرنا اور اُن کو منہدم کرنا یہ مساجد کی ظاہری تخریب ہے اور عبادت اور ذکر اللہ کی بندش کر دینا یہ مساجد کی معنوی تخریب اور باطنی ویرانی ہے۔ جیسا کہ حق تعالٰی کے اس ارشاد

اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ — اللہ کی مساجد کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں
مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ — جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے
الۡاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ — دن پر اور نماز قائم کی۔

میں عمارت سے ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی عمارت مراد ہے اسی طرح وَسَعٰی فِیۡ خَرَابِهَا میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی تخریب مراد ہے۔ غرض یہ کہ مساجد کو ویران کرنا سب کے نزدیک نہایت قبیح اور فعل شنیع ہے اور یہ تینوں گروہ اس بلا میں مبتلا ہیں۔ یہود اور نصاریٰ نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو ویران کیا اور مشرکین مکہ نے مسجد حرام کو ویران کیا اور اس میں خدا

کا نام لینے سے مانع اور مزاحم بنے۔ ان ظالموں کو چاہیئے تھا کہ مسجدوں میں اور خدا کے گھروں میں قدم بھی نہ رکھتے مگر ڈرتے ہوئے کہ مبادا خدا کے گھر کے ادب اور تعظیم میں ہم سے کوئی قصور نہ ہو جائے جس سے خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس گھر کا ادب یہی ہے کہ اس کو اللہ کے ذکر اور عبادت سے آباد کیا جائے۔ خدا کے دربار میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے ہی دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیئے۔ افسوس کہ یہ لوگ نہ خدا سے ڈرے اور نہ اس کے گھر کا ادب کیا بلکہ ظلم ڈھانے لگے اور اللہ کے بندوں کو اسکے دربار میں حاضری سے روکنے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ دربار شاہی کو ویران کرنے کی کوشش کرنا اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں اس لیے یہ لوگ دونوں جہان میں سزایاب ہونگے۔ ان کو دنیا میں بھی سخت رسوائی نصیب ہوگی کہ قتل اور قید کیے جائیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑا عذاب ہو گا اور اے مسلمانو! اگر کافر تمکو مسجد حرام اور مسجد اقصٰی میں جانے سے روکیں تو ملول نہ ہونا۔ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ تعالٰے نے تمام روئے زمین کو تمہارے لیے مسجد بنا دیا ہے ہر جگہ تمہارے لیے نماز اور عبادت درست ہے۔ اللہ تعالٰی کوئی جسم اور جسمانی نہیں کہ جو کسی خاص مکان میں موجود ہو اور دوسرے مکان میں نہ ہو وہ تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے البتہ تم زمان اور مکان اور جہت کے ساتھ مقید ہو اس لیے اللہ تعالٰی نے تمہاری عبادت کے لیے ایک جہت مقرر فرما دی اور ایک قبلہ متعین کر دیا لیکن اگر تم فرائض میں کسی دشمن کے خوف کی وجہ سے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکو۔ یا اندھیری رات میں قبلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے تم نے تحری کر کے نماز پڑھ لی اور بعد میں معلوم ہوا کہ نماز قبلہ رُخ نہیں پڑھی گئی یا سفر میں سواری پر نوافل پڑھنا چاہتے تھے اور سواری کا منہ قبلہ کی طرف نہ تھا اور سواری سے اترنے میں دشواری تھی تو ان حالات میں نماز پڑھتے وقت جدھر بھی اپنا منہ کر لو گے تو ادھر ہی اللہ کا رخ ہے یعنی وہی جہت اور سمت قبلہ کی ہے اور تمہاری نماز ہر حال میں صحیح اور مقبول ہے اور ہر حال میں اللہ کا قرب اور حضور تم کو حاصل ہے اس لیے کہ اللہ تعالٰے جسم اور جسمانی نہیں کہ اگر ایک مکان میں موجود ہو تو دوسرے مکان میں موجود نہ ہو وہ کسی مکان اور جہت کے ساتھ مقید نہیں اور اللہ تعالٰے نے تمہارے لیے یہ وسعت اور سہولت اس لیے عطا فرمائی کہ اللہ تعالٰے بڑے ہی وسیع رحمت والے ہیں۔ امام ربانی فرماتے ہیں کہ وَاسِعٌ سے اللہ تعالٰی کی ذاتی وسعت مراد ہے اس کی ذات کی طرح اس کی وسعت بھی بیچون و چگون ہے جس کی کیفیت حیطۂ ادراک سے باہر ہے اور بندہ کی حاجتوں اور مصلحتوں کے خوب جاننے والے ہیں۔ حسن بصری اور قتادہ سے مروی ہے کہ یہ حکم قبلہ متعین ہونے سے پہلے تھا ابتداء میں اختیار تھا کہ جس سمت میں چاہیں نماز پڑھیں بعد میں یہ حکم منسوخ ہوا مگر یہ قول ضعیف ہے اور روایات سے اس پر کوئی سند اور دلیل نہیں اور بعض کہتے ہیں کہ تحویل قبلہ کی تمہید ہے اور یہود اور نصاریٰ کا رد ہے کہ جو ہر ایک اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا۔ اللہ تعالٰے نے فرمایا کہ مشرق اور مغرب

سب اسی کا ہے جس جہت اور جس سمت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے وہی جہت قبلہ ہے اور آیت کریمہ اپنے عموم کی وجہ سے ان تمام صورتوں کو شامل ہے جو اسکے شانِ نزول میں مروی ہیں ۔ ابوبکر رازیؒ نے احکام القرآن میں اسی عموم کو اختیار فرمایا ہے ۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا

اور کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد وہ سب سے پاک ہے بلکہ اسکا مال ہے جو

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ

کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں سب اسکے آگے ادب سے ہیں نیا نکالنے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا

والا آسمان اور زمین کا اور جب حکم کرتا ہے ایک کام کو تو یہی

يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

کہتا ہے اس کو ہو وہ ہوتا ہے

شناعت سی (۳۰) ام ایضًا
باشتراک نصارٰے ومشرکین

قال تعالیٰ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ... الی ... كُنْ فَيَكُوْنُ.
اللہ کی مسجدوں کو ویران کرنا بلاشبہ ظلم ہے مگر یہ ظالم اس سے بڑھ کر شرک کے ظلمِ عظیم میں مبتلا ہیں اور وہ ظلمِ عظیم یہ ہے کہ یہ ظالم یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے ۔ یہود کہتے ہیں کہ حضرت عزیرؑ خدا کے بیٹے تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے تھے اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتلاتے ہیں ۔ سبحان اللہ کیا احمقانہ اور گستاخانہ کلمہ ہے سب کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ توالد اور تناسل سے پاک اور منزہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا عقلاً ناممکن ہے اس لیے کہ بیٹا باپ کے مماثل اور مشابہ اور ہم جنس ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ

بے مثل اور بیچون وچگون ہے ورنہ اگر بیٹا باپ کے ہم جنس نہ ہو تو پھر وہ بیٹا اس باپ کا فرزند نہ ہو گا نیز بیٹے کا باپ کے ہم جنس نہ ہونا ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ نیز باپ اولاد کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد سے پہلے بیوی کا محتاج ہوتا ہے کہ اولاد بغیر زوجہ کے ممکن نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ صمد یعنی بے نیاز ہے کسی کا محتاج نہیں۔ نیز ولادت کے لیے تغیر اور تبدل اور تجزی اور انقسام لازمی ہے اور یہ خاصہ ممکن اور حادث کا ہے۔ قدیم میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔ نیز اگر بالفرض خدا تعالیٰ کے لیے فرزند ہو تو دو حال سے خالی نہیں یا وہ فرزند بھی خدا اور واجب لذاتہ ہو گا یا نہیں اگر وہ فرزند خدا ہوا تو لامحالہ مستقل ہو گا اور باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہو گا اس لیے کہ خدائی کے لیے بے نیازی لازم ہے حالانکہ بیٹے کا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہونا عقلاً محال ہے بیٹے کا وجود ہی باپ سے ہوا ہے اور جب بیٹا خدا ہونے کی وجہ سے باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہو گا تو پھر اسکو باپ سے کوئی تعلق بھی نہ ہو گا اور بیٹے کا باپ سے بے تعلق ہونا ناممکن ہے اس لیے کہ فرع کا اصل سے بے تعلق ہونا عقلاً محال ہے۔ علاوہ ازیں جب بیٹا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہو گا تو باپ خدا نہ رہے گا اس لیے کہ خدا سے کوئی مستغنی نہیں ہو سکتا وہ خدا ہی کیا ہوا جس سے کوئی مستغنی اور بے نیاز ہو سکے اور اگر یہ کہو کہ وہ بیٹا خدا اور واجب الوجود نہیں تو لامحالہ وہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہو گا اور اسکا عبد اور مملوک ہو گا لہذا فرزند کا عبد اور مملوک ہونا لازم آئیگا اور بیٹا عبد اور مملوک نہیں ہوتا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی اسکے لیے کوئی اولاد نہیں بلکہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں خاص اسی کی مملوک ہیں اور ملکیت اور ابنیت جمع نہیں ہو سکتی اس لیے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ مملوک اور مخلوق مالک اور خالق کے ہم جنس نہیں اور فرزند باپ کے ہم جنس ہوتا ہے اسی وجہ سے شریعت میں یہ مسئلہ ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے اس لیے کہ فرزندیت اور عبدیت میں تباین کلی اور منافات تامہ ہے پس جبکہ بندوں میں فرزندیت اور عبدیت جمع نہیں ہو سکتی تو بارگاہ الوہیت میں یہ دونوں چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں اور علاوہ مملوک ہونے کے آسمان و زمین کے رہنے والے تمام کے تمام جن میں فرشتے اور حضرت عزیر اور حضرت مسیح بھی داخل ہیں۔ سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ بعضے برضا و رغبت جیسے فرشتے اور انبیاء کرام اور مؤمنین صالحین اور بعضے جبراً و قہراً جیسے شیاطین اور کفار و فجار۔ یہ کسی کی مجال نہیں کہ اسکے ارادہ اور مشیت کو ٹال سکے اور اسکے حکم سے سرتابی کر سکے۔ اور کافر و فاجر جو ظاہراً اس کی معصیت کرتے ہیں وہ تکوینی اور باطنی طور پر اللہ ہی کے ارادہ اور مشیت سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے انکو معصیت کرنے کی قدرت دی ہے ورنہ اگر وہ قدرت نہ دیتا تو کوئی معصیت نہ کر سکتا۔ غرض یہ کہ تمام موجودات اسی کے قبضہ تصرف میں ہیں جس کو چاہے مارے اور جسکو چاہے جلائے کوئی اسکے تصرف سے باہر نہیں نکل سکتا اور جس کی یہ شان ہو اس کا کوئی ہم جنس اور مماثل نہیں ہو سکتا۔ اور بیٹے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ باپ کے ہم جنس ہو۔ اور عجب

نہیں کہ کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ سے الزام مقصود ہو کہ جن کو تم خدا کا بیٹا اور اولاد کہتے ہو وہ سب اللہ کی عبودیت کے معترف اور مقر ہیں اور ہر وقت اسی کی تسبیح و تنزیہ میں لگے رہتے ہیں۔ پھر تم اُن کو خدا کی اولاد کس طرح بتلاتے ہو۔ نیز ولادت کے لیے مادہ اور مدت اور آلات اور اسباب کی ضرورت ہے اور خدا کی شان یہ ہے کہ وہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی بغیر مادہ کے آسمان اور زمین کا موجد ہے۔ محض اپنی قدرت سے تمام کائنات کو پردۂ عدم سے نکال کر مسند وجود پر لا بٹھلایا ہے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کر دے تو اسکے لیے مشکل نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی ایجاد میں کسی مادہ اور مدت اور کسی آلہ اور سبب کا محتاج نہیں اس لیے کہ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو کُنْ کا حکم دیتا ہے یعنی موجود ہوجا! پس وہ شئی فوراً موجود ہو جاتی ہے اور فرشتے اور حضرت عزیرؑ اور حضرت عیسیٰؑ سب اسی طریقہ سے پیدا ہوئے اور ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے پیدا ہونے کا نام کسی کے نزدیک ولادت نہیں پھر کیوں انکو خدا کی اولاد بتاتے ہو۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام میں یہ قدرت نہ تھی کہ وہ کلمۂ کُن سے کسی کو پیدا کر سکیں اور بقول نصاریٰ وہ تو اپنی جان بھی یہود کے ہاتھ سے نہ بچا سکے اور نہ دشمنوں پر غلبہ پا سکے تو پھر وہ خدا کیسے ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود اور نصاریٰ اور مشرکین خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے تھے اول حق تعالیٰ نے سُبْحٰنَهٗ فرما کر اولاد سے اپنا پاک ہونا بیان فرمایا اور بعد ازاں چند وجوہ سے اُنکا رد فرمایا اوّل یہ کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ سب اسکی ملک ہے اور اولاد ملک نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ تمام کائنات اسکی تابعدار اور اسکے ارادہ اور مشیت کے مسخر ہے کائنات کے ہر ذرہ سے حدوث اور احتیاج کے آثار اور علامات نمایاں ہیں جو سراسر وجوب ذاتی کے منافی ہیں اور حادث اور ممکن واجب ذاتی کا بیٹا نہیں ہو سکتا لہذا کائنات میں سے کوئی شئے بھی خدا کی اولاد نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اولاد اگرچہ باپ کے برابر نہ ہو لیکن ہم جنس ضرور ہوتی ہے اور کائنات کا کوئی ذرہ وجوب ذاتی میں باری تعالیٰ کا شریک اور سہیم نہیں۔

اور اگر چاہو تو جملہ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ کو جملہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا تتمہ اور تکملہ بنا دو تو اب دونوں جملے مل کر ایک ہی دلیل بنیں گے علیحدہ علیحدہ دلیل نہ بنیں گے تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے یعنی اللہ تعالےٰ بغیر مادہ کے آسمان و زمین پیدا کرنے والے ہیں اور ولادت کے لیے مادہ اور مدت درکار ہے چوتھے یہ کہ حق تعالیٰ کی ایجاد کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو کُنْ فرما دیتے ہیں وہ اسی وقت موجود ہو جاتی ہے اور اس کا نام ولادت نہیں یا یوں کہو کہ یہ تمام صفات کمال، خداوند ذوالجلال کے ساتھ مختص ہیں کسی فرشتہ اور نبی میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ خدا کے سوا نہ کوئی آسمان اور زمین کے ذرہ کا مالک ہے اور نہ ایک مچھر کے پر کی ایجاد اور تخلیق پر قادر ہے پھر کس طرح خدا کے فرزند ہوئے۔ پانچویں یہ کہ بیٹا ہمیشہ باپ کا جزء ہوتا ہے اور جزء

کسی مرکب کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے۔

فائدہ نصاریٰ جب ان دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کے جواب سے لاجواب ہوتے ہیں تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری مراد بیٹے سے حقیقی معنی نہیں بلکہ معنی مجازی مراد ہیں جیسے پیار اور محبت میں کسی کو بیٹا بول دیتے ہیں تو اس سے معنی حقیقی مراد نہیں ہوتے بلکہ محبوب اور برگزیدہ کے معنے مراد ہوتے ہیں اس معنی کر ہم حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔

جواب اگر ابن اللہ سے خدا کے محبوب اور برگزیدہ کے معنی مراد ہیں تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے سارے ہی انبیاء خدا کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ ابن اللہ کا اطلاق محبوب اور برگزیدہ کے معنی میں اگرچہ کفر اور شرک نہیں لیکن کفر اور شرک کا ایہام اس میں ضرور ہے۔ جیسے غیر اللہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم وتحیت کفر نہیں بلکہ حرام ہے۔ اسی طرح شریعت محمدیہ میں سجدہ تحیت وتعظیم کی طرح اس لفظ کے اطلاق ہی کو ممنوع قرار دیا۔ بارگاہ خداوندی کے آداب کے خلاف ہے کہ زبان سے کوئی لفظ ایسا نکالا جائے جس میں خدا تعالیٰ کی تنزیہ وتقدیس کے خلاف کا ایہام بھی ہو پادری صاحبان جب بالکل ہی لاچار ہو جاتے ہیں تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ مسئلہ سر الٰہی اور رمز خداوندی ہے ہم اس کے سمجھانے سے قاصر ہیں۔ لیکن اب اس صریح خلاف عقل عقیدہ کے ماننے والے بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔ سوائے ان پادریوں کے جن کو مشن سے تنخواہ ملتی ہے وہ حضرت مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا بتلاتے ہیں۔ باقی یورپ اور ایشیا کے اکثر عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بندہ اور رسول سمجھنے لگے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآن کریم کی ساڑھے تیرہ سو برس کی مسلسل پکار کے بعد بنی اسرائیل کی بھیڑوں کی سمجھ میں آیا کہ ابنیت، تثلیث کا عقیدہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔

عذرِ لنگ اور بعض سنجیدہ عیسائی جنہوں نے صوفیہ کرام کی کتابوں کا کچھ مطالعہ کیا ہے وہ اپنے اس عقیدہ ابنیت کی اس طرح تاویل کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی صفات صفات خداوندی کا عکس اور پرتو تھیں اور چونکہ اس قسم کا انعکاس سوائے حضرت مسیح کے کسی مخلوق میں نہیں ظاہر ہوا اور اس بارہ میں حضرت مسیح کا مرتبہ تمام مخلوق سے بالا اور برتر تھا اس لیے انکو خدا تعالیٰ سے ایسی نسبت ہے جو اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں اسی نسبت کو ہم ابوت اور بنوت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسیح کو ابن اللہ کہتے ہیں۔

جواب یہ محض ایک اصطلاحی تاویل ہے جس کے تسلیم کر لینے کے بعد عیسائیوں کے پاس مسیحؑ کی بالخصوص ابن اللہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں رہتی حق تعالیٰ نے اپنے بہت سے برگزیدہ بندوں کو اپنے جلال وجمال کا مظہر بنایا اور ان پر اپنی صفات کمال کا خاص عکس اور پرتو ڈالا جو اور کسی مخلوق پر نہیں ڈالا تو کیا ان حضرات کو بھی ابن اللہ کہنا جائز ہوگا۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی ذات بابرکات بھی صفات خداوندی کا خاص مظہر اور آئینہ تھی

اور سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات تو تمام اولین اور آخرین کے کمالات کی جامع تھی۔

نصاریٰ کی اگر یہ تاویل صحیح ہو تو کواکب پرست بھی یہی تاویل کر سکتے ہیں کہ ہم چاند اور سورج وغیرہ کو کامل ترین مخلوق الٰہی یا مظہر جلال خداوندی سمجھ کر انکی پرستش کرتے ہیں۔ صابئین چاند اور سورج کو خدا تعالیٰ کا مظہر اتم سمجھے اور نصاریٰ مسیح بن مریمؑ کو اور دونوں گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

شبہ بادی النظر میں یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز عدم محض ہو تو پھر اس کو وجود کا حکم کیونکر دیا جا سکتا ہے کیونکہ حکم تو موجود کو دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ موجود کو وجود کا حکم دینا تحصیل حاصل ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ امر کن ۔ امر تکلیفی نہیں جسکے لیے وجود مخاطب اور فہم خطاب ضروری ہو بلکہ یہ امر تسخیری اور تکوینی ہے جس سے معدوم کو موجود کیا جاتا ہے۔ ذات انسانی میں اصل فاعل مختار اسکا اندرونی نفس ناطقہ ہے اور اعضاء اور جوارح اس کے حکم پر حرکت کرتے ہیں نفس ناطقہ جب زبان کو بولنے کا حکم دیتا ہے تو زبان سے وہ کلمات ظہور اور وجود میں آنے لگتے ہیں کہ پہلے سے جن کا وجود خارجی میں کہیں نام ونشان نہ تھا اور نفس ناطقہ قدم کو چلنے کا حکم دیتا ہے جس سے وہ حرکات ظہور میں آتی ہیں جو پہلے سے معدوم تھیں مگر نفس ناطقہ کے علم اور تصور میں تھیں۔

اسی طرح سمجھو کہ جو ممکنات خارج میں معدوم ہیں وہ سب علم الٰہی میں موجود ہیں جس معدوم کو حق تعالیٰ اپنے خزانۂ علم سے نکال کر خارج میں موجود کرنا چاہتا ہے اس کو کُن خطاب فرماتے ہیں اسی طرح وہ معدوم وجود علمی سے نکل کر وجود خارجی میں آجاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو ہر شدنی امر کا اس کے ہونے سے پہلے علم ہوتا ہے اس لیے وہ چیزیں جو ابھی عدم سے وجود میں نہیں آئی ہیں وہ سب اس کے علم میں موجود ہیں اور اس کے نزدیک موجود کا حکم رکھتی ہیں اس لیے جب وہ انکو عدم سے وجود کی طرف نکلنے کا حکم دیتا ہے اور کن کہتا ہے تو موجود ہو جاتی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس معدوم کی صورت علم الٰہی میں پہلے سے موجود ہوتی ہے وہ کن کا مخاطب اور محکوم ہوتی ہے متکلمین کے دو گروہ ہیں ایک اشاعرہ اور ایک ماتریدیہ۔ ماتریدیہ کے نزدیک یہ آیت اپنے ظاہر اور حقیقت پر ہے اور اشاعرہ کے نزدیک یہ آیت مجاز اور تمثیل پر محمول ہے قاضی بیضاویؒ نے اسی کو اختیار فرمایا کہ آیت میں حقیقۃً کسی شئے کو کُن کا خطاب کرنا مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شئے کو حقیقۃً امر فرمایا ہو اور اس نے امتثال کیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت کی یہ ایک مثال دی ہے کہ جس طرح کوئی آمر کسی مامور کو حکم دے وہ فوراً مطیع ہو جاتے۔ اسی طرح جب ہم کسی شئے کو پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ شئے فوراً موجود ہو جاتی ہے۔ ہمارے ارادہ اور پیدائش میں ذرہ برابر فاصلہ نہیں ہوتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ

اور کہنے لگے جن کو علم نہیں کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا

تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

ہم کو آوے کوئی آیت اسی طرح کہہ چکے ہیں ان سے اگلے

مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ

انہی کی سی بات ایک سے ہیں دل بھی ان کے ہم نے بیان کر دیں نشانیاں

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

واسطے ان لوگوں کے جنکو یقین ہے

شناعت سی (۳۱) ویکم ایضاً

باشتراکِ نصاریٰ ومشرکین

قال تعالیٰ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ... الی ... لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔

گزشتہ آیات میں اُنکی توحید کا حال بیان فرمایا۔ اب ان آیات میں نبوت کے بارہ میں ان کے شبہ کو بیان فرماتے ہیں اور یہ نادان یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہم سے بلا واسطہ کلام کیوں نہیں فرماتا کہ یہ خود بالمشافہ ہم سے کہہ دے کہ یہ ہمارے نبی اور رسول ہیں تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہو جائیں اور ان کی اطاعت کرنے لگیں یا اگر ہم سے کلام نہیں کرتے تو کم ازکم من جانب اللہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی آجائے کہ جسے دیکھ کر ہم کو بداہتہً آپکی نبوت کا یقین آجائے حق تعالےٰ فرماتے ہیں یہ کوئی نیا جاہلانہ سوال نہیں جو جاہل ان سے پہلے گزرے وہ بھی ایسی باتیں کہتے رہے ہیں اور یہی اُن کے جاہل اور نادان ہونے کی دلیل ہے کہ باوجود اپنے کمال نالائقی کے اپنے کو خدا تعالےٰ کی ہم کلامی کا اہل سمجھتے ہیں۔ تم تو دنیاوی بادشاہوں اور امیروں کی ہم کلامی کا بھی رتبہ نہیں رکھتے اگر ہر شخص خدا کی ہم کلامی کا رتبہ رکھتا تو پھر انبیاء اور مرسلین کے بھیجنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا دنیا میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں وزیر کے حکم کو نہیں مانوں گا جب تک کہ بادشاہ خود بالمشافہ مجھ سے آکر یہ نہ کہہ دے کہ یہ میرا وزیر ہے تم اس

کی اطاعت کرنا اور چونکہ ان کی یہ بات بالکل مہمل تھی اس لیے حق تعالیٰ نے اسکا کوئی جواب نہیں ارشاد فرمایا۔

ع پس جواب احمقی آمد سکوت

بلکہ اس جاہلانہ سوال کے منشا کو بیان فرمایا وہ یہ کہ ان اگلے اور پچھلے کافروں کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ان پچھلے نادانوں کے شبہات پہلے نادانوں کے شبہات کے مشابہ ہیں۔ یعنی اس زمانہ کے کافر اگرچہ پہلے زمانہ کے کافروں سے بہت بعد ہیں اور آپس میں کوئی سلسلۂ وصیت بھی نہیں مگر قلوب سب کے ہم رنگ ہیں اسی وجہ سے شبہات میں بھی تشابہ اور ہم رنگی ہے اور آیات اور معجزات کے انکار میں ایک دوسرے کے قدم بقدم ہیں اور من مانے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں سوال کا جواب یہ ہے کہ تم اَوْ تَاْتِیْنَآ اٰیَۃٌ کہہ کر ایک نشانی مانگتے ہو۔ ایک نشانی نہیں تحقیق ہم آپکی نبوت ورسالت کی تصدیق کے لیے صدہا بلکہ ہزار واضح اور روشن نشانیاں ظاہر کر چکے ہیں مثلاً شجر اور حجر کا آپکو سلام کرنا اور جانوروں کا آپؐ کی نبوت کی شہادت دینا وغیرہ وغیرہ مگر افسوس ان نادانوں کو ان روشن اور واضح معجزات سے کوئی نفع نہ ہوا۔ یہ آیات بینات ان لوگوں کے لیے نافع ہیں جو یقین اور اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ضدی اور معاند نہیں۔

فائدہ تشبیہ اور تشابہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مختلف المراتب ہوتے ہیں اور تشابہ میں دونوں متشابہ مساوی اور برابر ہوتے ہیں اسی وجہ سے جہاں مساوات کا بیان مقصود ہوتا ہے وہاں بجائے تشبیہ کے تشابہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کما قال قائل ؎

رق الزجاج و رقت الخمر فتشابھا و تشاکل الامر
فکانما خمر ولا قدح وکانما قدح ولا خمر

اسی طرح یہاں تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ میں تشابہ کا لفظ اختیار فرمایا اس لیے کہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ اگلے اور پچھلے کافروں کے دل یکساں ہیں کوئی فرق نہیں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّلَا

ہم نے تجھ کو بھیجا ہے ٹھیک بات لیکر خوشی اور ڈر سنانے کو اور تجھ

تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ

سے پوچھ نہیں دوزخ والوں کی اور ہر گز راضی نہ ہونگے تجھ سے

الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ

تو یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تابع نہ ہو تو انکے دین کا تو کہہ جو

هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

راہ اللہ دکھاوے وہی راہ ہے اور کبھی تو چلا ان کی

اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ

پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ

تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنیوالا اور نہ مددگار جن کو ہم

اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ

نے دی ہے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا

اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ

وہ اس پر یقین لاتے ہیں اور جو کوئی منکر ہوگا اس سے سو

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

انہیں کو نقصان ہے۔

خاتمۂ کلام و اتمامِ حجت و الزام و تسلیۂ سیدانام
علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا .. الی .. فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔

(ربط) یہاں تک بنی اسرائیل کی قباحتوں اور شناعتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا شنائع بنی اسرائیل کی تفصیل کی ابتداء کفران نعمت اور دنائت اور خست سے فرمائی۔ کما قال تعالٰی۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ — اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہ کریں گے۔

اور پھر درمیان میں اُن کی قساوتِ قلب کو ذکر فرمایا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ

پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اس کے بعد پس وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔

اور اس قبائح اور شنائع کے سلسلہ کو ان کے کبر و نخوت پر ختم فرمایا کہ اس قدر مغرور اور متکبر ہیں کہ اپنے کو خداوند ذوالجلال کی ہمکلامی کا اہل سمجھتے ہیں اور احکم الحاکمین کے وزراء و نائبین یعنی انبیاء و مرسلین کے اتباع اور اطاعت کو اپنے لیے کسرشان سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تکبر اور نخوت سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں تکبر ہی تمام امراض کی جڑ ہے یہی مرض سب سے پہلے دنیا میں آیا اور یہی مرض ابلیس کی لعنت کا سبب بنا۔ اب ان قبائح اور شنائع کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ اے ہمارے نبی آپ مغموم اور رنجیدہ نہ ہوں اور اب اُنکے رشد و ہدایت کی طمع دل سے نکال دیجئے جنکے دل پتھر سے زیادہ سخت ہوں اور کبر اور نخوت سے لبریز ہوں۔ اُن سے اسلام اور ایمان کی توقع نہ رکھیئے۔ حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔ آپکی نبوت و رسالت کے اتنے واضح اور روشن دلائل ہم نے واضح کر دیئے ہیں کہ جس کے بعد طالب حق کے لیے کسی قسم کے شک اور تردد کی گنجائش نہیں اور علاوہ ازیں ہم نے آپ کو دین حق دیکر بھیجا ہے جو آپکی نبوت کی مستقل اور روشن دلیل ہے اور ایسا ثابت اور پختہ ہے۔ کہ جو موجب طمانیتہ و یقین ہے اور شکوک اور شبہات سے اس میں تزلزل کا امکان نہیں بالفرض اگر آپ سے کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہوتا تو فقط آپ کا دین حق اور آپ کی شریعت حقہ ہی آپکی نبوت کے ثابت کرنے کے لیے کافی اور وافی تھی۔ نیز ہم نے آپکو مخلوق کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ ماننے والوں کو جنت کی بشارت سنائیں اور منکرین کو عذاب سے ڈرائیں اور پھر لوگ اپنے اختیار سے ایمان لائیں اگر ایسے معجزات ظاہر کر دیئے جائیں کہ جن سے مجبور اور لاچار ہو کر ایمان لانا پڑے تو وہ ایمان بے سود ہے مکلف بنانے کا جو مقصد ہے وہ جبری ایمان کی صورت میں باقی نہیں رہتا اور اگر یہ بدنصیب اب بھی ایمان نہ لائیں اور آپکی دعوت حقہ کو قبول نہ کریں تو آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ آپ نے اپنا فرض منصبی یعنی دعوت و تبلیغ ادا کر دیا۔ آپ سے ان جہنمیوں کے بارہ میں کوئی باز پرس نہ ہوگی از خود انہوں نے کفر اور جہنم کی راہ اختیار کی ہے۔ اگر آپ کا اختیار چلتا تو کبھی انکو جہنم کی راہ نہ چلنے دیتے اور ان لوگوں کا آپکی پیروی اور اتباع سے اعراض اس لیے نہیں کہ آپکے دلائل نبوت میں کسی قسم کا قصور ہے۔ بلکہ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ یہود اور نصاریٰ ہرگز آپ سے راضی اور خوش نہ ہونگے تاوقتیکہ آپ انکی منسوخ ملت کا اتباع اور پیروی نہ کریں وہ اس غرہ میں ہیں کہ ہم کتب الٰہیہ کے علوم کے حامل اور علمبردار ہیں۔ ہم کسی کا کیوں اتباع کریں۔ ہم تو سب کے متبوع اور سردار ہیں لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو متبوع سمجھتا ہو وہ تابع بننے پر کب راضی ہو سکتا ہے۔ آپ اُن کے اس خیال خام کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تحقیق اللہ کی ہدایت ہر زمانہ میں وہی ہدایت ہے جو اُس

زمانہ کا نبیؐ اور رسولؐ لیکر آئے اور گزشتہ ہدایتیں اگرچہ اپنے اپنے وقت پر ہدایتیں تھیں مگر منسوخ ہو جانے کے بعد ہدیٰ۔ ہدیٰ نہیں رہتی بلکہ ہوائے نفس بن جاتی ہے اور نفسانی خواہشوں کا اتباع کبھی ہدایت نہیں ہوسکتا۔ وہ تو صریح ضلالت ہے اور اگر بالفرض محال آپ ان ہوا پرستوں کی نفسانی خواہشوں کا اتباع کریں بعد اسکے کہ آپ کے پاس اس بات کا علم قطعی آچکا ہے کہ اب ہدایت اس میں منحصر ہے کہ جو اللہ نے آپ پر نازل فرمایا اور گزشتہ کی تمام ہدایتیں منسوخ ہو کر ہوائے نفس بن چکی ہیں۔ پس اگر آپ آخری حکم اور آخری ہدایت کو چھوڑ کر کسی پہلی ہدایت اور کسی پہلے حکم کا اتباع کریں تو اللہ کے مقابلہ میں کوئی آپکا حمایتی اور مددگار نہیں جو اللہ کے عذاب سے آپکو بچائے۔ حتیٰ کہ اگر آپ توریت اور انجیل پر عمل کریں تو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام بھی آپکی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ان بیچاروں کا تو ذکر ہی کیا۔

ف یہ تہدیدی خطاب ظاہراً حضورؐ کو ہے لیکن سنانا معاندین کو ہے۔ عناد کی بنا پر ان کو مخاطب بھی نہیں بنایا اور ان کے خطاب سے اعراض فرمایا۔

یہاں تک ان اہل کتاب کا ذکر تھا کہ جو برائے نام اہل کتاب ہیں اور فی الحقیقت اپنی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے اور عناد اور تعصب کی وجہ سے حضورؐ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے آئندہ آیت میں ان اہل کتاب کی مدح ہے جنہوں نے دل و جان سے حق کا اتباع کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہمنے کتاب یعنی توریت اور انجیل عطا کی اور انکی حالت یہ ہے کہ وہ اس کتاب کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ہے یعنی نہ اُس میں لفظی تحریف کرتے ہیں اور نہ معنوی تحریف اور نبی آخرالزمان کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں ہیں ان کو چھپاتے نہیں ایسے ہی لوگ حقیقۃً اپنی کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور اپنی کتاب کی ہدایت اور بشارت کے مطابق نبی آخرالزمانؐ کی تصدیق کرتے ہیں اور جو لوگ نبی آخرالزمانؐ پر ایمان نہیں لاتے وہ درحقیقت اپنی اپنی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ اور جائز ہے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ میں بِہٖ کی ضمیر بجائے کتاب کے ہُدیٰ یا قرآن کی طرف راجع کی جائے یعنی جو لوگ توریت اور انجیل کی کما حقہٗ تلاوت کرتے ہیں وہی اس ہدایت کو قبول کرتے ہیں جو نبی آخرالزمانؐ پر نازل ہوئی اور وہی اس آخری کتاب پر ایمان لاتے ہیں جس کی بشارت اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور فلاح دارین حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی کتاب کا انکار کرتے ہیں یعنی توریت اور انجیل میں تحریف کرتے ہیں اور حضور کے ظہور کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں مذکور ہیں انکا انکار کرتے ہیں۔ پس یہی لوگ خسارہ والے ہیں کہ اپنی کتاب پر جو ایمان رکھتے تھے وہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اور جائز ہے کہ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ میں بِہٖ کی ضمیر ہُدیٰ اور قرآن کی طرف راجع ہو یا حضور کی طرف راجع ہو یعنی جو لوگ حضورؐ کی نبوت یا آپکی ہدایت یا آپکے قرآن کے منکر ہیں وہ انتہائی خسارہ میں ہیں اس لیئے کہ حضورؐ آخری نبی ہیں اور قرآن آخری کتاب ہے۔ جب اس پر بھی ایمان نہ لائے تو آخرت کی نجات کا ذریعہ آخر کیا ہے۔ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جب جعفر بن ابی طالبؓ حبشہ سے آئے تو چالیس آدمی اُن کے ہمراہ تھے بتیس ان میں حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے تھے اور بحیرا راہب

بھی ان میں تھا اُن کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ سے صحابہ کرام مراد ہیں اور الکتاب سے قرآن مراد ہے اور حقَّ تِلَاوَتِہٖ سے مراد یہ ہے کہ تلاوت کے پورے حقوق ادا ہونے چاہئیں۔ فرض کرو کہ ایک بادشاہ اپنے فرمان کو اپنے سامنے پڑھنے کا حکم دے تو اس وقت یہ حالت ہوگی کہ ہر لفظ کو سنبھل سنبھل کر اور صاف صاف ادا کرو گے اور معنی اور مفہوم کی طرف بھی پوری توجہ ہوگی اور دل میں یہ پختہ ارادہ ہوگا کہ اس فرمان میں جس قدر بھی احکام ہیں حرف بحرف انکی تعمیل کرونگا۔ اور پڑھتے وقت دربار شاہی کے آداب سے بھی ذرہ برابر غفلت نہ ہوگی۔ اسی طرح تلاوت قرآن کو سمجھو کہ ہم اللہ رب العالمین کے سامنے پڑھ رہے ہیں ایک ایک لفظ کو صاف صاف ادا کرو۔ یہ ترتیل اور تجوید ہے اور اسکے اتباع اور تعمیل کے عزم بالجزم کا نام ایمان اور اطاعت ہے اسی وجہ سے اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ فرمایا اور حضرت عمرؓ سے یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ۔ کی تفسیر میں منقول ہے کہ تلاوت کا حق یہ ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کرتے وقت جنت کے ذکر پر گزرے تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے اور جب آگ کے ذکر پر گزرے تو خدا سے پناہ مانگے کہ اے اللہ اس سے محفوظ رکھنا۔

(ابن ابی حاتم)

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ

اے بنی اسرائیل، یاد کرو احسان میرا جو میں نے

عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا

تم پر کیا اور وہ کہ بڑا کیا تم کو سارے جہان پر اور بچو اس

یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ

دن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی کے ایک ذرہ اور نہ قبول ہو

مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا ھُمْ

اس کی طرف سے بدلا اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور نہ ان کو

یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

مدد پہنچے

تکریر تذکیر و اعادۂ تحذیر

قال تعالیٰ۔ یٰبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ.. الی.. وَلَاھُمْ یُنْصَرُوْنَ۔

(ربط) ابتداء سورت میں جب بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا تو اسی عنوان اور اسی آیت سے شروع فرمایا اور طویل تفصیل کے بعد پھر اسی عنوان اور اسی آیت پر خطاب کو ختم فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ اولاً حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا تاکہ شکر کی راہ اختیار کریں اور کفران نعمت سے احتراز کریں۔ بعد ازاں حق تعالیٰ نے اپنے انعامات اور اپنی عنایات اور ان کی جنایات اور تقصیرات کی تفصیل فرمائی جو یہاں آکر ختم ہوئی اخیر میں حق تعالیٰ نے پھر اسی مضمون کا اعادہ فرمایا جو ابتداء میں اجمالاً ان سے کہا گیا تھا تاکہ تفصیل کے بعد جب اجمال کا اعادہ کیا جائے تو تمام تفصیل بیک وقت نظروں کے سامنے آجائے اور یہ طریقہ بلغاء کے نزدیک نہایت بلیغ ہے اور تعلیم و تفہیم میں غایت درجہ معین ہے اور ابو حیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اس سورت میں تین مرتبہ "یا بنی اسرائیل"، کے معزز خطاب سے مخاطب فرمایا اور اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے انکو اپنے خطاب سے مشرف اور سرفراز فرمایا اور اس نسبت کو یاد دلا کر شکر اور اطاعت کی دعوت دی لیکن بنی اسرائیل نے جب اس نداء اور خطاب کے شرف کو ملحوظ نہ رکھا تو حق تعالےٰ نے ان سے اعراض فرمایا اور تین مرتبہ کے بعد انکو مخاطب نہیں بنایا چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل پھر ایکبار تم کو خطاب کرتے ہیں اور یہ تیسری بار ہے اب اسکے بعد ہم تم کو مخاطب نہ بنائیں گے وہ آخری خطاب یہ ہے کہ میری نعمتوں کو اس حیثیت سے یاد کرو کہ وہ میرا عطیہ تھیں۔ میری نسبت کے شرف اور عزت کو دیکھو اور یاد کرو اور پھر اس حیثیت کو دیکھو کہ اس نعمت کا میں نے تم پر محض اپنی مہربانی سے انعام کیا تھا۔ ذرہ برابر تمہارا استحقاق نہ تھا اور یاد کرو اس امر کو کہ میں نے تم کو محض اپنے فضل سے سارے جہانوں پر فضیلت اور بزرگی دی تھی۔ یہ بزرگی میرا عطیہ تھا تمہاری ذاتی شئی نہ تھی کہ تم سے جدا نہ ہوسکے۔ تم اس غرہ میں نہ رہنا کہ یہ بزرگی تم سے چھینی نہیں جاسکتی۔ اگر اس فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو ہمارے رسول کی اطاعت کرو اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں کوئی کسی کی طرف سے کام نہ آئے گا اور ایک نفس کی دوسرے نفس کی طرف نسبت بدون ایمان کے کارآمد نہ ہوگی اور نہ اسکی طرف سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا کہ جو رہائی کا سبب بن سکے اور نہ بدون ایمان کے کوئی شفاعت اور سفارش نفع دے گی البتہ انبیاء اور اولیاء کی شفاعت سے اہل ایمان کو نفع ہوگا اور نہ ان لوگوں کی کوئی مدد کی جائے گی اس لیے کہ نصرت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے مرسلین اور اہل ایمان سے کیا ہے۔ کما قال تعالےٰ۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْھَادُ کافروں سے وعدہ نہیں۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ
اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں پھر اس نے وہ پوری کیں

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ
فرمایا میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا   بولا اور میری

ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾
اولاد میں بھی کہا نہیں پہنچتا میرا اقرار بے انصافوں کو

قصۂ کامیابی ابراہیم خلیل علیہ السلام در امتحان خداوندِ جلیل وتحویلِ کلام از ذکرِ بنی اسرائیل بسوئے ذکرِ بنی اسمٰعیل علیہ السلام

قال تعالیٰ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ ... الیٰ .. قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝

(ربط) بنی اسرائیل اس بات پر مغرور تھے کہ ہم اہلِ کتاب اور اہلِ علم اور اولادِ ابراہیم ہیں اس لیے ہم ہی سب کے متبوع اور مقتدا اور پیشوا اور امام ہیں۔ امامت اور سیادت ہمارے ہی گھر میں رہے گی۔ ہمیں کسی کے اتباع کی کیا ضرورت۔ اسکے جواب میں حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم کا قصہ ذکر فرمایا جس سے چند امور کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اوّل یہ کہ امام اور مقتدا وہی ہو سکتا ہے جو ظالم اور فاسق نہ ہو۔ اور تمہارا کفر اور ظلم خوب واضح ہو چکا ہے۔ ظالم اور فاسق ہو کر امامت اور متبوعیت کا خیال سودائے خام ہے امامت اور متبوعیت کا مرتبہ جب ہی ملتا ہے کہ جب اللہ کے امتحان میں کامیاب اور درست نکلے دومؔ یہ بتلانا ہے کہ خانہ کعبہ جو مسلمانوں کا قبلہ ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے اس کی فضیلت اور بزرگی میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ تاکہ گزشتہ رکوع میں جو یہود کا بعض احکام کے نسخ خصوصاً تحویلِ قبلہ پر جو اعتراض تھا جسکا مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ۔ میں کافی وشافی جواب گزر چکا۔ اُس اعتراض کا قلع قمع ہو جائے چونکہ تحویلِ قبلہ کے مسئلہ کا اعظم ارکانِ اسلام سے خاص تعلق ہے اس لیے اس بارہ میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ مفصل کلام کیا اوّل بانیٔ کعبہ کی فضیلت اور پھر انکی امامت اور پھر خانہ کعبہ کی فضیلت اور پھر اس کی تحویل کی حکمتیں بیان کیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ نبی آخر الزمان کی ملت اور قبلہ وہی ہے جو حضرت ابراہیم کا تھا۔ سومؔ یہ کہ ملّتِ اسلام وہی ملّتِ ابراہیمی ہے۔ چہارمؔ یہ کہ امت مسلمہ

اور نبی آخر الزمانؐ کے ظہور اور بعثت کی دعا سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی ۔ لہذا حضرت ابراہیمؑ کے طریقہ پر وہی شخص ہو سکتا ہے جو ملت اسلام کو قبول کرے اور نبی آخر الزمان پر ایمان لائے اور خانہ کعبہ کو اپنا قبلہ سمجھے ۔ پنجم یہ کہ یہ خیال کرنا کہ نبی آخر الزمان ہمارے خاندان سے نہیں اس لیے ہم ان پر ایمان نہیں لائیں گے یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے ایک اسحٰق علیہ السلام جن کے بیٹے اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام ہیں ایک مدت تک نبوت اور فضیلت حضرت اسحٰقؑ اور اسرائیل کی اولاد میں رہی اب وہ فضیلت حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کو پہنچی اور وہ نعمت تفضیل جس سے بنی اسرائیل کو سرفراز فرمایا تھا اب وہ بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہوئی اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دونوں ہی بیٹوں کے لیے برکت کی دعا کی تھی ۔ جس طرح اسحٰق علیہ السلام اور انکی اولاد کے لیے برکت کی دعا مانگی تھی اور اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے بھی برکت کی دعا مانگی تھی ۔ جیساکے توریت کے سفر پیدائش باب ۱۷ میں ہے ۔

”اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا“ انتہیٰ ۔

پس تم کو چاہیئے کہ اب اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ جو ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کی اولاد میں سے ہے اور اسکا ظہور اور اسکی بعثت دعاء ابراہیمی کی برکت اور ثمرہ ہے اور اس نبی پر ایمان لاکر امت مسلمہ میں داخل ہو جاؤ اور دل وجان سے اسکی اطاعت کرو تاکہ تم کو بھی بقدر اطاعت اس برکت میں سے کچھ حصہ ملے ۔ اور ابراہیم خلیل اللہ کی طرح اسلام اور اطاعت اور وفاداری اور محبت اور جانثاری کا داغ اپنے جسم پر لگاؤ یعنی ختنہ کراؤ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کرائی تھی ۔ توریت میں ہے کہ ختنہ اللہ کا داغ ہے جس طرح شاہی گھوڑوں پر داغ ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے خلیل اور اسکی اولاد کے لیے ختنہ کا داغ تجویز فرمایا ۔ اور قوت شہویہ اور بہیمیہ کے محل پر ختنہ کے داغ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ عضو سرکاری داغ سے داغی ہے بغیر سرکاری اجازت کے کسی مصرف میں اسکا استعمال جائز نہیں اور موئے لب کٹوانا اور ناخن کتروانا اور موئے بغل لینا اور مضمضہ اور استنشاق کرنا وغیر ذالک یہ بھی اسلام یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے داغ ہیں ۔ لہذا اے بنی اسرائیل اگر تم نعمتِ تفضیل میں سے حصہ لینا چاہتے ہو تو اب اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ کہ جو بنی اسمعیل میں سے دعائے ابراہیمی کے مطابق مبعوث ہوا ہے ۔ بنی اسرائیل کی تفضیل کا دور دورہ ختم ہو گیا اب تا قیامت بنی اسمٰعیل کی تفضیل کا دور دورہ رہے گا چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ابراہیم کو اسکے پروردگار نے چند باتوں سے آزمایا ۔ ابراہیم کی یہ آزمائش بھی رب کریم کی طرف سے تربیت تھی ۔ ابراہیم کے پروردگار نے ابتدا ہی سے ابراہیم کی طرح طرح سے تربیت کی ۔ طفولیت میں رُشد عطا کیا اور پھر مرتبۂ نبوت وخلت تک پہنچایا ۔ یہاں تک کہ بطور آزمائش انکو چند باتوں کا حکم دیا تاکہ ملائکۂ علوی اور سفلی کے سامنے انکا فضل وکمال اور حسن استعداد اور کمال قابلیت

اور اہلیت ظاہر ہو جائے اور یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ جو مرتبہ ہم ان کو عطا کرنا چاہتے ہیں یہ اس مرتبہ کے لائق اور اہل ہیں حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ سنت مستمرہ ہے کہ محض اپنے علم کی بنا پر کسی کو منصب اور مرتبہ نہیں عطا فرماتے جب تک کہ اسکی استعداد اور قابلیت اور اسکا استحقاق علی رؤس الاشہاد ظاہر نہ ہو جائے جیسا کہ آدم علیہ السلام کے قصہ میں پیش آیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انکے فضل اور کمال اور استعداد قابلیت کے ظاہر کرنے کے لیے چند باتوں سے ان کا امتحان فرمایا پس ابراہیم دل وجان سے کمال مسرت وانبساط کے ساتھ بلا کمی وبیشی کے ان تمام باتوں کو بتمام وکمال بجا لائے۔ جس سے انکی قوت علمیہ اور عملیہ کا کمال اور روح اور فطرت کی صفائی اور نورانیت اور ظاہر و باطن کی طہارت و نظافت خوب واضح ہوگئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم میں تجھ کو اسکے صلہ میں تمام لوگوں کا امام اور پیشوا بناؤں گا کہ تمام لوگ تیری پیروی کریں اور تیرا اتباع حقانیت کی دلیل ہو اور تیری مخالفت گمراہی کی دلیل ہو اور تیری ملت تمام عالم کے لیے بمنزلہ دستور اساسی کے ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا یہود اور نصاریٰ اور مشرکین عرب اور مسلمان سب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں۔ عرض کیا کہ اے پروردگار اور میری اولاد میں سے ہر زمانہ میں کوئی امام رہے زمین کسی وقت بھی میرے سلسلۂ امامت سے خالی نہ رہے غرض یہ تھی کہ تو نے مجھ کو تمام لوگوں کا امام بنایا اور قیامت تک میری بقاء عادۃً ممکن نہیں اس لیے بقائے امامت کی صورت یہ ہے کہ یہ منصب عظیم قیامت تک میری نسل میں باقی رہے اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں نے تمہاری یہ دعا قبول کی اور تمہاری ہی اولاد میں پیغمبری اور کتاب رہے گی جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں ہے۔ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ۔ مگر یہ سنائے دیتا ہوں کہ یہ ہر زمانہ میں ممکن نہ ہوگا۔ بعض زمانوں میں تمہاری تمام نسل اور اولاد ظالم ہوگی اور میرا یہ منصب امامت ظالموں اور فاسقوں کو نہیں دیا جاتا اس لیے کہ اس منصب کے لیے عدالت اور تقوی شرط ہے۔ اور اس وقت کے یہود اور نصاریٰ اشد انواع ظلم کے مرتکب ہیں شرک اور گوسالہ پرستی اور تحریف توریت وانجیل اور قتل انبیاء اللہ وغیرہ وغیرہ میں مبتلا ہیں۔ منصب امامت کی ان میں بالکل اہلیت نہیں اور جو ان کو باوجود ظالم ہونے کے اپنا امام بنائے وہ خود ظالم ہے۔ کما قال تعالیٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ۔

فائدہ جاننا چاہیئے کہ ظلم اور فسق کے مقابلہ میں عدالت اور تقویٰ ہے نہ کہ عصمت بمعنی عدم الخطاء فی الفہم وامتناع صدور معصیت اور امامت کے لیے عدالت اور تقوی شرط ہے نہ کہ عصمت۔ لہٰذا اس آیت سے فرقہ امامیہ کا عصمت ائمہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں اور نہج البلاغت میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے نص صریح موجود ہے۔ لا بد للناس من امیر بر او فاجر یعمل فی امرتہ المومن و یستمع الکافر و یا من فیہ السبل۔ الخ

اقوالِ مفسرین در تفسیر کلماتِ ابتلاء

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جن کلمات سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا وہ حسب ذیل ہیں۔ (۱) اپنی قوم سے مفارقت کرنا اور برارت یعنی کفر کی وجہ سے ان سے برارت اور بیزاری اور قطع تعلق کرنا (۲) خدا کے لیے مناظرہ (۳) آگ میں ڈالے جانے پر صبر کرنا (۴) وطن سے ہجرت کرنا اور مجمع عشائر واقارب کو چھوڑ کر نکل جانا (۵) مہمان نوازی (۶) ذبح ولد پر تیار ہو جانا اخرجہ ابن اسحٰق وابن ابی حاتم عن ابن عباس (درمنثور ص ۱۱۱ ج ۱) اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ کلمات جن سے اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم کو آزمایا وہ دس خصال فطرت ہیں پانچ تو ان میں سے سر میں ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) مونچھیں کتروانا (۲) مضمضہ یعنی کلی کرنا (۳) استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا (۴) مسواک کرنا۔ (۵) سر میں مانگ نکالنا اور پانچ خصلتیں باقی بدن کے متعلق ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) ناخن ترشوانا (۲) بغل کے بال لینا (۳) موئے زیر ناف مونڈنا (۴) ختنہ کرنا (۵) بول وبراز کی جگہ کو پانی سے دھونا یعنی پانی سے استنجا کرنا اور ایک روایت میں غسل جمعہ اور طواف بیت اللہ اور سعی مابین الصفا والمروہ اور رمی جمار اور طواف افاضہ کا ذکر ہے اور صحیح مسلم میں عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں۔

(۱) مونچھوں کا کتروانا اور (۲) ڈاڑھی کا بڑھانا اور (۳) مسواک کرنا اور (۴) ناک میں پانی ڈالنا اور (۵) ناخنوں کا کتروانا اور (۶) براجم یعنی جوڑوں کا دھونا اور (۷) بغل کے بال لینا اور (۸) موئے زیر ناف کا حلق کرنا اور (۹) پانی سے استنجا کرنا راوی کہتے ہیں کہ دسویں خصلت میں بھول گیا شاید وہ مضمضہ ہو اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ کلمات سے وہ تیس[۳۰] خصلتیں مراد ہیں کہ جو شرائع اسلام اور سہام اسلام کے نام سے موسوم ہیں دس ان میں سے سورۂ برارت[۱] میں مذکور ہیں توبہ[۱]۔ عبادت[۲] حمد[۳] وثناء۔ سیاحت[۴]۔ رکوع[۵]۔ سجود[۶]۔ امر بالمعروف[۷] ونہی عن المنکر[۸]۔ محافظہ حدود[۹] وایمان[۱۰] اور دس ان میں سے سورۂ[۲]

---

[۱] سورۂ برارت کی آیتیں یہ ہیں التائبون العٰبدون الحامدون السّآئحون الراکعون السّاجدون الاٰمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحٰفظون لحدود اللہ ط وبشر المؤمنین ط

[۲] سورۂ احزاب کی آیت یہ ہے۔ اِنّ المسلمین و المسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والصابرین والصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات والحافظین فروجھم والحافظات والذّاکرین اللہ کثیرا والذاکرات۔

احزاب میں مذکور ہیں۔ اسلام[۱]۔ ایمان[۲]۔ قنوت[۳]۔ صدق[۴]۔ صبر[۵]۔ خشوع[۶]۔ صدقہ[۷] و نیاز۔ روزہ[۸] رکھنا۔ شرمگاہ کی حفاظت[۹] کثرۃ[۱۰] ذکر اللہ اور دس خصلتیں ان میں سے سورۂ[۱] مؤمنون اور سال[۲] سائل میں مذکور ہیں۔ ایمان[۱] بیوم الجزاء، خوف[۲] وخشیت از عذاب خداوندی خشوع[۳] نماز۔ محافظت[۴] آداب وسنن نماز لغویات[۵] سے اعراض واحتراز۔ ادائے[۶] زکوٰۃ بطیب خاطر۔ غیر منکوحہ[۷] اور غیر مملوکہ سے شرمگاہ کی حفاظت ایفائے[۸] عہد ادائے امانت[۹] اور ادائے شہادت[۱۰] کلمات کی تفسیر میں اس کے علاوہ اور بھی کچھ اقوال ہیں۔ جو تفسیر درمنثور کی مراجعت سے معلوم ہو سکتے ہیں اور آیت قرآنیہ میں لفظ کلمات سب کو شامل ہے جائز ہے کہ سب مراد ہوں یا بعض مراد ہوں لیکن ایک ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے مختلف روایات کا آنا اس سے عموم ہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ

اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ اور

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا

کر رکھو جہاں کھڑا ہوا ابراہیم نماز کی جگہ اور کہدیا ہم

إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ

نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک کر رکھو گھر میرا واسطے طواف والوں کے

[۱] اور سورۂ مومنون کی آیت یہ ہے قد افلح المؤمنون الّذین ھم فی صلاتھم خاشعون والذین ھم عن اللغو معرضون والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذٰلک فاولٰئک ھم العادون والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون والذین ھم علی صلوٰتھم یحافظون الآیات

[۲] اور سال سائل کی آیتیں یہ ہیں۔ الذین ھم علی صلوٰتھم دائمون والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم والذین یصدقون بیوم الدین والذین ھم من عذاب ربھم مشفقون ان عذاب ربھم غیر مامون والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک ھم العٰدون والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون والذین ھم بشھاداتھم قائمون والذین ھم علیٰ صلاتھم یحافظون۔ ۱۲ منہ

وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور اعتکاف والوں کے اور رکوع اور سجدے والوں کے

قصہ بنائے خانہ تجلّی آشیانہ و فضائل قبلۂ اسلام و تلقین آداب بیتِ حرام

قال تعالیٰ۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ... الیٰ.... وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ط گزشتہ آیات میں ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور فضیلت کو بیان فرمایا اور ظاہر ہے کہ منصب امامت اور امامت کا لقب۔ صاحب قبلہ ہونے کی طرف مشیر ہے اس لیے آئندہ آیات میں قبلۂ ابراہیمی کا ذکر فرماتے ہیں کہ یہ خانہ تجلی آشیانہ وہی گھر ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیل علیہ السلام کی شرکت اور معیت میں بنایا تھا اور اسی معبد کے ارد گرد اسمٰعیل اور اسکی ذریت کو آباد کیا اور طرح طرح کی دعائیں کیں اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل متنبہ ہو جائیں کہ یہ نبی اُمّی خاندان ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے ہے اور یہ خانہ کعبہ جو مسلمانوں کا قبلہ ہے یہ وہی معبد معظم اور سجدہ گاہ محترم ہے جس کے بانی اور معمار امام امم اور فخر عالم ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور اسمٰعیل ذبیح اللہ ان کے معین و مددگار اور شریک کار رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس علم کے بعد۔ بنی اسرائیل کو بنی اسمٰعیل کی تفضیل اور قبلۂ اسلام کی فضیلت میں کوئی شبہ نہ رہے گا اور اب آئندہ تحویل قبلہ کے بارے میں زبان طعن نہ کھولیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل یہ تو تم کو معلوم ہو گیا کہ منصب امامت ظالم اور فاسق کو نہیں ملتا۔ دینی منصب اسی کو ملتا ہے جو ابراہیم کے طریقہ پر چلے اور اگر تم کو خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کے حج مقرر کرنے میں شبہ ہے کہ حج بالکل ایک لغو حرکت ہے جو عرب کے جاہلوں کا طریقہ ہے حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ نہیں تو اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو مرجع خلائق بنایا کہ لوگ اطراف عالم سے بقصد احترام احرام باندھ کر اس گھر کی زیارت اور طواف کے لیے رجوع کریں تاکہ اہل ایمان کے عظیم اجتماع سے ایک خاص نورانیت پیدا ہو جس سے ہر ایک مستفید ہو جس طرح بہت سے چراغوں کے جمع ہو جانے سے بہیئت اجتماعیہ ہر ایک کا نور اضعافاً مضاعفہ ہو جاتا ہے جمعہ اور پنجگانہ نماز جماعت میں ایک شہر اور ایک محلہ کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے اور حج کے اجتماع میں اقطار عالم کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے۔

ف اور جائز ہے کہ مثابۃً کو بجائے ثوب بمعنی رجوع کے ثواب سے مشتق مانیں یعنی لوگوں کے لیے ثواب حاصل کرنے کی جگہ بنائی کہ حج اور عمرہ کر کے ثواب حاصل کریں۔ ایک نماز پڑھیں تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب پائیں اور جماعت سے پڑھیں تو ستائیس لاکھ کا ثواب پائیں اور ہمیشہ کے لیے اس گھر کو خاص طور پر مقام امن بنایا کہ جو وہاں داخل ہو وہ امن سے ہو جائے اور ہم نے یہ حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور اس جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو تاکہ برکت حاصل ہو۔

ف مقام ابراہیم ایک خاص پتھر کا نام ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو بنایا اس پتھر پر حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کے نشان تھے لوگوں کے ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے وہ نشان اب معلوم نہیں ہوتے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کی اذان دی کما قال تعالیٰ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ الآیہ ۔ اور یہ پتھر عہد نبوی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خانہ کعبہ سے متصل تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب سیلاب آیا تو یہ پتھر بہ گیا حضرت عمرؓ نے اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھدیا اور اسکے گرد پتھر و نکی دیوار چن دی چنانچہ وہ پتھر اب تک اسی جگہ میں محفوظ ہے اور اس کے اردگرد جالیاں بنی ہوئی ہیں اور بنائے کعبہ کے وقت ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا جو مشابہ عہد کے تھا کہ میرے اس مبارک گھر کو ہر قسم کی ناپاکیوں سے پاک رکھنا طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے ۔ یعنی نماز پڑھنے والوں کے لیے اس کو پاک و صاف رکھنا ۔

نکتہ طواف اور اعتکاف چونکہ دو عمل جداگانہ ہیں ایک دوسرے پر موقوف نہیں اس لیے طواف اور اعتکاف کو بذریعہ واؤ عاطفہ ذکر فرمایا اور رکوع اور سجود دونوں مل کر ایک عبادت ہیں الگ الگ عبادت نہیں اس لیے رکوع اور سجود کو بدون عطف ذکر فرمایا ۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا

اور جب کہا ابراہیم نے اے رب کر اس کو شہر امن کا

وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ

اور روزی دے اسکے لوگوں کو میوے جو کوئی ان میں یقین لاوے

بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ

اللہ پر اور پچھلے دن پر فرمایا اور جو کوئی منکر ہے

فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ

اس کو بھی فائدہ دوں گا تھوڑے دنوں پھر اسکو قید کر بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں

وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور بُری جگہ پہنچ ہے

دُعائے ابراہیمؑ برائے حرم وساکنانِ حرم

قال تعالیٰ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا... الیٰ... وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

(ربط) جب خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کا مکانِ تعظیم اور معبد ابراہیمؑ ہونا بتلا چکے تو آئندہ اس شہر اور اسکے ساکنین کے حق میں حضرت ابراہیم کی دعائیں ذکر فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب حضرت ابراہیم نے اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ بنانے کا پختہ ارادہ فرمایا تو یہ دعا کی کہ اے پروردگار اس لق و دق صحرا کو آباد شہر اور پرامن بنا دے کیونکہ رسمِ حج کی بقا بدون شہر کی آبادی کے ممکن نہیں اور شہر کی آبادی بدون امن کے باقی نہیں رہ سکتی۔ بدامنی سے شہر ویران ہو جاتا ہے اور اس شہر کے ساکنین کو قسم قسم کے پھل اور میوے عطا فرما اس لیے کہ ساکنان شہر کی آبادی۔ رزق پر موقوف ہے بغیر رزق کے کوئی باقی اور زندہ نہیں رہ سکتا اور رزق کی درخواست میں ظالموں اور نافرمانوں کے لیے نہیں کرتا بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے رزق طلب کرتا ہوں جو اس شہر کے رہنے والوں میں سے اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق کو امامت پر قیاس مت کرو۔ امامت ایک دینی منصب ہے ظالم اس کا مستحق اور اہل نہیں اور رزقِ دنیوی۔ ایسی شئی ہے جو عام ہے میں رب العالمین ہوں سب کا رازق ہوں۔ مومن کو بھی ثمرات سے رزق دوں گا اور کافر کو بھی دنیا میں رزق دوں گا۔ اور چونکہ یہ کافر ہے اس لیے چند روز یعنی زندگی تک اسکو دنیاوی منافع سے خوب متمتع اور بہرہ مند کرتا رہوں گا اور پھر اسکو لاچار اور بے بس بنا کر کشاں کشاں عذاب نار تک پہنچاؤں گا اور بے شک دوزخ بہت ہی بُری جگہ ہے دنیا میں کوئی مکان اگر ایک طرف سے بُرا ہوتا ہے تو دوسری طرف سے اچھا بھی ہوتا ہے لیکن وہ دوزخ ایسا مکان ہے جو کسی اعتبار سے بھی اچھا نہیں ہر طرح سے بُرا ہی بُرا ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

اور جب اٹھانے لگا ابراہیم بنیادیں اس گھر کی اور

اِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ

اسمٰعیل اے رب ہمارے قبول کر ہم سے تو ہی ہے سنتا

الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷

جانتا

دعاء ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام برائے قبولیت خدمت تعمیر بیت اللہ

قال تعالیٰ۔ وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ ... الیٰ ... اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

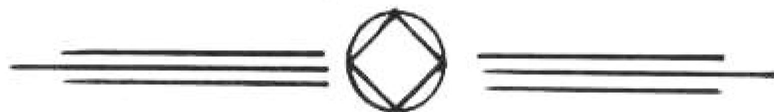
اور اس وقت کو بھی یاد کرو کہ جب ابراہیم خود اپنے ہاتھ سے اس گھر کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے یعنی اس پر تعمیر کرتے تھے اور دیواریں چنتے جاتے تھے اور اسی طرح اسمٰعیل بھی اُن کے ساتھ بلند کرنے میں مشغول تھے۔ اور یہ دونوں بزرگ اس وقت نہایت عجز اور انکساری کے ساتھ یہ کہتے جاتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار اپنے فضل سے ہماری اس محنت اور خدمت کو قبول فرما تحقیق تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے اور تو ہی ہماری نیت اور ہمارے ذوق وشوق کو جاننے والا ہے محض اپنے لطف و عنایت سے اپنے عاشقان جان نثار کی اس سعی کو مشکور فرما۔

ف (۱) قبول اور تقبل میں یہ فرق ہے کہ جو چیز لائق پذیرائی ہو۔ وہاں لفظ قبول استعمال کرتے ہیں اور جو چیز ناقص ہو اور قابل پذیرائی نہ ہو وہاں لفظ تقبل استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ لفظ تقبل باب تفعل سے ہونے کی وجہ سے تکلف پر دلالت کرتا ہے اور تکلف قبول اس بات کو مقتضی ہے کہ وہ چیز لائق قبول نہ ہو۔ پس اس مقام پر لفظ تقبل کا استعمال۔ غایت عجز اور کمال تواضع پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ مقبول ہو لیکن اگر تیرے لطف و عنایت اور فضل و رحمت سے قبول ہو جائے تو یہ تیرا محض جود و کرم ہے۔ ؎

گرچہ یہ ھدیہ نہ میرا قابل منظور ہے پر جو ہو مقبول کیا رحمت سے تیری دور ہے

اور اگر بالفرض کوئی عمل قابل قبول بھی ہو تب بھی حق تعالیٰ کے ذمہ اسکا قبول کرنا واجب نہیں اس لیے کہ قبولیت کے لیے مستقل درخواست چاہیئے۔ اہلسنت والجماعت کا یہی مذہب ہے معتزلہ کے نزدیک ایسے عمل کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ واجب ہے معتزلہ نے جب بندہ کے افعال اختیاریہ کو بندہ کا مخلوق اور مملوک قرار دیا تو خالق کے ذمہ انکا قبول کرنا اور ان پر ثواب دینا واجب گردانا اور اپنی نادانی سے یہ نہ سمجھا کہ اس واجب الوجود پر کسی کا وجوب نہیں چلتا اور نہ اس پر کسی کا حق ہے اور خدا تعالیٰ کے سوا کون ہے جو اس پر کوئی شئی لازم اور واجب کر سکے۔

ف (۲) جاننا چاہیئے کہ بارگاہ خداوندی میں وہی عبادت اور خدمت مقبول ہے کہ جس کو کرنے والا دل و جان سے قابل قبول نہ سمجھے اور کرنے والے کی نظر اپنے عمل پر نہ ہو بلکہ اس کے لطف اور فضل پر ہو۔



رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ
اے رب ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری
ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا
اولاد میں بھی ایک امّت حکم بردار اپنی اور جتا ہم کو دستور حج کرنے کے
وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾
اور ہم کو معاف کر تو ہی ہے اصل معاف کرنے والا مہربان
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا
اے رب ہمارے اور اٹھا ان میں ایک رسول انہیں میں کا پڑھے ان
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
پر تیری آیتیں اور سکھا دے ان کو کتاب اور پکی باتیں
وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع
اور اُنکو سنوارے تو ہی ہے اصل زبردست حکمت والا

دُعاءِ ابراہیمی برائے وجود اُمّتِ مُسلمہ و قوم مُسلمانان و ظہور رسُولِ محترم از ساکنانِ حرم کہ صاحبِ قرآن و خاتم پیغمبراں باشد

قال تعالیٰ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ... الیٰ ... اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(ربط) ان دونوں بزرگوں نے اپنی فراست صادقہ اور نور نبوت سے یہ سمجھا کہ جب ہم کو ایسے خانہ تجلّی آشیانہ کی تعمیر کا حکم ہوا ہے تو لامحالہ اسکے ہمرنگ کسی ایسی عبادت کا بھی حکم ہونے والا ہے جو عشق اور محبت کا رنگ لیے ہوئے ہو۔ اور ان عبادتوں کا بجا لانے والا صورۃً اگرچہ انسان ہوگا مگر معنیً ہمرنگ ملائک ہوگا گویا کہ دربار خداوندی کا معاینہ اور مشاہدہ کر رہا ہے اور جس امت کے لیے اس گھر کو قبلہ بنایا جائے

گا اس کو ایسے جدید وضع کے کچھ احکام دیئے جائیں گے جنکے اسرار و حکم ظاہر نظر میں جلوہ گر نہ ہونگے ظاہر پرست انکو صورت پرستی پر محمول کریں گے اس لیے ان دونوں بزرگوں کو اندیشہ ہوا کہ مبادا ہماری ذریت اور اولاد ان جدید وضع کے احکام کے نزول پر اُن کے قبول میں کسی قسم کا توقف اور تردد کرے اس لیے جناب الٰہی میں تین دعائیں فرمائیں اوّل یہ کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ۔ (اے اللہ ہم کو اپنا مسلم اور حکم بردار بندہ بنا) دوسری دعا یہ فرمائی کہ اے اللہ ہماری ذریت میں ایک امت مسلمہ پیدا فرما یعنی ایسی امت اور ایسی قوم پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو اور نام بھی اس قوم کا مسلم اور مسلمان ہو یعنی صفت بھی اس کی اسلام یعنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ہو اور اسی نام یعنی اسلام سے پکاری جاتی ہو۔

تیسری دعا یہ فرمائی کہ اس امت مسلمہ میں ایک عظیم الشان رسول بھیج اور اس پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرما یعنی قرآن کریم اور پھر وہ رسول اس امت کو کتاب وسنت کی تعلیم دے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دعاؤں میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ یہ خانہ تجلی آشیانہ جس امت کا قبلہ ہوگا اس امت کا نام امت مسلمہ ہوگا جیساکہ سورۂ حج میں ہے۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ اور ملت اسلام اس امت کا مذہب ہوگا اور وہ عظیم الشان رسول جو ان میں مبعوث ہوگا وہ ساکنان حرم اور اسمٰعیل کی ذریت سے ہوگا اللہ تعالیٰ نے انکی دعائیں قبول فرمائیں اور بذریعہ وحی کے بتلادیا کہ جس اولوالعزم رسول کے پیدا ہونے کی تم دعا کر رہے ہو وہ آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور خاتم الانبیاء والمرسلین ہوگا اور ملت ابراہیمی کا متبع ہوگا اور اس کی امت کا نام امت مسلمہ ہوگا۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے بارگاہِ خداوندی میں بصد عجز و نیاز یہ عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا خاص اطاعت شعار اور فرمانبردار بنا کہ ہمارا ظاہر و باطن تیرے لیے مخصوص ہوجائے کہ اس میں تیرے سوا کسی اور کی گنجائش نہ رہے اور ہماری ذریت میں ایک امت مسلمہ یعنی ایک ایسی جماعت پیدا فرما کہ جو دل وجان سے تیری حکم بردار ہو اور قلب اسکا سلیم ہو اور مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے سالم اور محفوظ رہیں اور جب تو ان کو اپنے دربار کی حاضری کا حکم دے تو مجنونانہ اور عاشقانہ وضع کے ساتھ برہنہ سر لبیک کہتے ہوئے تیرے درِ دولت پر حاضر ہو جائیں اور اے پروردگار ہم کو ہماری عبادت اور دربار کی حاضری یعنی حج اور طواف کے مواقع بھی دکھلا دیجئے اور ان کے احکام اور آداب بھی ہم کو بتلا دیجئے تاکہ آداب عبودیت اور آداب دربار میں ہم سے کوئی تقصیر نہ ہو جائے اور اے پروردگار آخر ہم بشر ہیں سہو اور نسیان سے مرکب ہیں۔ ہم سے اگر آدابِ دربار میں کوئی سہو اور تقصیر ہو جائے تو ہم پر توجہ اور عنایت فرمانا اور ہماری تقصیر سے درگزر فرمانا بے شک آپ ہی بڑی توجہ اور عنایت فرمانے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں اور چونکہ ایک عظیم امت کا باوجود اختلاف آراء و عقول کے ایک مسلک اور ایک طریق پر بدون کسی مربی کے قائم رہنا عادۃً محال ہے اس لیے جناب الٰہی میں یہ عرض معروض کی کہ اے ہمارے پروردگار ان ساکنانِ حرم میں ایک عظیم الشان رسول بھیج جو اس امت مسلمہ کو اسلام کا طریقہ بتلائے اور وہ رسول ہم دونوں کی ذریت اور اولاد سے خارج نہ ہو بلکہ انہی میں سے ہو تاکہ دنیا اور آخرت

میں ہمارے لیے عزت اور شرف کا موجب ہو اور اس طرح قیامت تک میری امامت باقی رہے اس لیے کہ میری اولاد کی امامت میری ہی امامت ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ رسول انہی میں سے ہوگا تو لوگ اس کے مولد اور منشاء سے اور اس کے حسب اور نسب اور اسکی امانت اور دیانت اور اخلاق اور اس کی صورت اور سیرت سے بخوبی واقف ہونگے اور اس کے اتباع سے عار نہ کریں گے اور جب حق نبوت و رسالت کے ساتھ قرابت کی محبت اور شفقت بھی مل جائے گی تو اس رسول کی اعانت اور نصرت وحمایت اور اسکی شریعت کی ترویج اور اشاعت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے اس نبی کو اپنا سمجھ کر معاملہ کریں گے۔ اجنبی اور غیر کا معاملہ نہ کریں گے۔ اور رسول ایسا ہو کہ اس پر ایسی جامع کتاب نازل ہو کہ اولین اور آخرین میں اسکی نظیر نہ ہو اور پھر وہ رسول تیری اس کتاب کی آیتیں پڑھ کر انکو سنائے اس لیے کہ آیات کا پڑھ کر سنانا بغیر نزول کتاب کے ناممکن ہے۔ اور بعد ازاں وہ رسول انکو اس کتاب کے معانی سکھائے اور اسکے اسرار وحکم سے بھی آگاہ کرے تاکہ علم ظاہر اور علم باطن دونوں جمع ہو جائیں۔ تلاوت سے کتاب کے الفاظ اور کلمات کا علم ہوگا اور تعلیم وتفہیم سے اس کتاب کے معانی اور حقائق اور معارف معلوم ہونگے۔ حفاظ قرآن اور قراء اور مجودین کے سینے اور زبانیں اس کتاب الٰہی کے الفاظ کی حفاظت کریں گی اور علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کی زبانیں اور قلم اس کتاب کے معانی کی حفاظت کریں گے کہ کوئی ملحد اور زندیق اس میں کسی قسم کی معنوی تحریف بھی نہ کر سکے۔ اور وہ رسول اپنی ظاہری تعلیم وتربیت اور باطنی فیض صحبت سے اُن کے دلوں کو گناہوں کے زنگ اور کدورت سے پاک وصاف کر کے مثل آئینہ کے مجلّٰی اور مصفّٰی بنا دے کہ انوار وتجلیات کا عکس قبول کرنے لگیں اور حدیث میں جو العلماء ورثۃ الانبیاء آیا ہے اس کا صحیح مصداق وہی علماء ربانیین ہیں جو کتاب وسنت کی تعلیم کے ساتھ زنگ آلود نفوس کو صیقل کر کے مثل آئینہ کے بنا دیتے ہوں۔ بے شک تو ہی نہایت عزت والا اور نہایت حکمت والا ہے۔ تو بلا شبہ اس پر قادر ہے کہ تو ہماری اولاد میں ایسا عظیم الشان رسول بھیج کر لوگوں پر احسان فرمائے اور اسکو ایسی جامع کتاب اور جامع شریعت اور کامل دین عطاء فرمائے کہ اس کے بعد تا قیامت کسی نبی اور رسول کی ضرورت باقی نہ رہے۔ فقط گاہ بگاہ اسی کی تجدید کافی ہو جایا کرے۔ تفسیر ابن کثیر میں ابوالعالیہ سے منقول ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ جواب آیا۔

قد استجیب لک ھو کائن فی اخر الزمان۔ (تفسیر ابن کثیر)	تمہاری دعا قبول ہوئی اس شان کا نبی آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور یہی قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور اس آیت میں جو سید القراء ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ نبی خاتم الانبیاء ہوگا۔

وقرأ اُبَیٌّ وَابعَث فِیۡ اٰخِرِھِمۡ رَسُوۡلاً۔ (روح المعانی ص۳۴۶ ج ۱)	یعنی ابی بن کعبؓ کی قراءت میں ہے وابعث فی آخرہم رسولا۔

یعنی ان کے آخر میں ایک رسول بھیج معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نے جس رسول کی دعا مانگی تھی ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نبی آخری نبی ہو اللہ تعالیٰ نے اُن کی دُعا قبول فرمائی۔

اخرج احمد و الطبرانی و البیہقی عن ابی امامۃ قال قلت یا رسول اللہ ما بدء امرک قال دعوۃ ابی ابراھیم و بشری عیسیٰ و رأت امی انہ یخرج منھا نور اضاءت لہ قصور الشام (در منثور ص۱۲۹ ج۱)
(مُبَشِّرًا م بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ م بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ)

مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی نبوت کی ابتدا کس طرح سے ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا (رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلاً الآیۃ) کا مصداق ہوں سب سے پہلے ابراہیمؑ نے میری بعثت کی دعا کی۔ اور پھر میں اپنے بھائی عیسیٰ بن مریم کی بشارت ہوں کہ انہوں نے میری آمد کی بشارت دی۔ اور پھر میں اپنی ماں کا خواب ہوں کہ انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔

اور عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انی عند اللہ فی ام الکتاب لخاتم النبیین و ان ادم لمنجدل فی طینتہ و سانبئکم باول ذلک دعوۃ ابراھیم (الحدیث)

میں اللہ تعالیٰ کے یہاں لوح محفوظ میں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور آدم ہنوز مٹی اور گارے کے پتلے ہی میں تھے اور میری نبوت کی ابتدار ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے (مسند احمد وغیرہ در منثور ص۱۲۹)

معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس نبی اور رسول کے ظہور کی دعا کی تھی اس دعا کا مصداق خاتم النبیین سرورِ عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جنکے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں خاتم النبیین لکھے ہوئے تھے یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام نے آپکی بعثت کی دعا کی اور حضرت عیسیٰ نے خاتم الانبیا کی آمد کی بشارت دی۔

پیغام خدا نخست آدم آورد — انجام بشارت ابن مریم آورد
باجملہ رسل نامۂ بے خاتم بود — احمد برما نامہ و خاتم آورد

لطائف و معارف

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اگرچہ کبائر اور صغائر سے سب سے معصوم ہوتے ہیں مگر خداوند ذوالجلال کی عظمت اور جلال سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق ربوبیت اور حق عبودیت کسی سے ادا نہیں ہوسکتا اور جانتے ہیں کہ جو حق واجب تھا وہ ہم سے ادا نہ ہوسکا اس لیے بصد خشوع وخضوع خدا تعالٰے کو پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بارالٰہا تو ہمارے عجز اور قصور کو جانتا ہے ہمیں معاف کر اور تیرے حقوق میں ہم سے جو تقصیریں ہوئیں اُن سے درگزر کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ کہنا اسی قبیل سے تھا دنیا کے بادشاہوں اور ان کے خواص اور مقربین کے تعلقات پر نظر کرو عام رعایا کے لیے ایک عام قانون ہوتا ہے اور اس کی پابندی ان کے لیے کافی ہوتی ہے مگر خواص مقربین کے لیے ایک خاص قانون اور خاص بندشیں اور خاص ہدایتیں ہوتی ہیں۔ ع موسیا آداب دانا دیگر اند

خواص اور مقربین ہر وقت اپنے آقا اور ولی نعمت کے خوش رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

ع جن کے رتبے ہیں سوا اُنکی سوا مشکل ہے۔

یہی حال بلکہ اس سے ہزار درجہ بڑھ کر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خداوند ذوالجلال کے ساتھ ہے۔ اگرچہ خدا تعالٰے کے یہ سچے عاشقانِ باوفا اور محبّانِ باصفا اپنے محبوب حقیقی کے خوش رکھنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اللہ جیسے محبوب برحق کے حقوق کوئی عاشق کیا ادا کرسکتا ہے اس لیے حضرات انبیاء بصد عجز وزاری۔ بارگاہِ خداوندی میں یہ عرض کرتے ہیں وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بارِ خدایا ہم سے تیرے حقوق اور واجبات کے ادا کرنے میں تقصیر ہوئی ہم اپنے عجز اور ناتوانی کی وجہ سے تیرا حق ادا نہیں کرسکے تو ہم پر رحم فرما اور ہماری تقصیروں سے درگزر کر۔

یہ تو حضرات انبیاء کرام کی توبہ اور انابت کی عام وجہ تھی جو بیان ہوئی لیکن ابراہیم علیہ السلام کی زیر بحث دعا تُبْ عَلَيْنَا۔ کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ آپ نے یہ دعا صرف اپنے لیے اور اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام ہی کے لیے نہیں فرمائی تھی بلکہ اپنی تمام ذریت کو جو ہونے والی تھی اس کو بھی اس دعا میں شامل کرلیا تھا اس لیے یہ دعا مجموعی حیثیت سے سب کے حق میں ہوئی جیساکہ آیت کے سیاق اور لحاق سے ظاہر ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالٰے اعلم۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ

اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا مگر جو بیوقوف ہوا

نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ

اپنے جی سے اور ہم نے اس کو خاص کیا دنیا میں اور وہ

فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ

آخرت میں نیک ہے جب اس کو کہا اس

رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

کے رب نے حکم بردار ہو بولا میں حکم میں آیا جہان کے صاحب کے

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ

اور یہی وصیت کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب اے بیٹو

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا

اللہ نے چُن کر دیا ہے تم کو دین پھر نہ مرلیو مگر

وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ

مسلمانی پر کیا تم حاضر تھے جس وقت

حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا

پہنچی یعقوب کو موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم

تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ

کیا پوجو گے بعد میرے بولے ہم بندگی کریں گے تیرے رب

اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا

اور تیرے باپ دادوں کے رب کو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق وہی ایک

وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ

رب ہے اور ہم اسی کے حکم پر ہیں۔ یہ ایک جماعت

قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ

تھی گزر گئی ان کا ہے جو کما گئے اور تمہارا ہے جو تم کماؤ

وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

اور تم سے پوچھ نہیں ان کے کام کی۔

ترغیب وتاکید اتباع ملتہ ابراہیمی کہ عین توحید و عین ملّت اسلام است وفضائل ملّت اسلام

قال تعالیٰ۔ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ... الیٰ ... وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔

گزشتہ آیات میں اجمالاً حضرت ابراہیم کی ملّت کی طرف اشارہ تھا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ۔اور وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقہ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے پسند کیا اور اس کی دعا کی وہ طریقہ۔ طریقۂ اسلام ہے۔ اب آئندہ آیات میں اسکی تفصیل فرماتے ہیں کہ وہ ملتِ ابراہیم عینِ توحید اور عینِ اسلام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی دل وجان سے بے چون وچرا اطاعت کرنا اپنے آپ کو خدا کے حوالے اور سپرد کر دینا آخیر پارہ تک اسی ملت اسلام کے فضائل اور اسی کے اتباع کی ترغیب میں کلام چلا گیا ہے جس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب کا رد کرنا مقصود ہے کہ یہ سب حضرت ابراہیمؑ کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں اور پھر ان کے خلاف طریقہ پر چل رہے ہیں حالانکہ اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے اپنے لیے دعا مانگی اور اسی کی وصیّت کی اور اسی طرح حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ وہ کون شخص ہے کہ جو ابراہیم کی ملّت سے عدول اور انحراف کرے۔ حالانکہ وہ ملت تمام ملتوں سے افضل اور بہتر ہے اور صاحب ملت لوگوں کا امام اور پیشوا ہے اور سب سے پہلے اسی نے نہایت تضرع اور زاری سے امت مسلمہ کے وجود اور نبی آخر الزمانؐ کے ظہور کی دعا مانگی کہ جو امت مسلمہ کو اسلام کا طریقہ بتلائے تو ایسی بہتر ملّت کے اتباع سے کون اعراض اور انحراف کر سکتا ہے مگر وہی شخص کہ جو اپنے ہی نفس سے جاہل اور نادان ہو کہ یہ نہ سمجھتا ہو کہ کون سی ملت فطرت سلیمہ کے مناسب ہے اور کون سی غیر مناسب اور کون سی ملّت روح اور قلب کے لیے نافع ہے اور کون سی مضر۔ اور کس ملت کے قبول کرنے سے نفس

کے لیے کمالات کا دروازہ کھلتا ہے اور کس ملّت سے کمالات کا دروازہ بند ہوتا ہے اگر یہ سفیہ اپنے نفس سے بے خبر نہ ہوتا تو ملت ابراہیمی سے اعراض نہ کرتا اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم کو دنیا میں برگزیدہ بنایا اور اپنے مقبول بندوں میں سے اس کو منتخب کیا اور تمام کمالات روحانیہ سے اسکو مکمل کیا یعنی نبوت و رسالت اور ولایت و امامت ان کو عطا کی اور خلت کا خلعت ان کو پہنایا اور جو معبد انہوں نے تعمیر کیا اس کو قبلۂ عالم بنایا اور تحقیق آخرت میں وہ صالحین اور نیکو کاروں سے ہیں صلاح - فساد اور خلل کی ضد ہے - اور فساد اور خلل، معصیت اور غفلت سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر صلاح کے یہ معنی ہونگے کہ ان کا ظاہر و باطن ہر قسم کے فساد اور خلل سے بالکل پاک ہے اور اس جگہ صلاح سے صلاح کامل مراد ہے اور یہ آیت ماقبل کی دلیل ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ جو شخص خدا کا برگزیدہ اور منتخب بندہ ہو اور صلاح کامل کے ساتھ موصوف ہو اس کے طریقہ سے سوائے نادان کے کون اعراض کرے گا۔ آئندہ آیت میں اس ملت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے - یعنی اسلام ہے بلکہ یہی اسلام انکے برگزیدہ اور امام ہونے کا سبب ہے جبکہ ان کے پروردگار نے کہا کہ اے ابراہیم اسلام اختیار کر اور مسلم بن جا یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے اور سپرد کردے اور اپنی خواہش اور ارادہ کو اسکی رضا اور خوشنودی میں فنا کردے ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ میں نے اسلام اختیار کیا اور میں نے اپنے تمام کام رب العالمین کے سپرد کر دیئے اور اپنے نفس کو درمیان سے بالکل نکال لیا۔ ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

اب اس میں تعیین ہوگئی کہ وہ ملّت کیا ہے یعنی اسلام ہے جو تمام کمالات کا تخم اور تمام فضائل کی اصل ہے اخیر پارہ تک اسی اسلام کی فضیلت میں کلام چلا گیا۔

اور جب تک ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے اسی ملت پر قائم رہے اور جب وصال کا وقت آیا تو ابراہیم علیہ السلام نے سب بیٹوں کو جمع کرکے اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی جن میں حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ بھی تھے۔ اور پھر اسی طرح اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا اے میرے بیٹو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ دین اسلام پسند کیا ہے اسکے سوا کوئی دین مقبول نہیں پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم اسلام پر پختہ اور قائم ہو - یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت اور نصرانیت کی وصیت نہیں کی بلکہ ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ پس اے اہل کتاب تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت کی وصیت کی تھی اس کی نہ کوئی سند ہے اور نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی مشاہدہ - کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا کہ بتلاؤ میرے بعد کس چیز کی عبادت کروگے - سب نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ ہم صرف اس ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی آپ اور آپکے آباؤ اجداد ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق عبادت کرتے آئے یعنی ایک خدا کی عبادت

کریں گے اور ہم سب اسی ایک خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری پر قائم رہیں گے۔ غرض یہ کہ یہود کا یہ دعویٰ کہ یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی وصیت کی تھی محض افتراء ہے نہ اس کی کوئی سند ہے اور نہ تمہارا مشاہدہ۔

اور اے اہل کتاب اگرچہ تم ان بزرگوں کی اولاد ہو اور تم اس نسبت پر فخر اور ناز کرتے ہو لیکن یہ خدا کے برگزیدہ بندوں کی ایک جماعت تھی جو گزر گئی اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت تمکو وصیت کر گئی اس جماعت کے لیے وہ اعمال کام آئیں گے جو اس نے کیے اور تمہارے لیے تمہارے اعمال کام آئیں گے اور بدون اتباع کے محض بزرگوں کا انتساب تم کو نفع نہیں دے گا اور اگر بالفرض وہ بُرے عمل کرتے تھے تو تم سے انکے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا ہر شخص سے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔ غرض یہ کہ انہوں نے اگر کوئی گناہ کیا ہے تو تم سے اسکی باز پرس نہ ہوگی اور اگر انہوں نے نیک عمل کیے ہیں تو تم کو کوئی نفع نہیں۔ باپ کا کھانا اور پینا بیٹے کی بھوک اور پیاس کو دفع نہیں کر سکتا جب تک بیٹا خود نہ کھائے اور نہ پیئے۔

ع بندگی باید پیمبر زادگی درکار نیست

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ط

اور کہتے ہیں ہو جاؤ یہود یا نصاریٰ تو راہ پر آؤ

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ

تو کہہ نہیں بلکہ ہم نے پکڑی راہ ابراہیم کی جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا شریک

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

والوں میں

یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دینے والوں کو جواب

قال تعالیٰ۔ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا ... الیٰ ... وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

اور تعجب ہے کہ یہ اہل کتاب حضرت ابراہیم کو اپنا امام اور پیشوا بھی کہتے ہیں مگر ان کے اتباع اور ان کے طریقہ پر چلنے کو جب ہدایت نہیں سمجھتے بلکہ باعث ضلالت جانتے ہیں۔

اور یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی بن جاؤ ہدایت پا جاؤ گے اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ان کے جواب میں کہدیجیئے کہ ہم یہودی یا نصرانی نہیں بنیں گے بلکہ ہم تو ملت ابراہیمی پر قائم رہیں گے اور ابراہیم ہی کے طریقہ پر اور مسلک پر چلیں گے جن میں ذرہ برابر کجی نہ تھی وہ تو ماسوی اللہ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف مائل تھے اور کبھی بھی مشرکین میں سے نہیں ہوئے نہ قبل نبوت اور نہ بعد نبوت اور تم باوجودیکہ اتباعِ ابراہیمی کے مدعی ہونے کے کج راہی اور شرک میں مبتلا ہو۔

سلسلۂ کلام نہایت خوبی کے ساتھ چل رہا ہے یہودیوں کو جو اپنے حسب ونسب پر ناز تھا اس کی تردید فرمائی ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا جس میں حضرت ابراہیم کی امامت اور تعمیر کعبہ اور دعا کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالٰے نے اُن کی دعا قبول کی اور انکی دعا کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا جنکا قبلہ اور جنکی ملت اور جنکا دین وہی ہے جو حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا تھا اور ان سب نے اپنی اولاد کو اسی کی وصیت کی تھی کہ دین اسلام ہی پر مرنا۔ پھر تعجب ہے (کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جب تمہارے سامنے اسی ملت ابراہیم اور دین اسلام کو پیش کرتے ہیں تو تم اسے قبول نہیں کرتے اسکے سوا اور کیا وجہ ہے کہ تمہاری عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فائدۂ جلیلہ حق جل شانہٗ نے اس سلسلہ میں سات جگہ اسلام کا ذکر فرمایا۔ پہلا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ میں دوسرا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ تیسرا قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ چوتھے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں پانچویں وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ میں چھٹے وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ میں۔ ساتویں لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کرام کا مذہب اسلام ہے امم سابقہ میں جو لوگ اطاعت کرنے والے تھے ان کی صفت بھی یہی اسلام تھی مگر امت مسلمہ کا نام اور لقب حضورؐ ہی کی امت کو عطا کیا گیا پچھلی امتوں میں بھی اسلام لانے والے گزرے ہیں مگر اسلام انکا لقب نہ تھا صرف صفت تھی۔ یہ لقب صرف امت محمدیہ کو عطا کیا گیا ایک زمانہ میں دینِ حق کا لقب یہودیت رہا۔ اور ایک زمانہ میں عیسائیت اور نصرانیت رہا۔ صفت اسلام سب میں مشترک رہی سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار تھے مگر امت مسلمہ کا لقب خاص آپ ہی کی امت کو عطا کیا گیا۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کے غلام تو سب ہی ہیں مگر غلام کا نام ہی غلام رکھ دیا جائے تو صفت اور لقب دونوں جمع ہو جائیں گے۔ صفت بھی غلام۔ اور لقب اور نام بھی غلام۔ اور مثلاً جیسے سب اللہ کے بندے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ اپنا نام ہی عبداللہ اور اللہ بندہ رکھے تاکہ ہر وقت اسکی عبدیت اور غلامیت سے لذت حاصل کرتا رہے تو اس کی شان ہی دوسری ہے۔

اور یہ مبارک لقب سب سے پہلے ہمارے لیے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تجویز فرمایا جیساکہ سورۂ حج میں ہے مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ پس اس عظیم الشان لقب کا حق یہ ہے کہ ہم دل وجان سے اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بن جائیں محض لفظ مسلم

اور لفظ مؤمن پر قناعت نہ کریں ۔

میم وواؤ میم ونون تشریف نیست
لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست

فائدۂ دیگر جاننا چاہیئے کہ ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں (اوّل) اصول اور عقائد جیسے توحید و رسالت اور قیامت یہ چیزیں تمام انبیاء کرام میں متفق علیہ ہیں ان میں اختلاف ممکن نہیں اور نہ ان میں نسخ جاری ہوتا ہے (قسم دوم) قواعد کلیہ شریعت کہ جن کی طرف جزئیات اور فروع راجع ہوتے ہیں اور حکم میں اُن کلیات کا لحاظ رہتا ہے اور انہی قواعد کلیہ کا نام ملت ہے جس میں اختلاف بہت کم ہوتا ہے ملت محمدی اور ملت ابراہیمی انہی اصول اور قواعد کلیہ کے لحاظ سے موافق اور متحد ہیں ۔

(قسم سوم) احکام جزئیہ اور فروع ۔ جسکو شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں زمان اور مکان اور امم کے اختلاف سے شریعت کے احکام جزئیہ بدلتے رہے کما قال تعالیٰ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت تو ایک مگر شریعت ہر ایک کی جدا ہے اسکی مثال ایسی ہے کہ تمام حنفیہ امام ابوحنیفہؒ کو اپنا امام جانتے ہیں مگر باوجود اسکے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اور امام زفرؒ کبھی کبھی امام ابوحنیفہؒ کا خلاف بھی کرتے ہیں مگر قانون حنفی سے کسی حال میں خارج نہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے قواعد مقررہ سے باہر نہیں جاتے مثلاً قیاس جلی یا قیاس استحسان اور عموم بلویٰ کسی نہ کسی قاعدہ کے تحت میں اس جزئیہ کو درج کرتے ہیں ۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ

تم کہو ہم نے یقین کیا اللہ کو اور جو اترا ہم پر اور جو اترا

اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ

ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور

الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ

اسکی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو ملا

النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

سب نبیوں کو اپنے رب سے ہم فرق نہیں کرتے ایک میں

مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ
ان سب سے اور ہم اسی کے حکم پر ہیں۔ پھر اگر وہ بھی یقین لاویں

مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
جس طرح پر تم یقین لائے تو راہ پاویں اور اگر پھر جاویں تو اب

هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ
ہیں ضد پر سو اب کفایت ہے تیری طرف سے انکو اللہ اور وہی ہے

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ
سننا جانتا ہم نے لیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ

مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾
ہے اللہ سے بہتر اور ہم اسی کی بندگی پر ہیں

تعلیم طریقۂ ایمان

قال تعالیٰ۔ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ...... الیٰ ..... وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ کہدو کہ ہم یہودی اور نصرانی نہیں بلکہ ملت ابراہیمی کے متبع ہیں۔ آئندہ آیت میں طریقۂ ایمان کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں کہ اس طور پر اپنے ایمان کو ظاہر کرو کہ شریعت موسویہ اور شریعت عیسویہ کے کفر اور انکار کا ایہام نہ ہو لہذا جب تم اپنے ایمان کا اعلان کرو تو اس طرح کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر یعنی اس کے تمام اسماء وصفات پر اور اس کے تمام احکام پر اور اس کتاب اور شریعت پر ایمان لائے جو ہماری طرف بھیجی گئی اور ان تمام صحیفوں پر ایمان لائے کہ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور انکی اولاد کی طرف بھیجے گئے جو ان میں نبی ہوئے جیسے عزیر اور اشعیاہ اور یرمیاہ اور سمویل اور حزقیل علیہم السلام اور اس چیز پر بھی ایمان لائے کہ جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو دی گئی اور اجمالاً ہم ایمان لائے ان تمام صحیفوں پر اور شریعتوں اور احکام پر کہ جو تمام پیغمبروں کو پروردگار کی جانب سے دیئے گئے۔ اگرچہ ان میں بعض بعض سے افضل

ہیں لیکن ہم ایمان لانے میں کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں اور ہم تو خاص اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ سب انبیاء پر بلا تفریق ایمان رکھتے ہیں البتہ منسوخ شریعت کا اتباع نہیں کرتے صرف خاتم الانبیاء کا اتباع کرتے ہیں کہ جن کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔

تفریع بر مضمون سابق مع توبیخ و تقریع

جب یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام کی حقیقت یہ ہے اور ایمان کا طریقہ یہ ہے پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں کہ جس طرح تم ایمان لائے ہو یعنی بلا تفریق تمام انبیاء ورسل کی تصدیق کریں پس تحقیق یہ بھی ہدایت پا جائیں گے اور اگر روگردانی کرتے ہیں تو سمجھ لو یہ لوگ صرف مخالفت اور عداوت میں غرق ہیں آپ انکی عداوت اور مخالفت سے پریشان نہ ہوں عنقریب ہی اللہ تعالیٰ انکے شر سے آپکی کفایت کرے گا اور خود ہی اللہ تعالیٰ ان سے نمٹ لیگا تم فکر نہ کرو یہ مؤمنین سے حمایت وحفاظت بلکہ غلبہ اور نصرت کا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا بنو قریظہ کو قتل کرایا بنو نضیر کو جلا وطن کرایا اور نصاریٰ پر جزیہ لگایا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ اللہ کا وعدہ ہے اور آئندہ کی خبر ہے جو پورے طور پر ثابت ہوئی کہ چند ہی روز میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سر سے یہود اور نصاریٰ کے شر کو دفع کیا اور دین اسلام کے مقابلہ میں یہود و نصاریٰ مغلوب ہوئے اور اللہ کی پیشینگوئی پوری ہوئی اور اللہ تعالیٰ تو سب کی باتوں کو سنتا ہے اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔ دشمنوں کا کوئی کید اور مکر اس سے پوشیدہ نہیں اور یہ یہود اور نصاریٰ دن رات اس کوشش اور سازش میں ہیں کہ تم کو اپنے رنگ میں رنگ لیں۔ اے مسلمانو تم ان سے یہ کہدو کہ ہم کو تو اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کا رنگ ہمارے رگ وریشہ میں سرایت کرچکا ہے اور اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے جو اسکی طرف نظر کیجائے اور یہ رنگ ہم سے زائل نہیں ہوسکتا اس لیے کہ ہم خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں عبادت کی وجہ سے وہ رنگ اور پختہ ہو جاتا ہے اور اخلاص کی وجہ سے دوسرے رنگ کا اس پر کوئی دھبہ بھی نہیں آنے پاتا۔ عبادت اور اخلاص کی وجہ سے وہ زیادہ چمکتا جاتا ہے۔

جب آفتاب اسلام دنیا میں طلوع ہوا تو اس وقت یہود و نصاریٰ میں ایک رسم اصطباغ کی جاری تھی پہلے اس رسم کا رواج یہود میں ہوا اور پھر عیسائیوں نے بھی اس رسم کو جاری رکھا اور اب تک عیسائیوں میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے یا کوئی عیسائی بنتا ہے تو اسکو زرد پانی کے حوض میں غوطہ دیتے ہیں یا اس کے سر پر اس میں سے کچھ پانی ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب سچا عیسائی ہوگیا اسی رسم کا نام اصطباغ ہے جس کو آج کل بپتسمہ دینا کہتے ہیں چونکہ یہود اور نصاریٰ مسلمانوں سے

یہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ اس لیے گویا وہ انہیں اصطباغ کی دعوت دیتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت (صِبْغَةَ اللّٰهِ) نازل فرمائی اور مسلمانوں کو یہود اور نصاریٰ کی دعوت اصطباغ کا یوں جواب بتایا کہ ان سے کہدو کہ ہم تمہارا اصطباغ لے کر کیا کریں گے ہمیں تو اللہ کے دین کا رنگ کافی ہے اُس سے بڑھ کر اور بہتر اور کون سا رنگ ہو سکتا ہے اور تم لوگ حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ اور اپنا خداوند سمجھنے کی وجہ سے شرک کے ناپاک رنگ سے ملوث ہو تم اہلِ توحید اور اہلِ اخلاص کو کس رنگ کی دعوت دیتے ہو۔

فائدہ صبغۃ اللہ کے اعراب میں مفسرین کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے اور تقدیر کلام اس طرح ہے صبغنا اللہ صبغۃ جیسے وعد اللہ اور صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور معنی یہ ہیں وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا اور صَنَعَ اللّٰهُ صُنْعَهٗ علامہ زمخشری اور بیضاوی اور ابوحیان اور علامہ سیوطی نے اسی اعراب کو اختیار فرمایا اور ہمارا ترجمہ اور تفسیر اسی اعراب پر مبنی ہے دوسرا قول یہ ہے کہ منصوب علی الاغراء ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے الزموا صبغۃ اللہ یعنی اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو۔ اس تقدیر پر بھی آیت کے معنی نہایت لطیف ہونگے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ اے مسلمانو فقط تصدیق اور شہادت پر کفایت اور قناعت نہ کرو بلکہ اس سے ترقی کرو اور اپنے ظاہر و باطن کو اللہ کے رنگ سے رنگو اور وہ رنگ خداوند ذوالجلال کی اطاعت اور محبت اور رضا و تسلیم کا رنگ ہے جس سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔ جب کوئی شخص کسی کی مرضی کے اس درجہ تابع ہو جائے کہ اسکا کوئی حکم اس کو گراں نہ گزرے بلکہ کمال نشاط اور غایت رغبت و محبت سے اسکی تعمیل کی طرف شاداں و فرحاں دل وجان سے دوڑنے لگے تو محاورہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو فلاں کے رنگ میں رنگا ہوا ہے پس اے مسلمانو تم اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو اور بطور تحدیث بالنعمۃ یا بطور لذت و مسرت یا بطور تعریض اور اتمام محبت یہ کہتے رہو کہ ہم تو خالص اللہ ہی کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تمہاری طرح شرک میں مبتلا نہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ صبغۃ اللہ - ملۃ ابرٰھم حنیفًا۔ سے بدل ہے اور بالفاظ دیگر ملۃ ابرٰھم کی تفسیر ہے یعنی ملت ابراہیم اور ملت اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عجیب و غریب رنگ ہے جسکے مشاہدہ کے لیے آنکھ چاہیئے اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ صبغۃ اللہ سے مراد ختنہ ہے جو ملت ابراہیمی کا خاص شعار اور خاص رنگ ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ

کہہ اب کیا تم جھگڑتے ہو ہم سے اللہ میں اور وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہم کو

اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

عمل ہمارے اور تم کو عمل تمہارے اور ہم اسی کے ہیں نرے

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق

وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ

اور یعقوب اور اس کی اولاد یہود تھے یا نصاریٰ

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ

کہہ تم کو خبر زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے ظالم کون جس

كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

نے چھپائی گواہی جو تھی اس پاس اللہ کی اور اللہ بے خبر نہیں

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا

تمہارے کام سے وہ ایک جماعت تھی گزر گئی اُن کا ہوا

كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا

جو کما گئے اور تمہارا ہے جو تم کماؤ اور تم سے پوچھ نہیں

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶

ان کے کام کی

تلقین جواب از مجادلۂ اہل کتاب

قال تعالیٰ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ ... الیٰ ... وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

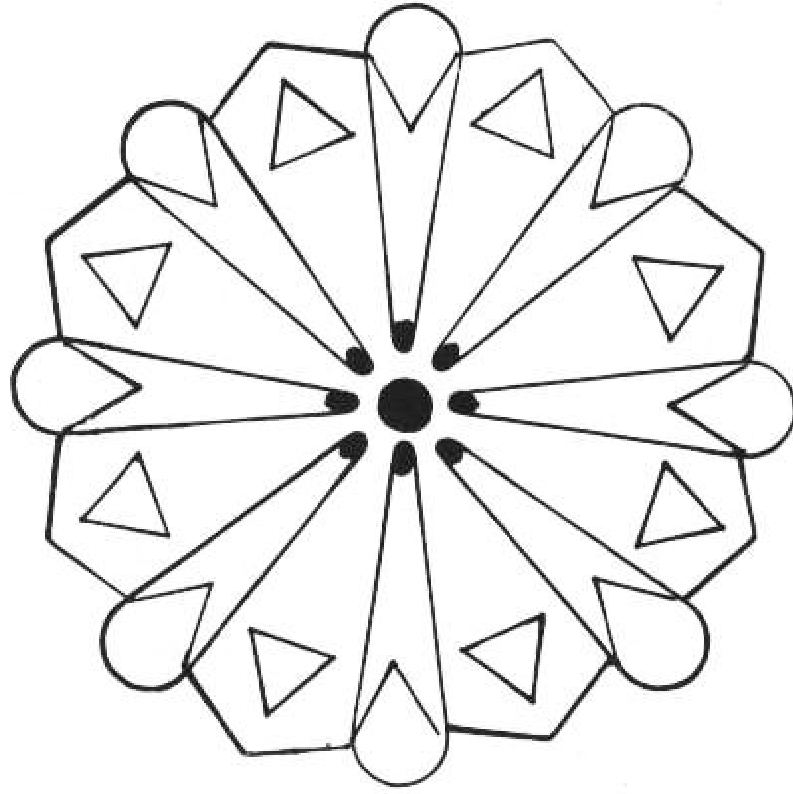
اور اگر اہل کتاب آپ سے اس بارہ میں مجادلہ کریں کہ ہم خدا کے رنگ کے ساتھ رنگین ہیں ہمارا دین اور ہماری کتاب تمہارے دین اور تمہاری کتاب سے مقدم ہے نبوت و رسالت ہمیشہ ہمارے ہی خاندان میں رہی اور ہم اللہ کے محبوب ہیں تو آپ انکے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارہ میں مجادلہ کیے چلے جاتے ہو۔ حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اسکی ربوبیت کسی کے ساتھ مخصوص نہیں سب کو عام ہے جو اسکے حکم کے مطابق طاعت اور عبادت کریگا وہ قبول ہوگی ورنہ رد۔ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں کہ سراسر اس کے حکم کے مطابق ہیں آخری نبیؐ کی زبانی جو آخری حکم نازل ہوا اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں کہ ناسخ کے نازل ہونے کے بعد منسوخ حکم اور محرّف شریعت پر چل رہے ہو اور تازہ اور محفوظ شریعت سے اعراض اور انحراف کر رہے ہو اور علاوہ ازیں ہمارے اور تمہارے درمیان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہم خالص اللہ ہی کے لیے عبادت کرنے والے ہیں اور تم جو کچھ کرتے ہو وہ تعصب اور نفسانیت اور دنیوی اغراض اور اپنی آبائی رسم کے باقی رکھنے کے لیے کرتے ہو بلکہ صریح شرک میں مبتلا ہو۔ حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا بتلاتے ہو۔ توحید اور اخلاص کا تم پر کوئی ہلکا سا نشان بھی نہیں۔ لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ سراسر غلط ہے تم تو سرتاپا شرک کے رنگ میں رنگے ہوئے ہو تمہارا رنگ تمہارے اعمال سے ظاہر ہے اور ہمارا رنگ ہمارے اعمال سے ظاہر ہے اور کیا تم اس آخری پیغام کی ضد اور اپنی منسوخ اور محرف شریعت کی پچ میں یہ کہتے ہو کہ تحقیق ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور ان کی اولاد یہودی اور نصرانی تھے حالانکہ یہ لوگ نزول توریت و انجیل اور یہودیت اور نصرانیت کے ظہور سے پہلے گزر چکے ہیں اور گزشتہ آیات میں ان حضرات کا ملت اسلام پر ہونا بخوبی واضح ہوچکا ہے آپ اُن کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے کہ جس نے یہ خبر دی ہے مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اب بتلاؤ تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ اور ظاہر ہے کہ اللہ سے زیادہ جاننے والا اور کون ہوسکتا ہے بلکہ نصوص توریت و انجیل اس پر شاہد ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی ملت حنفیت تھی۔ ختنہ اور حج بیت اللہ ان کا شعار تھا یہودیت اور نصرانیت کے خواص مثلاً ہفتہ اور اتوار کی تعظیم ان کی شریعت میں نہ تھی اور یہ سب کچھ انکو معلوم ہے مگر چھپاتے ہیں اور ایسے شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوسکتا ہے کہ جو ایسی شہادت کو چھپائے اور مخفی رکھے جو اس کے پاس محفوظ ہو اور اس کو خوب یاد ہو اور وہ شہادت اس کو من جانب اللہ پہنچی ہو اور اس کے اعلان اور اظہار کا وہ مامور ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں رسول آخر الزمان کے متعلق جو شہادتیں تمہاری کتابوں میں مذکور ہیں تمہارا ان واضح شہادتوں کو چھپانا اور نصوص توریت و انجیل میں تحریف اور تغیر و تبدل کرنا سب اللہ کی نظروں کے سامنے ہے اور تم اس پر غرہ نہ کرنا کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں یہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے

گئی اور مال ومتاع کی طرح تمہارے لیے اپنے اعمال صالحہ کا ذخیرہ چھوڑ کر نہیں گئی کہ جو بوقت ضرورت تمہارے کام آتے اس جماعت کے لیے اس کا کیا ہوا کام آئیگا اور تمہارے لیے تمہارا کیا ہوا کام آئے گا اور تم سے اُن کے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا لہٰذا جب تم کو ان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں تو پھر ان کے اعمال سے نفع کی امید رکھنا سفاہت اور نادانی ہے۔

فائدہ یہ آیت قریب ہی میں گذر چکی ہے تاکید اور مبالغہ کے لیے اس کو مکرر لائے کہ پھر کہہ دیتے ہیں کہ عمل کرو آباؤ اجداد کے بھروسہ پر نہ رہو۔ ے

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات والصلاۃ والسلام علی سید البریات وعلی الہ و اصحابہ و ازواجہ الطاہرات۔ مسلسلات و متواترات ۴ شوال المکرم یوم دوشنبہ ۱۳۶۹ھ مقام بہاول پور۔



سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کاہے پر پھر گئے مسلمان اپنے قبلہ سے

الَّتِیْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ

جس پر تھے تو کہہ اللہ کی ہے مشرق اور مغرب

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

چلاوے جس کو چاہے سیدھی راہ

اثبات فضیلت قبلۂ ابراہیمی و اسرار تحویل قبلہ

قال تعالیٰ۔ سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ... الی... صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(**ربط**) گزشتہ آیات میں ملت ابراہیمی اور ملت اسلام کا افضل اور اکمل ہونا اور سرور عالم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الرسل ہونا بیان فرمایا۔ اب قبلۂ ابراہیمی اور کعبۂ اسلامی کا تمام قبلوں سے افضل ہونا بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح اس امت کی ملت تمام ملتوں سے افضل اور اکمل ہے۔ اسی طرح اس امت کا قبلہ بھی تمام قبلوں سے افضل اور بہتر ہے اور جس طرح ملت ابراہیمی سے اعراض سفاہت اور جہالت ہے اسی طرح قبلۂ ابراہیمی سے بھی اعراض سفاہت اور جہالت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے ملت ابراہیمی سے بھی اعراض کیا اور حق کو چھپایا اور اپنے آباء و اجداد کے انتساب پر اعتماد کرکے اعمال صالحہ سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھا اور اپنی سفاہت اور بے وقوفی ظاہر کی۔ اب عنقریب ایک سفاہت اور ظاہر ہوگی۔ وہ یہ کہ جب بیت المقدس کا استقبال منسوخ ہوکر خانہ کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہوگا تو یہ نادان اور بے وقوف جو محض صورت کے اعتبار سے انسانوں کی جنس سے ہیں عنقریب یہ کہیں گے کہ کس چیز نے انکو اس قبلہ سے پھیر دیا کہ جس پر اب تک قائم تھے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ آیت سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ۔ کے بارہ میں علماء کے دو قول ہیں۔

قولِ اوّل: قفال مروزی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت تحویل قبلہ کے بعد نازل ہوئی اور یہ لفظ اگرچہ بظاہر استقبال کے لیے ہے لیکن اس جگہ ماضی کے معنی مراد ہیں۔

قولِ ثانی: یہ آیت تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے آئندہ پیش آنے والے طعن اور اعتراض کی پہلے ہی سے خبر دے دی۔ اس آیت

کے نزول کے وقت تک قبلہ تبدیل نہیں ہوا تھا البتہ ہونے والا تھا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اُسکی خبر دے دی تاکہ مسلمان یہود کے اعتراض کو سن کر گھبرائیں نہیں اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور اس قول پر آیت کے ربط کی تقریر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ گزشتہ آیات اور رکوعات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے اُن اعتراضات کے جواب دیئے گئے جو وہ کر رہے تھے اب اس آیت میں اس اعتراض کا جواب بتلاتے ہیں جو آئندہ چل کر وہ کرنے والے تھے اور مطلب یہ ہے کہ اب تک تو یہود اور نصاریٰ اور مشرکین تم پر وہی اعتراض کرتے تھے جو بیان ہو چکے۔ اور جنکا جواب بھی ہم دے چکے۔ اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ جب تم کو تحویل قبلہ کا حکم دیا جائیگا تو یہ بیوقوف اور سفیہ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ کیا دین ہے کہ جس کا قبلہ بدلتا رہتا ہے اور یہ کہیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے سابقہ قبلہ کو کیوں چھوڑ دیا۔

شانِ نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ مکرمہ میں رہے تو خانۂ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو بحکم خداوندی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ سولہ[۱۶] یا سترہ[۱۷] مہینہ تک اسی طرف نماز پڑھتے رہے اس کے بعد خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا تو یہود اور مشرکین اور منافقین طرح طرح کے طعن کرنے لگے یہود کہنے لگے کہ پہلے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو انبیاء کا قبلہ تھا اب اسکو کیوں چھوڑ دیا اور جب آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو اس وقت بعض یہودی یہ کہتے کہ ہمارے دین کو تو مانتے نہیں ہمارے قبلہ کی طرف کیوں نماز پڑھتے ہیں۔ بعض یہودی کہتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قبلہ سے واقف نہیں اس لیے ہمیں دیکھ کر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ مشرکین کہنے لگے محمدؐ اب سمجھ گئے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنے آبائی دین کی طرف آرہے ہیں۔ کوئی کہتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین کے بارہ میں متحیر ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں سے ملول ہوتے اور دل سے یہ چاہتے کہ خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں طعن کرنے والوں کے حال سے خبر دی کہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوگا تو یہ بے وقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا کہ جس کی طرف وہ نماز پڑھا کرتے تھے یعنی یہ جو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اب کیا ہوا کہ وہ اسے چھوڑ کر کعبہ کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ آپ اُن کے جواب میں کہدیجئے کہ اللہ ہی کے لیے ہے مشرق اور مغرب وہی تمام جہات اور مکانات کا مالک ہے اس کو اختیار ہے کہ جس جہت اور جس سمت کو چاہیے قبلہ مقرر کرے اور جس کو چاہے منسوخ کرے۔ غلام کو یہ پوچھنے کا حق حاصل نہیں کہ پہلے یہ حکم دیا تھا اور اب یہ حکم کیوں دیا۔ غلام کا آقا سے اس قسم کا سوال بھی اس کی بے عقلی کی دلیل ہے۔ مریض کا طبیب سے پوچھنا کہ نسخہ کیوں بدلا اس کی کمال سفاہت اور غایت حماقت کی دلیل ہے۔ غلام تو مولیٰ کے حکم کا تابع ہے۔ اسے تو حکم کا اتباع چاہیئے سرّ اور حکمت سے اسکو کیا بحث۔ خیر اگر تم حکمت ہی معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو! اصل مقصود عبادت ہے اور قبلہ عبادت کی ایک راہ ہے خدا کو اختیار ہے کہ جس راہ سے چاہے اپنے

بندوں کی منزل طے کرائے کسی کو کسی راہ سے اور کسی کو کسی راہ سے اور جسکو چاہتا ہے اپنی عبادت کا سیدھا اور قریب راستہ بتلاتا ہے کہ جلد منزل مقصود طے ہو جائے اس لیئے تم کو بہترین قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو عبادت اور معرفت کا سب سے قریب اور سیدھا راستہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام جو کہ تمام بنی نوع انسان کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ جو شجرۃ الانبیاء ہیں اور تمام مذاہب اور ملتیں انکی ملت کے تابع ہیں انکے لیے بھی یہی راستہ تجویز ہوا اور خانہ کعبہ ہی ان کے لیے قبلہ بنایا گیا کیونکہ خانہ کعبہ زمین کا مرکزی نقطہ ہے۔ سب سے پہلے یہی مرکزی نقطہ پیدا کیا گیا اور یہیں سے زمین بچھائی گئی اور یہی جگہ انسان کا مبداء ترابی ہے اور یہی جگہ عرش عظیم اور بیت المعمور کے محاذات میں ہونے کی وجہ سے حق جل شانہ کے انوار و تجلیات کا مرکز ہے اور انسان چونکہ مٹی سے پیدا ہوا ہے تو حسب قاعدہ کل شئی یرجع الی اصلہ۔ اسکا اصلی میلان اسی مرکزی نقطہ یعنی خانہ کعبہ کی طرف ہو گا اگرچہ ظاہراً محسوس نہ ہو۔ اس لیے خانہ کعبہ قبلہ عالم مقرر ہوا۔ نیز روایات سے ثابت ہے کہ جب آسمان اور زمین کو یہ خطاب ہوا۔ اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا کہ تم خوشی سے آؤ یا لاچاری سے تو زمین کے اجزاء اور قطعات میں سے سب سے پہلے اسی جگہ نے اطاعت خداوندی کے قبول میں سبقت کی اس لیے از راہ قدر دانی حق جل شانہ نے اس جگہ کو قبلہ مقرر فرمایا۔ البتہ چند روز کے لیے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک بنی اسرائیل کے لیے مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنایا گیا کہ جو انبیاء بنی اسرائیل کا موطن اور مسکن اور مقام بعثت اور مقام دعوت ہونے کی وجہ سے مبارک اور مقدس جگہ ہے۔ اسی وجہ سے شب معراج میں حضور کو براق پر سوار کر کے بیت المقدس لایا گیا اور حضرات انبیاء کرام کی ارواح طیبہ سے ملاقات کرائی گئی اور وہیں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر گئے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی انوار اور تجلیات کے ساتھ انبیاء سابقین کے انوار و برکات بھی مل کر نورٌ علیٰ نور کا فائدہ دیں اور نبی القبلتین کے لقب سے ملقب ہوں اور توریت اور انجیل کی بشارت پوری ہو کہ وہ نبی آخر الزمان صاحب قبلتین ہو گا لہذا اس شکر میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج بیت المقدس سے ہوئی چند روز کے لیے نماز میں بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا کہ یہ مقدس جگہ جو حضور کی معراج اور ترقی کا زینہ بنی اسکا حق یہ ہے کہ چند روز اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرمائیں تاکہ سینہ مبارک اس مبارک اور مقدس جگہ کے انوار و تجلیات کو اپنے اندر جذب کر لے اور پھر یہ کمالات آپکے سینہ مبارک سے آپکی امت کے علماء کے سینوں کی طرف منتقل ہوں تاکہ آپکی امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کے وارث کہلا سکیں۔

غرض یہ کہ اس وجہ سے چند روز کے لیے بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا پھر ہمیشہ کے لیے اصل قبلہ کے استقبال کا حکم نازل ہوا۔ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل قبلہ خانہ کعبہ ہے اور یہی جگہ تمام روئے زمین پر سب سے افضل اور اکمل ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل کہ تم ہو بتانے والے

النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

لوگوں پر اور رسول ہو تم پر بتانے والا

تمام اُمتوں پر اُمتِ محمدیہ کی فضیلت

قال تعالیٰ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ... الیٰ ... وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اور جس طرح ہم نے تمہارے لیے بہتر قبلہ تجویز کیا کہ وسط زمین میں ہے اور تمہارا مبداء ترابی ہے اور حق تعالیٰ شانہ کے انوار وتجلیات کا مرکز ہے اسی طرح ہم نے تم کو امت متوسط بنایا کہ جو اخلاق اور اعمال اور عقائد کے اعتبار سے متوسط اور معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان میں واقع ہے گویا کہ یہ امت اپنے کمال توسط اور کمال اعتدال کے اعتبار سے حلقۂ امم کے درمیان عین مسند پر بیٹھی ہوئی ہے اور تمام امتیں اطراف وجوانب سے اسکی جانب متوجہ ہیں اور ہم نے تمکو اس توسط اور اعتدال کی فضیلت اس لیے عطا کی تاکہ تمہاری عدالت علی وجہ الکمال ثابت ہو جائے اور قیامت کے دن تم لوگوں پر گواہ بن سکو اس لیے کہ شہادت کے لیے عدالت شرط ہے اور جب تم کامل العدالت ہو گے تو ٹھیک شہادت دے سکو گے۔ کمال اعتدال کی وجہ سے کسی ایک جانب تمہارا میلان نہ ہو گا اور تمہاری شہادت حق ہو گی اور طرفداری کے شائبہ سے پاک ہوگی۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ اولین وآخرین کو جمع کرے گا اور گزشتہ امتوں کے کافروں سے خطاب فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی نذیر یعنی ڈرانے والا نہیں آیا وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا جس سے ہم کو تیرے احکام کی اطلاع ہوتی اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام سے دریافت فرمائیں گے۔ تمام انبیاء متفق اللفظ یہ عرض کریں گے کہ اے اللہ ہم تیرے احکام کو پہنچا چکے یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہیں ان کو سب معلوم ہے مگر اتمام حجت کے لیے انبیاء سے گواہ طلب کریں گے۔ حضرات انبیاء اپنی گواہی میں امت محمدیہ کو پیش کریں گے۔ امم سابقہ کے کفار کہیں گے کہ انکو کیا معلوم یہ تو ہم سے قرنہا قرن بعد میں آئے۔ امت محمدیہ یہ جواب دے گی کہ اگرچہ ہم انکے بعد آئے مگر ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ تمام انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کے احکام پہنچا دیئے اور شہادت کے لیے علم قطعی اور یقینی کافی ہے۔ خاص مشاہدہ ضروری نہیں اور نبی کی خبر مشاہدہ سے ہزار درجہ زیادہ قطعی اور یقینی ہے۔ مشاہدہ میں غلطی کا امکان ہے

نبی کی خبر میں غلطی کا امکان نہیں اس لیے کہ نبی نبأ سے مشتق ہے اور نبأ لغت میں اس خبر کو کہتے ہیں جو بالکل صحیح اور واقع کے مطابق ہو نیز عظیم الشان بھی ہو۔ اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا جائیگا اور آپ سے آپکی امت کی اس شہادت کے متعلق دریافت کیا جائیگا۔ تو اے اس امت کے مسلمانو اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہونگے اور تمہاری عدالت اور صداقت کی شہادت دیں گے اور پھر تمہاری شہادت کے مطابق حضرات انبیاء کے حق میں فیصلہ ہوگا اور کفار مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

فائدہ اس امت کو متوسط اس معنی کر فرمایا کہ یہ امت عقائد اور اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان ہے۔ برخلاف یہود کے وہ تفریط میں مبتلا ہیں۔ حضرات انبیاء کی تنقیص کرتے ہیں انکو معصوم نہیں سمجھتے جو کہ نبوت کا خاصہ لازمہ ہے اور نصاریٰ افراط میں مبتلا ہیں کہ اپنے نبی کو مرتبۂ بندگی سے درجۂ فرزندی پر پہنچایا اور توسط اور اعتدال ہی باجماع عقلاء اعلیٰ درجہ کا کمال ہے۔ اسی لیے علماء نے اس آیت سے امت محمدیہ کے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس امت کے اجماع کو نہ قبول کرنا اسکی عدالت سے عدول کرنا ہے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ کے وسط (درمیان) میں ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ امت انبیاء و اولیاء کے درمیان ہے انبیاء سے نیچے اور اولیاء سے اوپر۔ چونکہ اس خطاب کے بالذات مخاطب صحابۂ کرام ہیں اس لیے اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام کا مقام انبیاء کرام سے نیچے ہے اور تمام اولیاء سے بلند اور اونچا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن

اور وہ جو ہم نے ٹھہرایا قبلہ جس پر تو تھا، نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں

يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن

کہ کون تابع رہیگا رسول کا اور کون پھر جاویگا الٹے پاؤں اور یہ بات

كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا

بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دی اللہ نے اور اللہ

كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ

ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا یقین لانا البتہ اللہ لوگوں پر

لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

شفقت رکھتا ہے مہربان

تحویل قبلہ پر ایک شبہ مع الجواب

قال تعالیٰ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا۔۔ الیٰ۔۔ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ○

آگے ایک شبہ کا ازالہ فرماتے ہیں کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ اس امت متوسطہ اور کاملہ کے لیے مناسب یہی قبلۂ کاملہ ہے کہ جو وسط ارض میں ہے تو پھر اس میں کیا مصلحت تھی کہ چند روز کے لیے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا اور پھر اسکو منسوخ کیا۔ آئندہ آیت میں اسکا جواب دیتے ہیں کہ ہمارے علم میں تمہارا اصلی قبلہ تو کعبہ ہی تھا جو حضرت ابراہیم کے وقت سے چلا آرہا تھا۔ اور جس قبلہ کی طرف چند روز آپ نماز ادا کرتے رہے یعنی بیت المقدس اسکو ہم نے آپکا اصلی قبلہ نہیں بنایا تھا مگر محض اس مصلحت کے لیے چند روز اسکے استقبال کا حکم دیا تھا کہ علانیہ اور ظاہری طور پر ہمکو یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں رسول کی تصدیق اور اطاعت سے تکذیب اور نافرمانی کی طرف پھرتا ہے۔ یعنی بجائے کعبہ کے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانان قریش کا امتحان مقصود تھا کہ کون رسول اللہ کا سچا تابعدار ہے کہ جس قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں اسی طرف نماز ادا کرتا ہے اور کون قومی حمیت کی رعایت کرتا ہے اس لیے کہ قریش کعبۃ اللہ کی تعظیم پر فخر کرتے تھے اور قبلۂ ابراہیمی کی مجاورت اور خدمت پر ناز کرتے تھے۔ اور بیت المقدس سے قبلۂ بنی اسرائیل ہونے کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قومی حمیّت کے امتحان کے لیے بجائے خانہ کعبہ کے بیت المقدس کے استقبال کا حکم دیا۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانانِ قریش کا امتحان تھا اور پھر جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو اس میں مسلمانانِ یہود کا امتحان تھا اور چونکہ بیت المقدس محض چند روز کے لیے امتحاناً قبلہ بنایا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ امتحان اسی چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر شاق اور گراں ہو اس لیے ارشاد فرماتے ہیں اور بے شک بیت المقدس کا قبلہ ہونا قریش اور عرب پر بہت شاق اور گراں تھا۔ اولاد اسماعیل ہونے کی وجہ سے قبلۂ ابراہیمی کو پسند کرتے تھے مگر ان لوگوں پر شاق نہیں کہ جنکو اللہ نے ہدایت اور توفیق دی اہل ہدایت کی نظر ہمیشہ اطاعت پر رہتی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے۔ جس جانب چہرہ کرنے کا حکم ہوگا اسی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ نیز اخص الخواص اپنے ذوق سلیم سے یہ خیال کرتے تھے کہ اگرچہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے افضل ہے۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں اور آپ کی رسالت تمام عالم اور امم کے لیے ہے

اس لیے یہ لوگ اپنی نور فراست سے سمجھتے تھے کہ ضروری ہے کہ کسی وقت استقبال بیت المقدس کی نوبت آئے گی۔ اور بعد چندے اصل قبلہ یعنی کعبہ کی طرف رجوع کا حکم ہوگا۔ جو افضل الرسل کے مناسب ہے۔

ایک شبہ اور اسکا ازالہ

الا لنعلم سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حق تعالےٰ کو پہلے سے علم نہ تھا بعد میں علم ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم اور ازلی ہے حاشا و کلا اللہ کا علم حادث نہیں۔

جواب

بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ علم سے تمییز کے معنی مراد ہیں یعنی ممتاز اور جُدا جُدا کر دینا بعض کہتے ہیں کہ علم سے مراد امتحان اور آزمائش ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم مطیع کو نافرمان سے ممتاز اور جدا کر دیں یا یہ معنیٰ ہیں کہ ہم امتحان کرتے ہیں کہ کون اطاعت کرتا ہے اور کون انحراف کرتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مضاف محذوف ہے اور اللہ کے جاننے سے اللہ کے رسولؐ کا اور عباد مؤمنین کا جاننا مراد ہے یعنی تاکہ ہمارا رسولؐ اور اہل ایمان بھی جان لیں۔

اور بیت المقدس اگرچہ اصلی قبلہ نہ تھا مگر تم نے اس مدت میں جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں انکو ضائع نہ سمجھنا اس لیے کہ اللہ تعالےٰ ایسا نہیں ہے کہ جو تمہارے ایمان اور اطاعت کو ضائع کر دے اس لیے کہ تم نے جو نمازیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں وہ اللہ ہی کے حکم سے پڑھی ہیں اور تحقیق اللہ تعالےٰ تو تمام آدمیوں پر۔ نیک ہوں یا بد مؤمن ہوں یا کافر سب ہی پر بہت ہی شفیق اور مہربان ہیں وہ اپنے حکم کے اتباع کرنے والوں کی نماز اور بندگی کب ضائع کر سکتے ہیں۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ

ہم دیکھتے ہیں پھر پھر جانا تیرا منہ آسمان میں سو البتہ پھیریں گے

قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے اب پھیر منہ اپنا طرف مسجد حرام کے

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ

اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ اسی کی طرف اور جن کو

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ

ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے ان

رَبِّهِمْ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو کرتے ہیں

تحویل قبلہ کا حکیمانہ جواب

قال تعالیٰ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ... الیٰ ... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝

گزشتہ آیات میں تحویل قبلہ پر شبہ کا حاکمانہ جواب تھا۔ اب حکیمانہ جواب ارشاد فرماتے ہیں اور تحویل قبلہ کی حکمتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

حکمت اوّل رأفت اور رحمت کی وجہ سے اگرچہ استقبال بیت المقدس میں بھی اجر کامل مل جائے مگر قبلۂ کاملہ درحقیقت کعبہ معظمہ ہے اور کامل کا میلان طبعی کامل ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے کہ شاید فرشتہ کامل قبلہ کے استقبال کا حکم لیکر نازل ہو۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے چہرہ کا بار بار وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف اٹھنا کہ کب خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نازل ہو اور چونکہ ہم کو آپکی آرزو اور خواہش کا پورا کرنا منظور ہے پس اس لیے ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپکو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح میری ملت ابراہیمی ہے اسی طرح میرا قبلۂ عبادت بھی قبلۂ ابراہیمی بنا دیا جائے لو پھر حکم دے ہی دیتے ہیں پس آپ اپنا منہ بجائے بیت المقدس کے مسجد حرام کی طرف کر لیجئے کہ اب ہمیشہ کے لیے وہی آپکا قبلہ ہے اور یہ حکم آپکے لیے مخصوص نہیں اگرچہ درخواست آپکی تھی مگر حکم تمام امت کے لیے ہے۔ امت سے کہہ دیجئے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اسی جانب اپنے چہروں کو متوجہ کرو حتیٰ کہ اگر بیت المقدس میں بھی ہو تب بھی مسجد حرام ہی کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرو اور تحقیق اہل کتاب بخوبی یہ جانتے ہیں کہ یہ قبلہ حق ہے۔ خود اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان ملت ابراہیمی پر ہونگے اور ان کا قبلہ قبلۂ ابراہیمی ہوگا اور اہل کتاب یہ بھی بالیقین جانتے ہیں کہ اس نبی اور اس امت نے یہ قبلہ اپنی رائے سے نہیں ٹھہرایا بلکہ اُن کے پروردگار کی جانب سے یہی حکم آیا ہے مگر اس کو چھپاتے ہیں ظاہر نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ اُن کی ان کارروائیوں سے غافل نہیں وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کے حکم پر چلتا ہے اور کون اپنی رائے اور خیال پر چلتا ہے۔ حاصل اس حکمت کا یہ ہے کہ ہم نے آپکی خواہش اور خوشی کے موافق قبلہ تبدیل کر دیا تاکہ لوگوں پر آپ کا شرف اور آپکی عظمت ظاہر ہو جائے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ
اور اگر تو لادے کتاب والوں پاس ساری نشانیاں نہ
مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
چلیں گے تیرے قبلہ پر اور نہ تو مانے ان کا قبلہ
وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ
اور نہ ان میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ اور کبھی تو چلا انکی
اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا
پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ تک پہنچا تو بے شک تو بھی
لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
ہے بے انصافوں میں جنکو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں یہ بات جیسے
يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ
پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور ایک فرقہ ان میں چھپاتے ہیں حق کو
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
جان کر حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے

الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا
والا اور ہر کسی کو ایک طرف ہے کہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم
الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سبقت چاہو نیکیوں میں جس جگہ تم ہو گے کر لاوے گا اللہ اکٹھا بے شک اللہ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ
ہر چیز کر سکتا ہے اور جس جگہ سے نکلے منہ کر

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ
طرف مسجد حرام کے اور یہی تحقیق ہے تیرے رب
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ
کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے اور جہاں سے تو نکلے
فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ
منہ کر طرف مسجد حرام کے اور جس جگہ تم ہوا
فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
کرو منہ کرو اسی کی طرف کہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے
حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي
کی جگہ مگر جو ان میں بے انصاف ہیں سو ان سے مت ڈر اور مجھ سے
وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾
ڈرو اور اس واسطے کہ پورا کروں تم پر فضل اپنا اور شاید تم راہ پاؤ۔

عناد اہل کتاب دربارۂ قبلہ

قال تعالیٰ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ... الیٰ ... وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

(ربط) گزشتہ آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اہل کتاب کو اس قبلہ کا حق ہونا بخوبی معلوم ہے اور خود اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان کچھ روز بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں گے اور آخر کو کعبہ کی طرف اور یہی اُن کا اصل اور دائمی قبلہ ہے جو ملت ابراہیمی کے موافق ہے مگر حسد اور عناد کی وجہ سے چھپاتے ہیں آئندہ آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ انکا عناد کس درجہ پر پہنچا ہوا ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور اگر آپ اس قبلہ کی حقیّت اور فضیلت پر ہر قسم کے دلائل اور نشانات بھی لے آئیں تب بھی یہ لوگ آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں گے اور نہ آپ کبھی بھی ان کے قبلہ کا اتباع اور پیروی کریں گے ان کا مقصد تو یہ

ہے کہ آپ انکے تابع بن جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کبھی بھی انکے قبلہ کا اتباع اور پیروی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ انکا قبلہ منسوخ ہو چکا ہے اور جس قبلہ کا آپکو حکم ہوا ہے وہ آئندہ چل کر کبھی منسوخ نہ ہوگا اور بیت المقدس کے استقبال کا اب کبھی حکم نہ آئیگا اور عقلاً بھی اہل کتاب کے قبلہ کا اتباع ممکن نہیں اس لیے کہ وہ خود ہی آپس میں قبلہ کے بارہ میں ایسے مختلف ہیں کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے قبلہ کے متبع نہیں ہر ایک نے اپنی نفسانی خواہش سے علیحدہ قبلہ کا اتباع کر رکھا ہے اور اے نبی کریمؐ بالفرض اگر آپ انکی نفسانی خواہشوں کا اتباع کرنے لگیں بعد اسکے کہ آپ کے پاس قبلہ کے بارہ میں علم صحیح اور قطعی آ چکا تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں شمار ہونگے اس لیے کہ ناسخ کو چھوڑ کر منسوخ کا اتباع کرنا ہوائے نفس ہے اور ہوائے نفسانی کا اتباع آپ سے بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے لہذا آپ سے اُن کے قبلہ کا اتباع بھی محال ہوگا۔

عناد اہل کتاب دربارۂ صاحب قبلتین و رسول ثقلین صلی اللہ علیہ وسلم

وحکمت اول در تحویل قبلہ

گزشتہ آیت میں قبلہ کے بارہ میں اہل کتاب کے عناد کا ذکر تھا اب صاحب قبلہ کے بارہ میں ان کے عناد کا ذکر ہے کہ اہل کتاب اسی نبی موعود کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر مانتے نہیں چنانچہ فرماتے ہیں جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ آپکو خوب پہچانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں کہ جن کی توریت اور انجیل میں بشارت دی گئی ہے۔ اہل کتاب آپکی صورت اور شکل کو دیکھ کر اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو صورت و شکل اور قد و قامت سے پہچانتے ہیں۔ جیسے بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا اسی طرح نبی کریمؐ کی صورت کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی نبی برحق ہے اور یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں اس لیے کہ توریت اور انجیل میں آپکا حلیہ اور صورت و شکل اور قد و قامت لون وغیرہ سب مذکور تھا اور تحقیق ان میں کا ایک فریق حق کو چھپاتا ہے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ توریت میں آپ کا نبی قبلتین ہونا بھی مذکور ہے پس یہی امر حق ہے جو تیرے رب کے پاس سے آیا ہے پس تو اُن کی تلبیس کی وجہ سے ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔ خطاب آپکو ہے مگر سنانا دوسروں کو ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سلامؓ سے دریافت کیا کہ کیا تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بیٹوں کی طرح پہچانتے ہو۔ تو جواب دیا کہ ہاں بیٹوں سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ بیٹے میں شک ہو سکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کوئی شک نہیں ہو سکتا آپکی صفات اور علامات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی ہم نے پہچان لیا کہ آپ نبی برحق ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالےٰ نے سچ کہا اور اللہ نے تم کو خیر کی توفیق دی۔

حکمت دوم در تحویل قبلہ اور دوسری حکمت تحویل قبلہ میں یہ ہے کہ ہر امت کے لیے ایک جداگانہ قبلہ ہے جس کی طرف وہ امت متوجہ ہوتی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ خانہ کعبہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ بیت المقدس تھا اسی طرح تمہارے لیے بھی ایک مستقل قبلہ تجویز ہوا۔ جس طرح تمہارا دین مستقل اور جداگانہ ہے اسی طرح تمہارے لیے قبلہ بھی مستقل ہونا چاہیئے کوئی جہت اور کوئی سمت اپنی ذات سے قبلہ نہیں خدا تعالےٰ نے جس جہت کو قبلہ بنا دیا وہ قبلہ ہوگئی اسی طرح خدا تعالےٰ نے تمہارے لیے ایک جہت کو قبلہ مقرر کر دیا۔ پس اے مسلمانو تم اس قبلہ کے مسئلہ میں کنج و کاؤ نہ کرو۔ اصل نیکیوں کی طرف دوڑو جو مقصود بالذات ہیں یعنی نماز اور روزہ وغیرہ۔ نہ کہ قبلہ کہ وہ اصل عبادت نہیں بلکہ ذریعۂ عبادت ہے اور اصل عبادت تو حکم خداوندی کا امتثال ہے اسکی طرف دوڑو۔ جس وقت وہ خداوند ذو الجلال بیت المقدس کے استقبال کا حکم دے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور جس وقت خانہ کعبہ اور مسجد حرام کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے اس طرف متوجہ ہو جاؤ کسی سے منازعت کی ضرورت نہیں۔ تمام خیرات اور نیکیوں کی جڑ، امر خداوندی کے امتثال میں مبادرت اور سبقت کرنا ہے۔ اصل بھلائی حکم کی پیروی میں ہے جس وقت جو حکم ہو اسکی تعمیل کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ جہاں سب عبادتوں پر اجر ملے گا اور اصل عبادت تعمیل حکم ہے وہ احکم الحاکمین ہے جو چاہے حکم دے تم مشرق اور مغرب میں جہاں کہیں بھی ہو گے تم سب کو قیامت کے دن اللہ تعالےٰ حساب کے لیے حاضر کرے گا اور تمہارے اعمال کے مطابق تمکو جزا دیگا یعنی اختلاف جہات صرف دنیا میں ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب کو جہات مختلفہ سے ایک مکان میں جمع کریگا اور سب کو بھلائی اور برائی کی جزا دیگا اور سب نمازوں کو بمنزلہ ایک نماز کے بنا دیگا۔ بیشک اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اب آپ آئندہ نماز میں بیت المقدس کا استقبال نہ کریں بلکہ جس جگہ سے بھی نکلیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور یہی حق ہے کہ ہر حال میں خانہ کعبہ کا استقبال کرو اور تیرے رب کی طرف سے یہ حکم آیا ہے جس سے مقصود تیری ہی تربیت ہے اور تکمیل عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں کہ کون اس کے حکم کے موافق نماز ادا کرتا ہے اور کون اسکے خلاف کرتا ہے۔

حکمت سوم در تحویل قبلہ اور تیسری حکمت اتمام حجت اور دفع الزام ہے۔ اوّلاً تحویل قبلہ کے حکم کا اعادہ فرمایا اور ثانیاً لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ سے اس حکم کی ایک جدید علت بیان فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور پھر ہم تمکو مکرر کہتے ہیں۔ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) آپ جس جگہ سے بھی باہر نکلیں تو اپنا منہ نماز میں مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور اے مسلمانو، تم بھی جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کر لیا کرو تاکہ لوگوں کا تم پر کوئی الزام نہ رہے کیونکہ اگر تحویل قبلہ کا حکم نہ نازل ہوتا تو یہود تمکو یہ الزام دیتے کہ توریت میں یہ صاف لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بالآخر قبلۂ ابراہیمی ہو گا۔ اور خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہو جانے کا انکو حکم آئے گا

پس یہود یہ الزام دیتے تھے کہ توریت میں جو نبی آخر الزمان کی علامت لکھی ہوئی ہے وہ آپ میں موجود نہیں اور مشرکین یہ الزام دیتے کہ محمدؐ دعویٰ تو کرتے ہیں ملت ابراہیمی کے اتباع کا مگر قبلۂ ابراہیمی سے روگردانی کرتے ہیں۔ اب تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے یہود اور مشرکین کسی کا کوئی الزام نہیں رہا اور ہر دو فریق کی زبان بند ہوگئی مگر جو ان میں ظالم ہیں وہ اعتراض اور طعن سے باز نہ آئیں گے۔ یہود یہ کہیں گے کہ محض حسد کی وجہ سے ہمارے قبلہ کو چھوڑا جو کہ انبیاء کا قبلہ تھا اور ظالم بت پرست یہ کہیں گے کہ محمد رفتہ رفتہ اپنے آبائی دین کی طرف آرہے ہیں۔ پس تم ان ظالموں اور انکے طعن سے نہ ڈرو۔ بلکہ فقط مجھ سے ڈرتے رہو اور ان کے طعن کی وجہ سے میرے حکم کو نہ چھوڑو۔ خالق کے حکم کو مخلوق کے طعن سے چھوڑنا موجب خسران وعذاب ہے اور خالق کی حکم برداری کے لیے مخلوق کے طعن پر صبر کرنا موجب فلاح وثواب ہے مخلوق کا طعن مضر نہیں خالق کی خلاف حکمی مضر ہے۔

حکمت چہارم در تحویل قبلہ

اور چوتھی حکمت یہ ہے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کروں کہ نماز میں (جو کہ سب سے افضل اور اعلیٰ عبادت ہے) تمہاری توجہ سب سے افضل اور اکمل قبلہ اور بہترین جہت کی طرف ہوتا کہ اس جہت کے انوار و برکات بھی تمہاری نماز کو خوب روشن اور منور بنا دیں۔ قبلہ کے باب میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ عبادت میں افضل جہات کے استقبال کا حکم دیا جائے جیساکہ دین کے بارہ میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ دین کامل عطاء کیا جائے کما قال تعالیٰ۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔

حکمت پنجم در تحویل قبلہ

اور پانچویں حکمت یہ ہے کہ تمکو سیدھا راستہ معلوم ہو اور افضل جہات کے استقبال سے تم کو ہدایت کاملہ حاصل ہو اور قریب ہی راستہ سے جلد منزل مقصود تک پہنچ جاؤ۔ (جیساکہ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ کی تفسیر میں گزرا)

تحویل قبلہ کے حکم کو مکرر لانے کی حکمت

وجہ اول۔ تحویل قبلہ کے حکم فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کو تین بار اس لیے مکرر لایا گیا کہ حق تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی تین علت غائیہ ذکر فرمائیں۔ اوّل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا اور خواہش یہی تھی۔ وحی کے انتظار میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے آپکی دلجوئی اور اظہار تکریم کیلئے یہ حکم دیا گیا دوم یہ کہ ہر امت کیلئے مستقل قبلہ ہوتا ہے اور امت محمدیہ بھی ایک مستقل امت ہے لہٰذا اسکے لیے بھی ایک مستقل قبلہ ہونا چاہیے سوم یہ کہ مخالفین کا الزام دفع کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا کما اشار الیہ بقولہ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اس لیے ہر علت کے ساتھ معلول کی اور ہر دلیل کے ساتھ دعویٰ کی تجدید کر دی گئی کیونکہ کلام کی خوبی یہ ہے کہ علت اور معلول اور دعویٰ دونوں ساتھ ذکر کیے جائیں۔

وجہ دوم - بعض اہل علم نے تکرار کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ پہلی آیت خاص ساکنان حرم کے حق میں ہے اور دوسری آیت ساکنان جزیرۃ العرب کے حق میں ہے او رتیسری آیت تمام روئے زمین کے باشندوں کے حق میں ہے -

وجہ سوم :- پہلی آیت تعمیم احوال کے لیے ہے اور دوسری آیت تعمیم امکنہ کے لیے ہے اور تیسری آیت تعمیم ازمنہ کے لیے ہے - یعنی تمام احوال اور تمام مکانات اور تمام اوقات میں یہی قبلہ ہے اسکا استقبال ضروری ہے -

وجہ چہارم : چونکہ شریعت میں سب سے پہلے یہی حکم منسوخ ہوا اس لیے اس کے بیان میں زیادہ اہتمام کیا گیا اور تاکیداً تین بار اس حکم کا اعادہ کیا گیا -

وجہ پنجم :- کسی حکم کا منسوخ ہونا محل فتنہ اور محل شبہ ہے اور احکام خداوندی میں نسخ جاری ہونا بے وقوفوں کی عقل سے باہر ہے اس لیے اس حکم کا تکرار مناسب ہوا -

كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا

جیسا بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا تمہارے پاس ہماری آیتیں

وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ

اور تم کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور تحقیق بات اور سکھاتا تم

مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۱۵۱﴾

کو جو تم نہ جانتے تھے

بیان وظائف رسول اعظم کہ از قبلۂ ابراہیمی و حرم محترم مبعوث باشد

قال تعالیٰ - كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ ... الیٰ ... وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ -

(ربط) ابتداء قصہ میں بناء کعبہ کا ذکر فرمایا اور بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ذکر فرمائی رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ الآیۃ - کہ اے اللہ اس حرم کعبہ کی سرزمین سے ایسا نبی مبعوث فرما کہ جو تیری آیات کی تلاوت کرے اور لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم

سے۔ الی آخرہ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں خانہ کعبہ کو مرجع خلائق اور قبلۂ عالم بنایا اور قبلۂ ابراہیمی کے بارہ میں جو سفہاء کے شبہات تھے تفصیل کے ساتھ ان کا جواب دیا اور خانہ کعبہ کا افضل قبلہ ہونا بیان فرمایا اب آگے اس بحث کو حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دعا یعنی افضل الرسل کی بعثت کے ذکر پر ختم فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم نے قبلہ کے بارہ میں تم پر اتمام نعمت کیا کہ سب سے افضل قبلہ تمہارے لیے مقرر کیا اسی طرح ہم نے نبوت و رسالت اور ہدایت کے بارہ میں تم پر اس طرح اتمام نعمت کیا کہ سب سے افضل اور اکمل اور عظیم الشان رسول تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا اور پھر اس پر مزید انعام یہ کہ تمہاری قوم میں سے یا تمہاری جنس میں سے بھیجا۔ جو تمہارے لیے دین و دنیا میں باعث عزت و شرف ہوا اور اس طرح تم پر اللہ کی نعمت پوری ہوئی۔ غور تو کرو کہ کس قدر عظیم الشان نعمت ہے اور وہ رسول فقط ہمارے احکام ہی نہیں پہنچائے گا بلکہ تم پر ہماری آیتوں کی تلاوت بھی کریگا۔ جس سے تم کو کلام الٰہی کے سننے کی نعمت حاصل ہوگی۔ اور اسرار بلاغت اور دلائل اعجاز تم پر منکشف ہونگے اور چونکہ کلام متکلم کے کمالات کا آئینہ اور مظہر ہوتا ہے اس لیے اس نور السموات والارض کے انوار و تجلیات بواسطہ اس کلام کے بقدر تمہاری استعداد کے تمہارے قلوب پر منعکس ہوں گے اور جو قلوب اور صدور اپنے رب غفور کے اس کلام سراپا نور کی حفاظت کریں گے وہ کوہ طور کا ایک نمونہ ہوں گے اور پھر تم اس کلام کے ذریعہ سے اپنے ربّ اکرم سے قبلہ رو ہو کر مناجات کر سکو گے اور اسکی تلاوت اور استماع سے جو اجر اور لذت تمکو حاصل ہوگی وہ حیطۂ بیان سے باہر ہے اور علاوہ ازیں وہ رسول تم کو اپنی ایک ہی نظر کیمیا اثر میں گناہوں کے زنگ سے آئینہ کی طرح صاف و شفاف بنا دیگا مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس رسول کی نظروں اور قدموں پر تو لا کر ڈالو اور اگر تم اس کی نظر ہی سے بھاگ جاؤ تو پھر نظر کیا کام کرے آئینہ جبتک آفتاب کے سامنے نہ ہو تو آفتاب کا عکس اس میں کہاں آئے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آئینۂ دل کو آفتاب نبوت کے سامنے کر دیا نور ہدایت سے جگمگا اٹھا۔ ابوجہل اور ابولہب نے آفتاب نبوت سے منہ پھیر لیا نور ہدایت سے محروم رہے۔ اور وہ رسول تمکو کتاب الٰہی کے معانی اور اسرار و حکم بھی سکھاتے گا اور علاوہ ازیں وہ رسول تمکو ایسی عجیب و غریب باتوں کی بھی تعلیم دیگا کہ جن کو تم اپنی عقل سے نہیں جان سکتے تھے جیسے نماز کی کیفیت اور زکوٰۃ کی کمیت اور حج کا طریقہ نماز اور زکوٰۃ کی کیفیت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بتلانے سے معلوم ہوئی قرآن میں اجمال تھا حدیث نے اس کی تفصیل کی۔ اور جس عظیم الشان رسول کے مبعوث ہونے کی حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی اس کا ظہور ہوگیا ؎

گر نہ ہوتی ذات پاک انبیاء ؛ حق سے باطل کس طرح ہوتا جدا

اور اس طرح اللہ کی نعمت تم پر پوری ہوئی۔ لہٰذا تم اس نعمت عظمیٰ کا شکر کرو چنانچہ فرماتے ہیں۔

ع گزشتہ آیت میں وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ تھا۔ اس اتمام نعمت کے لفظ سے ولاتم نعمتی کی طرف اشارہ ہے اور آئندہ سطر میں یہ لفظ۔ تمہاری ہدایت کیلیے بھیجا۔ ولعلکم تھتدون کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

تو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو

تلقینِ ذکر و شکر

قال تعالیٰ۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ٥

پس جب کہ میں نے تمکو ایسی عظیم نعمتوں سے سرفراز کیا اور تم میں ایسا عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیج کر تمکو یاد کیا تو اسکا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم بھی مجھکو ہمیشہ یاد رکھو کسی وقت میری یاد سے غافل نہ ہو میں تمکو اپنے لطف وعنایت سے یاد کرونگا اور ملاء اعلیٰ میں تمہارے ذکر کا ذکر کرونگا کہ یہ میرے یاد کرنے والے بندے ہیں جس سے ملاء اعلیٰ اور ملائکۂ مقربین کی عنایات تم پر مبذول ہوں گی۔

ف قلب سے حجابات غفلت دور کرنے کے لیے ذکر الٰہی سے بہتر کوئی شئے نہیں۔ جس طرح قلب سے حرص اور طمع کا فاسد مادہ دور کرنے کے لیے انفاق فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں۔ اور میرا احسان مانو اور شکر کرو کہ تمہاری ہدایت کے لیے ایسا عظیم الشان رسول بھیجا۔ شکر سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ لہذا اگر تم نے ہماری نعمت کا شکر کیا تو تمہاری ہدایت اور کتاب وسنت کے علم اور معرفت میں زیادتی ہو گی اور جتنا ذکر اور شکر کرو گے اسی قدر تمہارے تزکیۂ باطن اور علوم ومعارف میں زیادتی ہو گی۔ اور میری ناشکری مت کرو کہ اس رسول کا انکار کر بیٹھو اور دل وجان سے اسکی اطاعت نہ کرو۔ اور اگر من جانب اللہ علوم ومعارف منکشف ہوں تو دعوے مت کرو دعوی بھی ناشکری میں داخل ہے۔

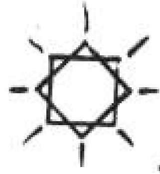
نکتہ دعاء ابراہیمی جو پہلے گزر چکی ہے اس میں تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر مقدم تھا اور تزکیہ کا ذکر مؤخر تھا اور اس آیت یعنی كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ۔ الخ میں تزکیہ کا ذکر مقدم ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر مؤخر ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اصل مقصود تو تزکیۂ نفس ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ اسکا وسیلہ اور ذریعہ ہے اگر تعلیم ہو اور تزکیہ حاصل نہ ہو تعلیم بے فائدہ ہے اور عموماً تزکیہ نفس تعلیم کتاب اور حکمت ہی کے بعد حاصل ہوتا ہے اور تعلیم تزکیہ کے مبادی اور مقدمات میں سے ہے اس لیے دعائے ابراہیمی میں ترتیب وقوعی کے لحاظ سے تزکیہ کے مبادی اور وسائل کو پہلے ذکر کیا اور مقصود کو اخیر میں ذکر کیا۔ اور حق جل شانہٗ نے جب دعاء ابراہیمی کی اجابت اور قبولیت کا ذکر فرمایا تو اصل مقصود کو پہلے ذکر فرمایا تاکہ سامعین کو ابتداء ہی سے یہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود تزکیہ ہے اور وہ بارگاہ خداوندی سے منظور ہو چکا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط

اے مسلمانو قوت پکڑو ثابت رہنے سے اور نماز سے

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾

بیشک اللہ ساتھ ہے ثابت رہنے والوں کے

طریقۂ تحصیل ذکر و شکر و بیان فضیلت صبر 

قال تعالیٰ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ہ

(ربط) گزشتہ آیت میں ذکر و شکر کا حکم تھا اور کفران نعمت کی ممانعت تھی اور ذکر و شکر میں تمام احکام خداوندی کا بجا لانا داخل تھا اور کفران نعمت کی ممانعت میں تمام منہیات اور ممنوعات سے بچنا داخل تھا اور تمام احکام کا بجالانا اور تمام ممنوعات سے بچنا بظاہر بہت دشوار ہے۔ اس لیے آئندہ آیت میں مسلمانوں کو ذکر اور شکر کے حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اے ایمان والو اگر ذکر اور شکر اور درجات قرب اور معرفت کے حاصل کرنے میں دشواری معلوم ہو تو صبر اور نماز کی مدد اور سہارے سے اس کو حاصل کرو۔ صبر من جانب اللہ ایک خاص ہتھیار ہے کہ جو خاص انسان کو عطا کیا گیا ہے تاکہ مشکلات میں اس کا معین اور مددگار ہو۔ صبر کی خاصیت یہ ہے کہ رنج و غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ حیوانات میں صرف شہوت ہے عقل نہیں۔ ملائکہ میں صرف عقل ہے شہوت نہیں۔ انسان میں عقل کے ساتھ شہوت اور غضب بھی ہے۔ اس لیے انسان کو شہوت اور غضب کا وار روکنے کے لیے صبر کا ہتھیار دیا گیا اور فرشتہ اور حیوان کو نہیں دیا گیا۔ عقل اور شہوت میں جب کشمکش ہو تو عقل کے اشارہ پر چلنا اور نفسانی خواہشوں پر نہ چلنا اس کا نام صبر ہے اخلاق جمیلہ میں صبر کا مقام نہایت بلند ہے۔ حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں صبر کو ستّر یا چھتّر جگہ ذکر فرمایا ہے۔ آیات قرآنیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل صالح کا اجر مقرر ہے مگر صبر کا اجر بے حساب ہے۔ پس اگر نفس پر احکام شرعیہ شاق اور گراں ہوں تو اُن کے آسان ہونے کا ایک علاج تو صبر ہے اور دوسرا علاج نماز ہے۔ اس لیے کہ نماز ایک تریاق مجرب ہے جو ذکر اور شکر اور خشوع اور خضوع اور اس قسم کے مختلف اجزاء سے مرکب ہے جو ہر بیماری کی دوا اور ہر مشکل کا علاج ہے۔ جیسے بارش کے لیے صلوٰۃ استسقاء ہے اور ہر دینی اور دنیوی مطلب کے لیے صلوٰۃ الحاجت ہے۔ حضرات انبیاء کرام کو جب مشکل پیش آتی تو نماز میں مشغول ہوتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی پریشانی آتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز

میں مشغول ہو جاتے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب ظالم بادشاہ نے حضرت سارہؓ کو پکڑوایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز میں مشغول ہو گئے۔ اور جریج راہب پر جب لوگوں نے زنا کی تہمت لگائی تو جریج نماز میں مشغول ہو گئے (بخاری و مسلم)

غرض یہ کہ نماز اُمّ العبادات ہے اور دین کا ستون ہے اور مومن کی معراج ہے جس کی کثرت سے مومن کے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ نماز اگرچہ مختلف اجزاء سے ایک معجون مرکب اور تریاق مجرب ہے لیکن اسکی روح دعا ہے جو ہر مرض کی دوا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیئے کہ صبر اور نماز سے غافل نہ ہوں اس لیے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اس لیے کہ صبور اور حلیم اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں اور جو اخلاقِ خداوندی کا خوگیر اور عادت پذیر ہو اسکو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوگی۔

خداوندِ ذوالجلال کی بے چون وچگون معیت کی حقیقت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ جن اولیاء اور عارفین کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت اور قرب خاص سے سرفراز فرمایا وہ حضرات کچھ قرب اور معیت کے مزہ سے واقف ہوتے ہیں مگر کسی دوسرے کو سمجھا نہیں سکتے۔ بغیر چکھے کسی شے کا بھی ذائقہ نہیں معلوم ہو سکتا۔ اور جس نے کوئی پھل نہ چکھا ہو اس کو یہ حق نہیں کہ وہ اس پھل کا یا اس کے مزہ کا انکار کرے۔

غرض یہ کہ معیت۔ صبر کے ذریعہ حاصل ہے اور معیت کی علامت یہ ہے کہ توفیق خداوندی اسکو کارِ خیر کی طرف لے جاتی ہے۔ رہی نماز سو وہ مومنوں کی معراج ہے اسکے عروج کے کیا پوچھنا اس لیے معیت کے بیان میں صبر کا ذکر کیا اور نماز کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ط

اور نہ کہو جو کوئی مارا جائے اللہ کی راہ میں کہ مردے ہیں

بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۱۵۴﴾

بلکہ وہ زندے ہیں لیکن تم کو خبر نہیں

بیان حیات شہداء کہ از ثمراتِ صبر است

قال تعالیٰ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ٥

(ربط) گزشتہ آیت میں صبر کی فضیلت کا بیان تھا کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالےٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ جو مقام صبر میں انتہا کو پہنچ جائے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینا بھی اسکو شیریں اور لذیذ معلوم ہو تو اس پر خدا وند حیّ و قیوم کی بے چون و چگون حیات کا ایک عکس اور پرتو پڑتا ہے جس سے اس کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جن صابرین نے خدا کی راہ میں جان نثاری کی ہو اُنکی حیات میں تردد نہ کرو اور جو صابر خدا کی راہ میں مارے گئے اور انکی اس میں کسی قسم کی دنیوی اور نفسانی غرض نہ تھی انکو یہ نہ کہو کہ عام مردوں کی طرح وہ مردہ ہیں بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں لیکن تم جانتے نہیں کہ وہ کس طرح کی زندگی ہے۔ وہاں کی زندگی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس حیات کے ادراک کے لیے یہ حواس کافی نہیں۔

ف (۱) شہید اگرچہ ظاہراً مرگیا لیکن اس کی موت عام لوگوں کی موت نہیں۔ مرنے کے بعد انسان کی ترقی رُک جاتی ہے اس لیے کہ روح کی ترقی کا ذریعہ بدن ہے۔ جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہوا تو ترقیٔ مراتب بھی ختم ہوئی۔ مگر شہید کی ترقی برابر جاری رہتی ہے جس عمل میں اس نے جان دی ہے اسکا اجر برابر جاری رہتا ہے گویا کہ اب بھی وہ عمل کر رہا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی مَر جاتا ہے تو اسکا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر مجاہد فی سبیل اللہ کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

ف (۲) احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹ میں رکھدی جاتی ہیں اور جنت میں اڑتی پھرتی ہیں اور جنت کے میوے کھاتی ہیں اور عرش کی قندیلوں میں آرام کرتی ہیں۔

بظاہر وجہ یہ ہے کہ شہید نے اپنے بدن کو خدا کی راہ میں قربان کیا خدا تعالےٰ نے اس عنصری بدن کے بدلہ میں ایک دوسرا غنصری بدن اسکی روح کی سیر و تفریح کے لیے عطا فرمایا۔ یہ جسم طیوری اس روح کے لیے بمنزلہ ایک طیارہ کے ہے جسکے ذریعہ سے روح جنت میں اڑ کر سیر و تفریح کرسکے۔ اور یہ روح اس نئے جسم میں مدبر اور متصرّف نہیں۔ تاکہ تناسخ کا شبہ ہو۔ اس لیے کہ تناسخ کی حقیقت یہ ہے کہ روح ایک جسم سے جُدا ہونے کے بعد دوسرے جسم سے اس طرح متعلق ہو کہ دوسرے جسم میں کوئی اور روح نہ ہو اور یہی روح اس جسم کی نشوونما کا سبب ہو اور یہی روح اس جسم میں مدبر اور متصرف ہو۔ اور ارواحِ شہداء میں یہ بات نہیں اس لیے کہ جسم طیوری کے ساتھ شہید کی روح کا تعلق ہوا ہے اس جسم طیوری کی روح علیحدہ ہے اور شہید کی روح علیحدہ ہے اور جسم طیوری کے نشوونما اور تدبیر و تصرف کا کوئی تعلق شہید کی روح سے نہیں۔ اسکا تعلق پرندہ کی اصل روح سے ہے۔ پرندہ کا جسم اور روح علیحدہ ہے اور شہید کی روح علیحدہ اور وہ اس میں سوار ہے اور وہ سبز پرندہ مع اپنے جسم اور اپنی روح کے شہید کی روح کے لیے سواری ہے۔ خوب سمجھ لو۔

ف (۳) جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ شہداء کی حیات جسمانی ہے اس لیے کہ موت اور قتل کا تعلق جسم سے ہے اور یہی ظاہر آیت کا مفہوم ہے اس لیے کہ سیاق آیت۔ شہداء کی خصوصیت بیان کرنے کے لیے ہے اور حیات روحانی شہداء کے ساتھ مخصوص نہیں وہ تو عامۂ مسلمین بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے۔



وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ

اور البتہ ہم آزمادیں گے تمکو کچھ ایک ڈر سے اور بھوک سے اور نقصان

مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ

سے مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے اور خوشی سنا

الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا

ثابت رہنے والوں کو کہ جب انکو پہنچے کچھ مصیبت کہیں

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ

ہم اللہ کا مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھر جانا ایسے لوگ انہی پر

صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ

شاباشیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں

الْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

راہ پر

بیان امتحان صبر و بشارت صابرین وجزاء صبر

قال تعالیٰ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ... الی .. وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ o

(ربط) گزشتہ آیت میں صبر کے سب سے بڑے امتحان کا ذکر فرمایا۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا۔

اب آئندہ آیت میں صبر کے کم درجہ کے امتحان کا ذکر فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس امتحان کے علاوہ اور بھی کچھ ہم تمہارے صبر کا امتحان لیں گے جو تم پر زائد شاق اور گراں نہ ہوگا اور خدا کی راہ میں جان دینے کی طرح مشکل نہ ہوگا۔ کبھی تمہارا امتحان کسی قدر دشمنوں کے خوف سے لیں گے کہ تم دشمنوں سے خوف زدہ ہو کر پریشانیوں میں مبتلا ہو گے اور کبھی فقر و فاقہ کے ذریعے سے اور کبھی مالوں کے نقصان سے مثلاً مال ضائع ہو جائے۔ اور کبھی جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ مثلاً عزیز و اقارب مر جائیں یا مثلاً کھیتی اور باغ کے پھل کسی آفت سے تلف ہو جائیں۔ تو اے مسلمانو ان مصائب اور آفات میں صبر کرنا اور ذکر کرنا اور شکر سے غافل نہ ہونا اور جو لوگ اس امتحان اور آزمائش میں پورے اتریں تو اے نبی کریمؐ آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے بلکہ اپنی اور احباب کی تسلی کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کے مملوک اور غلام ہیں۔ ہماری جان اور ہمارا مال سب اسی کی ملک ہے جو چاہے لے اور جو چاہے چھوڑے۔ غلام کو آقا کے سامنے مجال دم زدن نہیں وہ ارحم الراحمین ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے وہ اگر کسی وقت بھوکا رکھے تو اسکی حکمت اور مصلحت ہے۔ طبیب مشفق اگر بدہضمی اور فساد معدہ کی وجہ سے ایک دو وقت کھانے کی ممانعت کر دے۔ یہ اس طبیب کے مشفق ہونے کی دلیل ہے اور ہم سب اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہم کو یہ بھی مل جائے گا جو ہم سے لیا گیا ہے اور وہم و گمان سے زائد ہم کو اس کا اجر بھی ملے گا۔

ف حدیث میں ہے کہ یہ کلمہ خاص اسی امت کو ملا ہے۔ دوسری امتوں کو عنایت نہیں ہوا چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے غم میں یَا اَسَفٰی کہا اور اِنَّا لِلّٰہِ نہیں کہا۔ ایسے صابرین پر اللہ تعالےٰ کی خاص عنایات اور خاص توجہات ہیں جو حضرات انبیائؑ کی عنایات کے ہم رنگ ہیں جو اُن کے پروردگار کے پاس سے اترتی ہیں اور ان پر خدا کی مہربانی بھی ہے۔ کتاب و سنت میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص ہے۔ صابرین کی بشارت میں صلوات کا اس لیے استعمال فرمایا کہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کو ان عنایاتِ خاصہ سے سرفراز فرماتے ہیں جو حضرات انبیاء کی صلوات و عنایات کی ہم رنگ ہوتی ہیں اس لیے کہ مصائب اور حوادث میں صبر و تحمل سے کام لینا اور کوئی کلمۂ شکایت زبان سے نہ نکالنا اور خداوند ذوالجلال کی طرف رجوع کرنا انبیاء کرام کا طریقہ ہے۔ کما قال تعالےٰ۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ — سو تو ٹھہرا رہ جیسے ٹھہرے رہے ہیں ہمت والے رسول۔

اس لیے صابرین کو صلوات و عنایات خاصہ سے سرفراز فرمایا اور جان و مال کا جو نقصان ہوا اس کے عوض میں عنایات عامہ یعنی طرح طرح کی رحمتوں اور مہربانیوں سے نوازا۔

ہمارے اس بیان سے صلوٰۃ اور رحمت میں فرق واضح ہو گیا۔ صلوات سے عنایات خاصہ مراد ہیں جو دینی اور دنیوی اور ظاہری اور باطنی برکات کا موجب ہیں اور رحمت سے عنایات عامہ مراد ہیں۔

جو دنیا میں فوت شدہ جان ومال کا عوض اور نعم البدل ہیں۔ خوب سمجھ لو۔ اور ایسے ہی لوگ علاوہ اس کے کہ وہ عنایات خاصہ اور عنایات عامہ کے مورد ہیں۔ ہدایت یافتہ بھی ہیں کہ عین مصیبت کے وقت میں جب کہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی کلمہ شکایت کا زبان سے نکل جائے اور خداوند ذوالجلال کی ناراضگی اور دوری اور مہجوری کا سبب بن جائے ایسے وقت میں قرب خداوندی اور اسکی خوشنودی کا راستہ نکال لیا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کمال ہدایت یہی ہے کہ ہر طرف سے اپنے مطلب کا کھوج لگائے۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ۔

کوئی مصیبت بغیر اللہ کے حکم کے نہیں پہنچتی اور جو بمقتضائے ایمان مصیبت میں ثابت قدم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے قلب پر ہدایت اور معرفت کی راہ کھول دیتے ہیں۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے نعم العدلان و نعم العلاوۃ یعنی اس آیت میں حق تعالیٰ نے صابرین کے لیے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ ایک صلوات اور دوسرے رحمت اور تیسرے ہدایت۔ فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ صلوات اور رحمت جو ایک دوسرے کے قرین اور عدیل ہیں۔ یہ دونوں کیا اچھے عدیل ہیں اور ہدایت ان عدلین کے علاوہ ہے یعنی ایک زیادتی ہے جو صلوۃ اور رحمت پر زیادہ ہے۔

فائدہ (۱) اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصیبت کے وقت تسلی کے دو طریقے ارشاد فرمائے۔ ایک عقلی اور ایک طبعی عقلی تو یہ ہے اِنَّا لِلّٰهِ ہم سب اللہ کی ملک ہیں جس کو چاہے دنیا میں رہنے دے اور جس کو چاہے آخرت میں بلائے۔ عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ مالک کو اختیار ہے کہ اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے لہذا کسی عزیز کے مرنے پر شکایت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کی ملک میں دو گھوڑے ہوں ایک کو یہاں باندھ دے اور دوسرے کو دوسری جگہ باندھ دے تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ یا مالک کسی چیز کو اوپر کی منزل میں رکھ دے اور کسی کو نیچے کی منزل میں رکھ دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جسکو چاہیں دنیا میں رکھیں اور جس کو چاہیں آخرت میں رکھیں۔

اور طبعی یہ ہے وَ اِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ۔ یعنی ہم سب کو وہیں جانا ہے اور وہی ہمارا وطن اصلی ہے اور یہ دنیا تو ایک جیل خانہ ہے اب اگر کسی کو جیل خانہ اور چاہ زندان سے نکال کر گلستان اور بوستان میں لے جاکر ٹھہرا دیں تو حقیقت میں خوشی کا مقام ہے کہ بجائے غم کدہ کے عشرت کدہ مل گیا۔ غرض یہ کہ ایک جملہ یعنی اِنَّا لِلّٰهِ میں عقل کی تسلی ہے اور دوسرے جملہ وَ اِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ میں طبیعت کی تسلی ہے یہ تو تسلی ہوئی۔ مگر باایں ہمہ شریعت نے حزن و ملال اور رونے اور آنسو بہانے کی ممانعت نہیں کی کہ وہ غیر اختیاری امر ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی فضیلت بھی رکھ دی اور یہ فرمایا کہ ھو رحمۃ یعنی آنسو بہانا بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ سبحان اللہ شریعت کی خوبی کو دیکھئے کہ عقل کی اور طبیعت کی اور جذبات کی سب ہی

کی رعایت ہے ۔

(ملخص از وعظ الصلوۃ، وعظ دوم از سلسلۃ البشری از مواعظ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ)

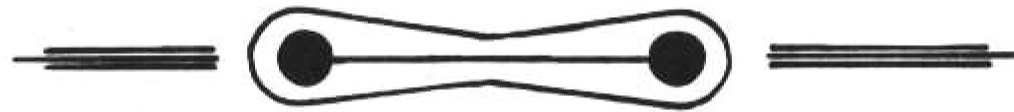
فائدہ ۲: اگر کسی آنے والی مصیبت کی پہلے ہی سے خبر دے دی جائے تو صبر آسان ہو جاتا ہے دفعۃً مصیبت آنے سے آدمی گھبرا جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان مصائب کی پہلے ہی خبر دیدی تاکہ صبر آسان ہو جائے ۔

فائدہ ۳: امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ آیت میں خوفِ سے خوف خداوندی مراد ہے اور بھوک سے رمضان کے روزے اور مالوں کی کمی سے زکوٰۃ اور صدقات مراد ہیں اور اَنفُس یعنی جانوں کے نقصان سے امراض اور بیماریاں مراد ہیں اور ثمرات کے نقصان سے اولاد کا مرنا مراد ہے۔ کیونکہ اولاد انسان کی زندگی کا پھل ہے۔

جامع ترمذی میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جب فرشتے کسی مرد مومن کے بچہ کی روح قبض کر کے لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں ۔

اقبضتم ولد عبدی فیقولون نعم فیقول اقبضتم ثمرۃ قلبہ فیقولون نعم — کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کی روح قبض کر لی۔ کیا تم نے میرے بندہ کے ثمرۂ قلب کو لے لیا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں جی ہاں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بتلاؤ میرے بندہ نے اس مصیبت پر کیا کہا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپکے بندہ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ۔ پڑھی ۔ اور آپکی حمد و ثناء کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندہ کے لیے جنت میں ایک محل تیار کردو اور اسکا نام بیت الحمد رکھو امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے ۔



اِنَّ الصَّفَا وَ الۡمَرۡوَةَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنۡ حَجَّ
صفا اور مروہ جو ہیں نشان ہیں اللہ کے پھر جو کوئی حج

الۡبَیۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ
کرے اس گھر کا یا زیارت تو گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں

وَ مَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۵۸﴾
اور جو کوئی شوق سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدر دان ہے سب جانتا ہے

استشہاد بر فضیلت صبر

قال تعالیٰ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ... الی .... فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝

(ربط) گزشتہ آیات میں صابرین کے لیے اپنی معیت اور صلوات اور رحمت اور ہدایت کا ذکر فرمایا اب آئندہ آیات میں اس کی ایک دلیل اور ایک شاہد ذکر فرماتے ہیں۔ یعنی حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کے صبر جمیل کی ایک یادگار ذکر فرماتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی اسی صبر کی یادگار ہے جنکو صبر کی برکت سے معیت خاصہ سے سرفراز فرمایا اور اپنی صلوات اور رحمتیں ان پر نازل کیں اور اس یادگار صبر کے بیان سے بحث قبلہ اور مناسک حج و عمرہ کی بھی تکمیل ہو جائے گی اور اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ الخ سے بھی سلسلۂ کلام مربوط ہو جائے گا۔ ابتلاء اور امتحان ہی سے سلسلۂ کلام کا آغاز ہوا اور ابتلاء اور امتحان ہی پر اسکا اختتام ہوا۔ نیز ابتداء قصہ میں امامت کا ذکر تھا۔

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا — میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا۔

اور منصب امامت کے لیے صبر کامل اور ایقان تام ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۔ — اور کیے ہم نے ان میں سردار جو راہ چلاتے ہمارے حکم سے جب وہ ٹھہرے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔

اس لیے سلسلۂ کلام کو صبر کے فضائل اور برکات اور اسکے شواہد اور ثمرات پر ختم فرمایا۔

شانِ نزول صفا اور مروہ مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے لوگ ان دو پہاڑیوں کے درمیان میں طواف کرتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں کافروں نے ان پر دو بت رکھ دیئے اور انکی تعظیم کرتے اور انکا استلام کرتے اور یہ سمجھتے کہ یہ طواف ان دو بتوں کی کی تعظیم کے لیے ہے۔ جب زمانہ اسلام کا آیا اور مسلمانوں کو سعی بین الصفا والمروہ کا حکم ہوا تو مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف ان بتوں کی تعظیم کے لیے ہے اور بتوں کی تعظیم اسلام میں ممنوع ہے اس لیے صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق کوہ صفا اور کوہ مروہ اور پہاڑوں کی طرح معمولی پہاڑ تھے مگر حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کے رضا بالقضاء کی برکت سے خدا کی یادگاروں میں سے ہو گئے۔ اور ان کا طواف مناسک حج سے بنا یا گیا سو جو شخص حج بیت اللہ یا عمرہ کا ارادہ کرے اس پر صفا اور مروہ کی سعی اور طواف میں ذرہ برابر گناہ نہیں تم کافروں کی مشابہت سے شبہ میں مت پڑو۔ صفا اور مروہ دراصل شعائر الہیہ میں سے ہیں اور ان کا طواف سراسر خیر اور عبادت ہے۔ اور جو شخص کوئی خیر اور نیکی شوق اور رغبت سے کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی قدردانی

فرماتے ہیں اور اسکی نیت اور اخلاص کو خوب جانتے ہیں۔ اور بقدر اخلاص کے اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔

ف (۱) شعائر شعیرۃ یا شعارۃ کی جمع ہے جسکے معنی علامت اور نشانی کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں شعائر اللہ ان چیزوں کو کہتے ہیں جن سے عام طور پر کفر اور اسلام میں امتیاز پیدا ہو اور انکو شعائر اسلام بھی کہتے ہیں۔

ف (۲) آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی کے حکم سے بت پرستوں کی مشابہت کا خیال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی جسکا حاصل یہ ہے کہ صفا اور مروہ اصل میں اللہ کی یادگاریں ہیں۔ اور کافروں کی مشابہت امر عارضی ہے وہ اس میں موثر نہ ہوگی۔ جب کہ نیت خالص اللہ کی ہو۔ جیسے خانہ کعبہ چند روز غلبۂ کفار کی وجہ سے بیت الاصنام یعنی بت خانہ بن گیا لیکن اسکا قبلہ اور مطاف ہونا ساقط نہ ہوا۔ اس لیے کہ جو شے بالذات ہوتی ہے وہ عوارض کی وجہ سے زائل اور ساقط نہیں ہوتی اس لیے مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی میں کوئی تردد اور تامل نہ ہونا چاہیئے۔ مشابہت کفار اس وقت موجب حرمت ہوتی ہے کہ جب کسی شئے کا شعائر اللہ میں سے ہونا کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جیسے تعظیم نوروز اور ہولی اور دوالی اور دسہرہ اور نصاریٰ کی کرسمس اور جو افعال اللہ کے نزدیک مشروع اور پسندیدہ ہیں ان میں کفار کی مشابہت موثر نہیں جیسے حج اور عمرہ اور ختنہ اور عقیقہ اور قربانی اور کسوف کے وقت صدقہ اور غلاموں کا آزاد کرنا۔ مشرکین عرب میں رائج تھا۔

ف (۳) سعی بین الصفا والمروۃ امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک مستحب ہے جیساکہ "فلا جناح" کے لفظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل ضروری اور واجب نہیں۔ بخاری اور مسلم میں ہے کہ عروۃ بن الزبیرؓ نے عائشہ صدیقہؓ سے عرض کیا کہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (کوئی گناہ نہیں کہ صفا اور مروہ کا طواف کرے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے میرے بھانجے آیت کا یہ مطلب نہیں جو تو نے سمجھا۔ اگر آیت کا وہ مطلب ہوتا جو تو نے بیان کیا تو عبارت قرآنی اس طرح ہوتی فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ یعنی اس شخص پر کوئی گناہ نہیں جو صفا اور مروہ کا طواف نہ کرے اور یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جن کا قصہ یہ ہے کہ انصار قبل اسلام منات کی عبادت کرتے تھے اور جب مسلمان ہوئے اور سعی بین الصفا والمروہ کا حکم ہوا تو کفار کی مشابہت کی وجہ سے دل تنگ ہوئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری و مسلم)

چونکہ انصار پر کفار کی مشابہت کی وجہ سے بین الصفا والمروہ کا کرنا گراں گزر رہا تھا اس لیے اس گرانی کے رفع کرنے کے لیے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں جس سے ترک کی اجازت دینا مقصود نہیں ورنہ اگر ترک سعی کی اجازت دینا مقصود ہوتی تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ فرماتے یعنی کوئی حرج نہیں کہ سعی بین الصفا والمروہ نہ کرے غرض یہ کہ آیت میں لاجناح کا لفظ طواف بین الصفا والمروہ کرنے کے متعلق آیا ہے یعنی کرنے کی اجازت ہے ترک طواف اور

ترک سعی کے مطابق لاجناح نہیں فرمایا کہ جس سے ترک سعی کی اجازت مفہوم ہوتی۔ علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ لاجناح کا لفظ محض اباحت پر دلالت کرتا ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ لفظ محض طواف بین الصفا والمروہ کی اباحت اور جواز پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اساف اور نائلہ یعنی بتوں کے ہوتے ہوئے بھی صفا والمروہ کا طواف جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ مسئلہ دریافت کرے کہ جس کپڑے پر قدر درہم سے کم نجاست لگی ہوئی تو اس کپڑے میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو یہ جواب دیا جائیگا لا جناح علیك ان تصلی فیه یعنی ایسے کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج اور گناہ نہیں۔ تو اس عبارت سے نفس نماز کی اباحت اور اجازت نہیں سمجھی جاتی بلکہ تلیل نجاست کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت مفہوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اصل سعی واجب ہے اور بحالتِ موجودہ جس کی وجہ سے انصار کو گرانی تھی وہ جائز اور مباح ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارا صاف حکم

وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ

اور راہ کے نشان بعد اسکے کہ ہم انکو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں

اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝١٥٩ۙ اِلَّا

ان کو لعنت دیتا ہے اللہ اور لعنت دیتے ہیں سب لعنت دینے والے مگر

الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ

جنہوں نے توبہ کی اور سنوارا اور بیان کر دیا تو ان کو معاف کرتا

عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝١٦٠ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

ہوں اور میں ہوں معاف کرنیوالا مہربان جو لوگ منکر ہوئے

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ

اور مر گئے منکر ہی انہیں پر ہے لعنت اللہ کی اور

الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝١٦١ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ

فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی رہ پڑے اس میں

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

نہ ہلکا ہو گا ان پر عذاب اور نہ انکو فرصت ملے گی

رجوع بخطاب یہود وعید بر کتمانِ حق وجحود

قال تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ .... الی .... وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝

(ربط) گزشتہ آیات میں یہ ذکر فرمایا تھا کہ یہود حق کو جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ مگر باوجود جاننے اور پہچاننے کے حق کو چھپاتے ہیں کما قال تعالےٰ۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ ۔اب اس آیت میں اُس کتمان حق پر وعید ذکر فرماتے ہیں اور توبہ کرنے والوں کے لیے عفو اور رحمت کا ذکر فرماتے ہیں ۔چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق جو لوگ خوب جانتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی شعائر اللہ میں سے ہے اور حضرت ہاجرہؓ کے وقت سے برابر چلی آرہی ہے مگر باوجود اس کے یہ لوگ ان مضامین کو چھپاتے ہیں جنکو ہم نے نازل کیا اور جو اپنی ذات سے واضح اور روشن ہیں اور شعائر اللہ کی ہدایت اور راہنمائی کرتے ہیں بعد اسکے کہ ہم نے اس کو تمام لوگوں کے لیے عام اور خاص سب کے لیے شعائر اسلام اور کفر کے فرق کو خوب واضح کر دیا ہے اور خبر واحد کی طرح نہیں بنایا کسی کو پہنچے اور کسی کو نہ پہنچے اس کتاب الٰہی میں داخل کر دیا ہے تاکہ متواتر ہو جائے اور اس کا اخفاء اور پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جائے ۔لیکن یہ لوگ کمال عداوت کی وجہ سے اسکے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہدایت اور رفع جہالت چاہتا ہے اور یہ لوگ گمراہی اور جہالت کا بقاء چاہتے ہیں اور نیز لعنت کرتے ہیں ان پر سب لعنت کرنے والے ۔ ملائکہ اور ارواح انبیاء وصلحاء تو اس لیے لعنت کرتے ہیں کہ اُنکی کوشش تو یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو بیان کیا جائے اور اُن کی خوب نشر و اشاعت کی جائے اور یہ لوگ ان حضرات کی کوشش کو ضائع کرنا چاہتے ہیں اور عوام اور فساق و فجار اور کفار نابکار اس لیے لعنت کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے انکو حق معلوم نہ ہونے دیا اور چونکہ کتمانِ حق کی وجہ سے طرح طرح کی بلائیں اور مصیبتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں اس لیے تمام حیوانات اور جمادات ان پر لعنت بھیجتے ہیں کہ ان کی وجہ سے مصیبت اور بلا میں گرفتار ہوئے۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ جب قحط پڑتا ہے اور بارش بند ہو جاتی ہے تو جانور گناہ کرنے والوں پر لعنت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کم بختوں کی وجہ سے نحوست آئی مگر جن لوگوں نے محض اللہ کی ناراضی کے ڈر سے حق پوشی سے توبہ کر لی۔ اور حق پوشی کی وجہ سے جو خرابی آئی تھی اس کی اصلاح کر لی یعنی جو عقائد اور اعمال اور حقوق اور اموال لوگوں کے حق پوشی کی

وجہ سے خراب اور برباد ہوئے تھے انکی اصلاح کر دی اور گزشتہ غلطیوں کا تدارک کر دیا اور جس حق کو چھپایا تھا اسکو لوگوں کے سامنے بیان کر دیا تو ایسے لوگوں کو میں معاف کر دیتا ہوں اور بجائے لعنت کے ان پر رحمت نازل کرتا ہوں اور میں تو بڑا ہی توبہ کا قبول کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہوں کہ توبہ کرنے سے لعنت کو رحمت سے اور سزا کو انعام سے بدل دیتا ہوں۔ تحقیق جو لوگ حق پوشی کی وجہ سے کفر کی حد تک پہنچ گئے اور بدون توبہ کے کفر کی حالت میں مر گئے ایسے لوگوں پر اللہ کی اور تمام فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی مستمر لعنت ہے۔ حتیٰ کہ خود اس کی بھی اس پر لعنت ہے اس لیے کہ یہ کافر خود یہ کہتا ہے کہ جو دیدہ دانستہ حق کو چھپائے اس پر اللہ کی لعنت اور یہ نہیں سمجھتا کہ میں بھی خود اس عموم میں داخل ہوں۔ اور یہ لوگ ہمیشہ اس لعنت میں رہیں گے۔ یہ لعنت کبھی ان سے منقطع نہ ہوگی کیونکہ بغیر توبہ کے مرے ہیں۔ ذرا برابر انکے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی بلکہ دم بدم زیادتی ہوتی رہے گی۔ دنیا میں دن بدن ان کا کفر اور تمرد بڑھتا تھا، آخرت میں عذاب بڑھتا رہے گا اور نہ انکو مہلت دی جائے گی کہ کچھ دیر آرام کر لیں اور آئندہ کے لیے عذاب سہنے کی کچھ قوت آجائے اس لیے کہ عذاب میں تخفیف اور مہلت یہ بھی ایک قسم کا لعنت سے نکلنا ہے جو ان کے حق میں ناممکن اور محال ہے۔

وَإِلَٰهُكُمْ	إِلَٰهٌ وَاحِدٌ	لَا إِلَٰهَ	إِلَّا هُوَ	الرَّحْمَٰنُ
اور تمہارا رب	اکیلا رب ہے	کسی کو پوجنا نہیں	اسکے سوا	بڑا مہربان ہے

الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾
رحم والا

۱۹ ع ۱۱ ۳

اعلانِ توحید

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں اللہ کے احکام چھپانے والوں پر لعنت اور عذاب کا ذکر فرمایا آئندہ آیت میں حق تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کا ذکر فرماتے ہیں کہ وہی ایک معبود ہے اسکے سوا کہیں پناہ نہیں جو اسکی لعنت سے تمکو چھڑا سکے اور اس کے سوا کوئی رحمان اور رحیم نہیں جو خدا کی لعنت اور نقمت کو رحمت اور عنایت سے بدل دے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ رحمت عامہ اور خاصہ سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس لیے بدون اسکی رحمت کے لعنت سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں اگر خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ تم کو اسکی لعنت سے نکال لیتا اور

تم پر رحمت کرتا لیکن اسکے سوا کوئی خدا نہیں جو رحمت عامہ اور خاصہ کا مالک ہو اور عجب نہیں کہ اس خطاب میں اہل کتاب کو تہدید اور عتاب ہو کہ باوجود دیکھ توریت اور انجیل میں اللہ کی توحید کی صریح آیتیں مذکور ہیں اور پھر بھی تم حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا بتلاتے ہو اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو اور اس توحید کو جو تم کو معلوم ہے چھپاتے ہو۔ غرض یہ کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو چھپانے کی وجہ سے بھی مستحق لعنت ہوئے اور توحید خداوندی کے اخفاء اور کتمان کی وجہ سے بھی موردِ لعنت بنے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ

آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور

الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ

دن کا بدلتے آنا اور کشتی جو لیکر چلتی ہے دریا میں

بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ

جو چیزیں کام آویں لوگوں کو اور وہ جو اللہ نے اتارا آسمان سے

مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا

پانی پھر جلایا اس سے زمین کو مر گئے پیچھے اور بکھیرے اس میں

مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ

سب قسم کے جانور اور پھیرنا باؤں کا اور ابر جو حکم کا

الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ

تابع ہے درمیان آسمان اور زمین کے ان میں نمونے ہیں

یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

عقلمند لوگوں کو

دلائل توحید

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ... الیٰ.... لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ہ

(ربط) جب آیۃ وَ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ نازل ہوئی تو مشرکین نے تعجب سے کہا کہ کیا سارے جہان کا ایک ہی خدا ہے اگر ایسا ہے تو اس پر کیا دلیل ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں جن میں توحید کے دلائل بیان فرمائے کہ علویات اور سفلیات اور متوسطات اور ان کے احوال وصفات سب دعوائے وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق (۱) آسمانوں اور (۲) زمین کی پیدائش میں (۳) اور دن ورات کی آمد ورفت اور اُن کے مختلف ہونے میں (۴) اور اُن جہازوں اور کشتیوں میں کہ جو دریا میں لوگوں کی منافع کی چیزوں کو لیکر چلتی ہیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو آدمی اور سامان پہنچاتی ہیں جہاں آدمیوں اور جانوروں کا پہنچنا ممکن نہیں (۵) اور اس پانی میں کہ جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل کیا اور پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا یعنی خشکی اور قحط سالی کے بعد قسم قسم کے پھول اور پھل اس میں اُگائے (۶) اور ہر قسم کے جانور اس میں پھیلائے (۷) اور ہواؤں کے پھرنے میں کبھی مشرق کا چکر لگاتی ہیں اور کبھی مغرب کا اور کبھی شمال کا اور کبھی جنوب کا (۸) اور اس ابر میں کہ جو آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہے حالانکہ ہزار من پانی سے بھرا ہوا ہے باوجود اس عظیم ثقل کے زمین پر گر نہیں جاتا۔ ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کے عجیب وغریب دلائل اور براہین ہیں ان لوگوں کے لیے جو اپنی عقل کو نظر اور فکر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال حکمت اور اس کی وحدانیت اور رحمت پر مختلف طرح سے دلالت کرتی ہیں۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) آسمانوں میں غور کیجئے کہ تمام آسمان حقیقت اور طبیعت جرمیہ کے اعتبار سے ایک ہیں مگر کوئی چھوٹا ہے اور کوئی بڑا۔ اور پھر کواکب اور نجوم، ثوابت اور سیارات، شمس اور قمر اور زہرہ اور مریخ اور مشتری میں غور کیجئے۔ ہر ایک کی شان جدا ہر ایک کا رنگ جدا، ہر ایک کی حرکت جدا اور حرکت کی سمت اور جہت جدا ہر ایک کا برج جدا۔ ہر ایک کا طلوع اور غروب جدا۔ اس عجیب نظام کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کارخانہ خودبخود تو نہیں چل رہا ہے بلکہ کسی علیم وقدیر اور مدبر حکیم کے ہاتھ میں اس کی باگ ہے کہ وہ محض اپنے ارادہ اور مشیت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں۔ اور افلاک اور شمس وقمر کی حرکات سے منافع عالم کا مربوط ہونا یہ اس کی کمال رحمت کی دلیل ہے

(۲) اور علیٰ ہذا زمین کی پیدائش بھی اس کی وحدانیت اور رحمت کی دلیل ہے۔ زمین کے قطعات کا مختلف اللون اور مختلف الخاصیت ہونا کہ کسی زمین سے گھانس پیدا اور کسی سے انناس۔ اور کسی سے بادام پیدا ہو اور کسی سے آم۔ کسی زمین کے بسنے والے عاقل اور کسی جگہ کے بسنے والے ایسے کودن اور نادان کہ بعض چیزوں میں حیوان بھی ان سے بہتر نکلے یہ اختلافات کہاں سے آئے اور کس طرح آئے۔ زمین کا مادہ اور طبیعت تو ایک ہی ہے وہ کون ذات ہے کہ جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کو شور اور بنجر بنایا اور دوسرے کو سبزہ زار اور مرغزار بنایا یہ سب اسی علیم وقدیر کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ جس کی قدرت اور حکمت کے سمجھنے سے تمام عالم قاصر اور عاجز ہے یہ دلیل تو وحدانیت کی ہوئی اور زمین رحمتِ خداوندی کی دلیل اس طرح سے ہے کہ تمام عالم کے بسنے والے اسی زمین پر چل کر اپنی حاجتیں پوری کرتے ہیں اسی سے پیدا شدہ غذاؤں اور پھلوں

اور چشموں اور نہروں سے نفع اٹھاتے ہیں اور تمام سونا اور چاندی وغیرہ وغیرہ سب اسی زمین میں اللہ کی قدرت سے پیدا ہوتا ہے۔ کانوں کا مختلف ہونا اسکی وحدانیت کی دلیل ہے اور ان کا نافع اور مفید ہونا اس کی رحمت کی دلیل ہے۔ آسمان اور زمین علیحدہ علیحدہ بھی رحمت ہیں اور دونوں مل کر بھی رحمت ہیں اس لیے آسمان اور زمین کے اختلاط اور تقابل سے جو منافع اور فوائد پیدا ہوتے ہیں، ان کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔

(۳) اور اسی طرح لیل ونہار کا مختلف ہونا کہ کبھی دن ہے کبھی رات۔ کبھی دن بڑا اور رات چھوٹی اور کبھی اس اس کا برعکس، کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے یا کسی قادر مطلق کے ہاتھ میں اس کی ڈور ہے اگر دن نہ ہوتا اور فقط رات ہوتی تو تمام عالم مستمر اور دائم ظلمت اور تاریکی کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا اور چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا اور اگر رات نہ ہوتی فقط دن ہی دن ہوتا تو تمام عالم گرمی سے بلبلا اٹھتا اور کھیتیاں جل کر خاک ہو جاتیں اور اس راحت اور آرام سے کہ جو رات کی نیند سے اسے حاصل ہوتا ہے تمام جہان یک لخت محروم ہو جاتا معلوم ہوا کہ لیل ونہار کا اختلاف جس طرح اسکی وحدانیت کی دلیل ہے اسی طرح اسکی رحمانیت کی بھی دلیل ہے۔

(۴) اور علی ہذا جہاز اور کشتی بھی اسکی قدرت اور رحمت کی دلیل ہے۔ ایک تولہ لوہا یا تانبا ایک منٹ کے لیے پانی پر نہیں ٹھہر تا مگر جہاز اور کشتی کہ جس میں ہزار ہا من لوہا اور تانبا لدا ہوا ہوتا ہے ایک ملک سے دوسرے ملک تک ہزار ہا میل طے کر کے صحیح وسالم پہنچتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالے کی وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہے۔

(۵، ۶) اور علی ہذا آسمان سے باران رحمت کا نازل ہونا اور زمین کا اس سے سرسبز اور شاداب ہو جانا اور قسم قسم کے اشجار اور نباتات اور فواکہ اور ثمرات کا اس سے پیدا ہونا اور علی ہذا اس سے حیوانات کا ایسا مختلف اللون پیدا ہونا کہ ایک کی شکل اور صورت دوسرے کی شکل اور صورت سے نہ ملے یہ بھی اس کی وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہے اس لیے کہ یہ اختلاف بے شمار فوائد اور منافع پر مشتمل ہے۔ حق تعالے نے اپنی قدرت اور حکمت سے حیوانات دو قسم کے بنائے ایک تو وہ جو بطریق توالد اور تناسل پیدا ہوتے ہیں جیسے انسان اور اونٹ اور بیل اور بکری۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو بطریق تولید پیدا ہوتے ہیں جیسے ہزار ہا حشرات الارض مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور ہزار ہا مچھر اور جھینگر برسات کے پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی صورت اور شکل الگ اور ہر ایک کا رنگ الگ جس سے باہمی فرق اور امتیاز کا نفع اور فائدہ ہوتا ہے اور یہ حق تعالے کی عظیم رحمت اور مہربانی ہے ورنہ اگر سب ایک رنگ اور ایک شکل کے ہوتے تو پہچاننا ممکن نہ تھا۔ اگر آدمی اور حیوانات باہم ممتاز نہ ہوتے تو کارخانۂ معاش معطل اور درہم برہم ہو جاتا ایک انسان کے چہرہ میں غور کرو کہ آنکھ بھی ہے اور کان بھی اور ناک بھی ہے اور زبان بھی، سر بھی ہے اور دماغ بھی۔ ایک عجیب وغریب تصویر ہے قوائے عقلیہ اور حسیہ کا مجموعہ ہے اور خداوند ذوالجلال

کی قدرت اور کمال کا بے مثال آئینہ ہے اور آنکھ، کان اور زبان کے جو بے شمار فوائد اور منافع ہیں وہ اُس رحمٰن و رحیم کی رحمت کاملہ کے دلائل اور براہین ہیں۔

حکایت کسی نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ شطرنج بھی عجیب کھیل ہے کہ باوجود مختصر ساطول وعرض ہونے کے ہزار مرتبہ بھی کھیلا جاتے تو ایک بازی دوسری بازی کے موافق نہ پڑے گی۔ تو جواب میں فرمایا کہ انسان کا چہرہ اس سے بھی عجیب ہے کہ باوجود آنکھ اور ابرو اور کان اور زبان وغیرہ کبھی اپنی معین جگہ سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتے مگر باایں ہمہ ہر فردِ بشر ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہے۔ خداوند ذوالجلال کی اس تقدیر اور تدبیر بے نظیر سے کارخانۂ عالم چل رہا ہے ورنہ اگر سب ہم شکل ہوتے تو باپ بیٹے کو بھائی بھائی کو نہ پہچانتا (تفسیر کبیر)

(۷) اور علیٰ ہذا ہواؤں کا بدلنا اور گرمی سے سردی کی طرف اور سردی سے گرمی کی طرف ان کا پھرنا اور کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی شمال سے جنوب کی طرف اُن کا چلانا یہ سب اسکی قدرت اور وحدانیت کی دلیل ہے۔ اور ہوا کا وجود عالم کے لیے عجیب رحمت ہے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ اگر تین دن تک ہوا بند رہے تو سارا عالم متعفن اور بدبودار ہو جاتے۔

(۸) اور علیٰ ہذا بادل کا آسمان اور زمین کے درمیان معلق رکھنا یہ بھی اس کے کمالِ قدرت کی دلیل ہے کہ باوجودیکہ بادل ہزار ہا ٹن پانی سے بھرا ہوا ہے مگر نیچے نہیں گرتا۔ بادل سر سے گزر رہا ہے مگر کسی کی مجال نہیں کہ اس میں سے ایک گلاس پانی ہی نکال لے، جہاں حکم ہو گا وہیں جاکر برسے گا۔ یہ آٹھ دلیلیں ہیں جو حق تعالیٰ کی وحدانیت اور رحمانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو پکڑتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو

اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

ان کی محبت رکھتے ہیں جیسے محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو

اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ

اس سے زیادہ محبت ہے اللہ کی اور کبھی دیکھیں بے انصاف اس وقت کو جب دیکھیں گے

الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

عذاب کہ زور سارا اللہ کو ہے اور اللہ کی مار

الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

سخت ہے

استعجاب واستبعاد بر اتخاذ انداد بعد واضح شدن وحدانیت رب عباد

قال تعالیٰ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ .... الیٰ .... وَ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ ۝

(ربط) گزشتہ آیات میں اہل عقل اور اہل نظر کا بیان تھا۔ اب اس آیت میں بدعقلوں کا بیان ہے کہ جب اللہ کی وحدانیت اور اسکی رحمانیت کے دلائل اظہر من الشمس ہیں تو عقل کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کو عبادت اور محبت کے ساتھ مخصوص کرتے۔ اور لیکن بعضے آدمی ظاہراً انسانی عقل وشعور رکھتے ہیں اللہ کی نعمت کو خوب پہچانتے ہیں مگر حد آدمیت اور دائرۂ انسانیت سے باہر ہیں کہ اللہ کے سوا جو کہ منعم حقیقی ہے ایسے ہمسر اور شریک بناتے ہیں جو خداوند ذوالجلال سے اس درجہ فروتر اور کمتر ہیں کہ خدا سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ دلائل اور براہین سے تو یہ ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک بھی شریک اور ہمسر نہیں ہو سکتا اور یہ لوگ اس درجہ بے عقل ہیں کہ ایک شریک اور ایک ہمسر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خدا کے لیے بہت سے شرکاء اور ہمسر بناتے ہیں اور خدا کے مثل اور برابر انکو محبوب رکھتے ہیں اور خدا کی طرح ان کی تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں اور خدا کے حکم کی طرح انکے حکموں کو بے چون وچرا واجب الاطاعت سمجھتے ہیں اور ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کی محبت اور اطاعت میں فرق ہونا چاہیئے۔ اس لیے اہل ایمان اگرچہ بعض چیزوں کو شرعاً و طبعاً محبوب رکھتے ہیں مگر اس درجہ محبوب نہیں رکھتے کہ ان کو خدا کے برابر کر دیں بلکہ وہ اللہ کی محبت میں بہت سخت اور محکم ہیں اس لیے کہ دنیا میں جو بھی فضل وکمال یا جود ونوال ہے اسکا منبع اور سرچشمہ خداوند ذوالجلال ہے اور مخلوق اسکا عکس اور پرتو ہے اس لیے اہل ایمان خالق کو بالذات محبوب اور مخلوق کو بالعرض محبوب رکھتے ہیں اس لیے کہ محبت۔ محبوب کی عزت اور کمال کے مطابق ہوتی ہے اور عزت اور کمال اور جود ونوال میں خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں وہی منعم حقیقی ہے اس لیے راحت اور شدت، بیماری اور تندرستی، شادی اور غمی کسی حال میں بھی اہل ایمان کی محبت اللہ سے کم نہیں ہوتی۔ بخلاف مشرکین کے کہ جب اپنے معبودوں سے ناامید ہو جاتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور خدا تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ فَاِذَا رَکِبُوۡا فِی الۡفُلۡکِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ۔

اور اگر یہ ظالم کہ جنہوں نے خدا کا شریک اور ہمسر بنا کر اپنی جانوں پر ظلم وستم

کیا اس آنے والے[1] وقت کو دیکھ لیں کہ جس وقت انکو عذاب الٰہی کا مشاہدہ ہوگا تو[2] انکو خوب معلوم ہو جائے کہ سارا زور اللہ ہی کے لیے ہے اور تمام کائنات ضعیف اور عاجز ہے اور سب اللہ کے قہر اور غلبہ کے نیچے دبے ہوئے ہیں سوائے اسکے کوئی بھی نفع اور ضرر کا مالک نہیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالےٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ کوئی بت اور کوئی معبود کسی کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتا۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا

جب الگ ہو جاویں جن کے ساتھ ہوئے تھے اپنے ساتھ والوں سے

وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾

اور دیکھیں عذاب اور ٹوٹ جاویں انکے سب طرف کے علاقے

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ

اور کہیں گے ساتھ پکڑنے والے کاش کہ ہم کو دوسری بار زندگی ہو تو ہم الگ

كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ

ہو جاویں ان سے جیسے یہ الگ ہو گئے ہم سے اسی طرح دکھاتا ہے اللہ انکو کام انکے افسوس

عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ ع



دلانے کو اور ان کو نکلنا نہیں آگ سے

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ آیت اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ میں عذاب سے عذاب اخروی مراد ہے اور اِذْ معنی میں اِذَا کے ہے اس لیے کہ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ الخ اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ* سے بھی عذاب اخروی ہی مراد ہو گا۔ اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ عذاب سے دنیوی عذاب اور دنیوی مصائب اور تکالیف مراد ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت یہ لوگ دنیاوی مصائب اور فقر و فاقہ اور دکھ اور بیماری میں بتلا ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس وقت غور و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ امر خوب واضح ہو جائے کہ سارا زور اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ سب عاجز اور درماندہ ہیں اس لیے کہ یہ بت مصیبت اور بلا کو ٹال نہیں سکتے اور جب یہ امر ان پر واضح ہو جائے تو پھر کسی کو خدا کے برابر محبوب نہ رکھیں ۱۲ منہ

[2] اشارۃ الی تقدیر الجزاء وھو یعلموا ان القوۃ للّٰہ الخ ۱۲

* سے بدل ہے اور ظاہر ہے کہ یہ آخرت میں ہوگی اور بدل اور مبدل منہ متحد ہوتے ہیں لہٰذا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ

انجامِ شرک

قال تعالیٰ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا ... الی ... وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ۔

اور اس شدید عذاب کا وقت ۔ وہ وقت ہو گا کہ جب پیشوا اپنے پیرووں سے الگ اور بیزار ہو جائیں گے اور تابع اور متبوع ، گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں فریق عذاب خداوندی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں گے ۔ اور دنیا میں جو باہمی تعلقات تھے وہ اس روز سب منقطع ہو جائیں گے نہ کوئی تابع رہے گا اور نہ کوئی متبوع ہر ایک جرم میں شریک ہو گا سب پر فرد جرم لگ چکی ہوگی ۔ ہر ایک کو اپنی فکر ہو گی لیکن اس وقت یہ تبری اور بیزاری ذرہ برابر مفید نہ ہوگی ۔ سب کف افسوس ملیں گے ۔ اور جن لوگوں نے دوسروں کی پیروی کی تھی اور دوسروں کے بہکانے سے کفر اور شرک کیا تھا وہ اس وقت جھنجھلا کر یہ کہیں گے کہ کاش ہمکو پھر ایک دفعہ دنیا میں لوٹنے کا موقع ملے تو ہم بھی ان سے اپنا بدلہ لیں اور ہم بھی ان سے اسی طرح بیزار ہوں جس طرح یہ لوگ ہم سے بیزار ہوئے ۔ مگر اس بیزاری سے انکو سوائے حسرت کے کوئی فائدہ نہ ہو گا اور قیامت کے دن فقط یہی ایک حسرت نہ ہو گی بلکہ اسی طرح اللہ تعالےٰ ان کے تمام اعمال کو ان پر حسرتیں بنا کر دکھلائے گا ۔ قیامت کے دن انکے تمام صدقات اور قربات ایک ایک کرکے ضائع اور رائیگاں ہوں گے اور حسرتوں کی کوئی انتہا نہ ہوگی ۔ اور یہ لوگ تو کبھی دوزخ سے نکلیں گے ہی نہیں کیونکہ شرک کی سزا دائمی عذاب ہے البتہ گنہ گار مسلمان انبیاء اور صلحاء کی شفاعت سے بعد چندے جہنم سے نکال لیے جائیں گے ۔

فائدہ چونکہ مسند الیہ کی تقدیم مفید حصر ہوتی ہے اس لیے آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ عدم خروج من النار ۔ کفار کے ساتھ مخصوص ہے ۔ معلوم ہوا کہ کفار کے علاوہ کوئی فریق ایسا بھی ہے جو کہ بعد چندے دوزخ سے نکالا جائے گا وہ گنہ گار مسلمانوں کا فریق ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا

اے لوگو ! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو حلال ہے اور نہ

تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا

چلو قدموں پر شیطان کے وہ تمہارا دشمن ہے صریح وہ تو یہی

[1] اشارۃ الی ان اذ تبرأ الذین اتبعوا بدل من اذ یرون العذاب ۔ ۱۲

يَأْمُرُكُم بِالسُّوٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ
حکم کرے گا تمکو برے کام اور بے حیائی اور یہ کہ جھوٹ بولو اللہ پر
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۹﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ
جو تم کو معلوم نہیں اور جو ان کو کہے چلو اس پر جو نازل کیا
اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۗ أَوَ
اللہ نے کہیں نہیں ہم چلیں گے اس پر جس پر دیکھا اپنے باپ دادا کو بھلا
لَوْ كَانَ ءَابَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْـًٔا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾
اگرچہ اُنکے باپ دادا نہ عقل رکھتے ہوں کچھ نہ راہ کی خبر
وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِى يَنْعِقُ بِمَا
اور مثال ان منکروں کی جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلّاتا ہے ایک
لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَآءً وَنِدَآءً ۚ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ
چیز کو جو سنتی نہیں مگر پکارنا اور چلّانا بہرے گونگے اندھے ہیں
فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾
سو اُن کو عقل نہیں

خطابِ عام و تذکیرِ انعام و ابطالِ رسومِ شرکیہ و تفصیلِ حلال و حرام

قال تعالیٰ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِى الْأَرْضِ حَلَٰلًا طَيِّبًا ... الیٰ ... فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝

(ربط) گزشتہ آیات میں عقیدۂ شرک کی قباحت اور مشرکین کی تقبیح و تجہیل فرمائی۔ اب آئندہ آیات میں رسوم شرکیہ اور اعمال کفریہ کا ابطال اور حلال و حرام کی تفصیل فرماتے ہیں۔

(ربط دیگر) گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کا معبود برحق اور رحمٰن و رحیم ہونا بیان فرمایا۔ ان آیات میں حق تعالیٰ کا رازق ہونا بیان فرماتے ہیں کہ وہی رازق ہے اور وہی تمام ارزاق کا خالق ہے جس چیز کو

وہ حلال کرے وہ حلال ہے اور جس چیز کے استعمال کو منع فرمائے وہ حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے لوگو! جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں کا انجام سوائے حسرت کے کچھ نہیں تو اپنے پیشواؤں کی رائے پر مت چلو اور ان کے کہنے سے کسی چیز کو اپنے اوپر حلال اور حرام نہ کرو۔ کیونکہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کی ہمسری ہے حلال و حرام ہونا محض اللہ کے حکم کے تابع ہے اس لیے کہ سب چیزیں اللہ ہی کی ملک ہیں کسی کو اللہ کی ملک میں تصرف کا حق حاصل نہیں کہ حلت و حرمت کا حکم لگائے۔ لہذا تم اس فعل قبیح سے توبہ کرو اور کھاؤ اس چیز سے جو اللہ کی زمین میں پیدا ہوئی بشرطیکہ وہ حلال بھی ہو اور پاکیزہ بھی ہو۔ اور حلال وہ ہے کہ جس کی شریعت نے ممانعت نہ کی ہو اور طیب وہ ہے جو بالکل پاک اور صاف ہو کسی غیر کا حق اس سے متعلق نہ ہو۔ مثلاً غصب اور خیانت اور رشوت اور سود یا کسی اور ناجائز طریقہ سے اسکو حاصل نہ کیا گیا ہو اس لیے کہ جو چیز فی حد ذاتہ حلال ہو مگر دوسرے کا حق اسکے ساتھ متعلق ہو تو اسکا کھانا بھی جائز نہیں جیسے کوئی شے اصل میں تو پاک ہو اور بعد میں نجاست آلود ہو جائے تو اس کا کھانا جائز نہیں رہتا۔ اور حلت اور حرمت میں اللہ کے حکم کا اتباع کرو اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے شیطانی وسوسوں کی بناء پر اسکے کھانے سے پرہیز نہ کرو تحقیق وہ شیطان تمہارا قدیمی اور کھلا دشمن ہے اسکے کہنے میں نہ آنا دشمنی میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتلاتا ہے جز ایں نیست کہ وہ تمکو برائی کا حکم دیتا ہے تاکہ عذاب آخرت کے مستحق ہو جاؤ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے تاکہ مخلوق کی نظر میں بھی حقیر ہو جاؤ۔

ف (۱) سوء کا تعلق افعال سے ہے اور فحشاء کا تعلق اخلاق سے ہے۔ اور نیز شیطان تم کو اس بات کا بھی حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جنکا تم کو علم نہیں۔ ایسے عقائد اور اعمال کی تمکو تلقین کرتا ہے جنکی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

ف (۲) بدعت کی بھی یہی حقیقت ہے کہ جس کام کو اللہ نے موجب ثواب قرار نہیں دیا اُس کام کو بلا دلیل شرعی موجب ثواب قرار دے۔

ف (۳) شیطان کبھی نیک کام کا بھی حکم کرتا ہے جیسا کہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان انکو تہجد یا صبح کی نماز کے لیے جگانے آیا سو وہ اس آیت کے معارض نہیں اس لیے کہ شیطان اگرچہ ظاہر میں نیکی کا حکم کرتا ہے لیکن مقصود اسکا بدی ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر گناہ نہیں کرتا تو کم از کم اس کو چھوٹی طاعت میں لگا دیا جاوے تاکہ بڑی عبادت کر کے اجر عظیم نہ حاصل کر سکے۔

ع ہر چہ گیرد علتی علت شود

اور یہ لوگ دامِ شیطانی میں اس درجہ گرفتار ہیں کہ آبائی رسوم کو حکم خداوندی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں حتیٰ کہ جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ حکم کا اتباع کرو اور اپنے باپ دادا کے طریقہ کو چھوڑ دو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم کو نہیں جانتے بلکہ ہم اس رسم کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے

آباؤ اجداد کو پایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔ دنیاوی امور میں اگرچہ بڑے عاقل اور ہوشیار ہیں لیکن دین اور آخرت کی عقل سے کورے ہیں۔ شجر اور حجر کو خدا بناتے ہوئے ہیں۔ دانایانِ فرنگ کو دیکھ لو جنکی عقل کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بج رہا ہے وہ تین میں ایک اور ایک میں تین کے قائل ہیں۔

ف (۴) اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے روحانی یا جسمانی آباء و اجداد عقل بھی رکھتے ہوں اور ہدایت یافتہ بھی ہوں اور ما انزل اللہ کے اشارات اور کنایات کو خوب سمجھتے ہوں تو ایسے آباء و اجداد کا اتباع اور تقلید عین عقل اور عین ہدایت بلکہ عین ما انزل اللہ کا اتباع ہے۔ حکمِ خداوندی کے خلاف کسی کا اتباع بلاشبہ گمراہی ہے لیکن حکم خداوندی کے سمجھنے کے لیے اگر کم عقل والا اپنے سے زیادہ عقل والے کا اتباع کرے تو عین ہدایت اور مقتضیٰ عقل ہے آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ فقط بے عقل ہی نہیں بلکہ فی الحقیقت حدودِ انسانیت سے خارج ہیں جانوروں کی طرح ہیں اشیاء کے حسن و قبح اور نفع اور ضرر کو نہیں سمجھتے۔ البتہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ کون سا گھانس اچھا ہے اور کون سا گھانس کڑوا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ داعیِ حق کے اعتبار سے ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بھیڑ بکریوں اور جانوروں کو چلاّ چلاّ کر پکار رہا ہو اور وہ جانور سوائے بلانے اور پکارنے کے کچھ نہ سنتا ہو۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے کہ واعظ اور ناصح کی آواز تو سنتے ہیں مگر اسکی حقیقت کو نہیں سمجھتے یہ لوگ اگرچہ ظاہر میں سنتے ہیں مگر حقیقت میں بہرے ہیں کلمۂ حق سُن نہیں سکتے باطل کے حق میں بڑے مقرر ہیں لیکن حق کے حق میں گونگے ہیں۔ حق بات زبان سے نہیں نکل سکتی۔ سب کچھ دیکھتے ہیں مگر دل کے اندھے ہیں حق اور باطل کا فرق نظر نہیں آتا۔ پس اس لیے کہ ان کے تمام حواس جو عقل کے مبادی اور مقدمات ہیں وہ سب مختل بلکہ گم ہیں۔ اس لیے یہ لوگ حق اور ہدایت کو کچھ نہیں سمجھتے۔ پس یہ لوگ جانوروں کی طرح عقلِ معاش رکھتے ہیں آخرت کی عقل سے عاری اور کورے ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

اے ایمان والو! کھاؤ ستھری چیزیں جو تمکو روزی دی ہم نے

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾ اِنَّمَا

اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کے بندے ہو یہی

حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ

حرام کیا ہے تم پر مردہ اور لہو اور گوشت سور کا اور

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ

جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کا پھر جو کوئی پھنسا ہو نہ

بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

بے حکمی کرتا ہے اور نہ زیادتی تو اس پر نہیں گناہ تحقیق اللہ بخشنے والا

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

مہربان ہے

خطاب خاص باہل اختصاص

قال تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ... الیٰ ... اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں خطاب عام تھا۔ اور اس آیت میں خاص اہل ایمان کو خطاب ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ایمان اور محبت خداوندی کا اقتضاء یہ ہے کہ خدا کے رزق کو کھاؤ اور شکر کرو۔ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ۔ الآیۃ نعمت کے استعمال سے منعم کی محبت پیدا ہوتی ہے اور شکر کرنے سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔ نیز احادیث سے ثابت ہے کہ اکل حلال سے دعا اور عبادت قبول ہوتی ہے۔ اور اکل حرام سے دعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔ اکل حلال سے مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! ایمان اور محبت کا یہ مقتضیٰ نہیں کہ تم اپنے خیال سے لذیذ اور پاکیزہ چیزوں کو ترک کر دو اور اس کو عبادت سمجھنے لگو بلکہ مقتضائے ایمان اور محبت یہ ہے کہ جو حلال اور پاک چیزیں ہم نے تمکو عطا کی ہیں انکو رغبت کے ساتھ کھاؤ۔ عاشق تو معشوق کے ہاتھ کی دی ہوئی تلخ چیز کو بھی شیریں سمجھ کر کھاتا ہے تو ہمارے رزق کو اس خیال سے کھاؤ کہ ہم نے تم کو یہ رزق دیا ہے۔ اسباب اور وسائط کو محض پردہ سمجھو اصل مالک اور معطی ہم ہیں۔ عطیہ کے ساتھ بے رغبتی معطی کے ساتھ بے رغبتی کو موہم ہے لہٰذا منعم حقیقی کی طرف سے جو نعمت آئے اس کو بصد شوق و رغبت استعمال کرو۔ تاکہ منعم تم سے راضی ہو۔ اور یہ مت سمجھو کہ پاکیزہ چیزوں کے استعمال سے حظ نفس میں گرفتار ہو جائیں گے جو عبادت سے غفلت کا سبب بنے گا۔ اس کی تدبیر یہ کرو کہ تم اللہ کا شکر کرو تاکہ تمہاری یہ لذت عین عبادت بن جائے کیونکہ پاکیزہ رزق کھانے سے اللہ کی محبت پیدا ہوگی اور محبت سے شکر نکلے گا اور شکر ایک عظیم عبادت ہے جس سے اللہ کی نعمت اور

عنایت میں زیادتی ہوتی ہے اس طرح تم لذت کو عبادت بنا سکتے ہو اگر تم خالص اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اپنے خیال کو اس میں دخل نہ دو اس لیے کہ عبادت سے مقصود رضائے حق ہے وہ جس طرح بھی حاصل ہو۔ ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

الغرض پاکیزہ چیزوں کا کھانا ایمان اور محبت کے منافی نہیں۔ البتہ حرام چیزوں کا استعمال اللہ کی ناراضی اور اس سے دوری کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں جز این نیست کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف ایسی چیزوں کو حرام فرمایا جو جسمانی اور روحانی حیثیت سے تمہارے لیے مضر ہیں۔ ایک مردار کو جو خود بخود مر گیا ہو یا شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو اور بہتے ہوئے خون کو اور خنزیر کے گوشت کو کیونکہ یہ جانور حرص اور بے حیائی اور بے غیرتی اور نجاست خوری میں مشہور ہے جو قومیں خنزیر کھاتی ہیں ان سے حیا اور عزت و ناموس رخصت ہو جاتی ہے۔ نیز یہ جانور انسان کے فضلہ کو بہت رغبت کیساتھ کھاتا ہے اور فضلۂ انسانی خنزیر کی خاص خوراک ہے اور اس کا گوشت پوست زیادہ تر فضلۂ انسانی سے پیدا ہوتا ہے لہذا خنزیر کا گوشت کھانا گویا کہ اپنا ہی فضلہ کھانا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اسکی نسبت فرمایا فَاِنَّهٗ رِجْسٌ یعنی یہ نجس العین ہے۔

اور حرام کیا اللہ نے اس جانور کو کہ جو بقصد تقرب غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو جس جانور کی جان کو اللہ کے سوا کسی بت یا کسی نبی یا ولی کی روح کے لیے نذر کر دیا جائے اور ان کی رضا اور خوشنودی کے لیے اس کو ذبح کیا جائے تو اس جانور کا کھانا حرام ہے اگرچہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اس لیے کہ جانور کی جان صرف اللہ کی ملک ہے آدمی کی ملک نہیں کہ دوسرے کو بخش دے اس لیے جانور کی جان کو غیر اللہ کے نام زد کر دینا صریح شرک ہے اور ظاہر ہے کہ شرک کی نجاست اور گندگی تمام نجاستوں سے زیادہ سخت ہے لہذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے تو اس شرک کی نجاست اور خباثت اس جانور میں اس درجہ سرایت کر جاتی ہے کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام بھی لیا جائے تب بھی وہ جانور حلال نہیں ہوتا جیسے کتا اور سور خدا کا نام لیکر ذبح کرنے سے بھی حلال نہیں ہوتا۔ آخر مردار اسی وجہ سے تو حرام ہے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ لہذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے وہ بدرجۂ اولیٰ حرام ہو گا۔ البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد ذبح سے پہلے ہی اپنی اس فاسد نیت سے توبہ کر لے اور اس ارادۂ فاسد سے رجوع کر لے تو پھر وہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کرنے سے حلال ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔

لعن اللّٰہ من ذبح لغیر اللّٰہ — اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جو غیر اللہ کی تعظیم اور تقریب کی نیت سے جانور ذبح کرے۔

⁂

لغیر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ نیت غیر اللہ کی ہو۔ خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لے یا نہ لے۔ اسی طرح مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ جو جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو جس سے مقصود غیر اللہ

کی تعظیم ہو وہ حرام ہے خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ یہ لفظ قرآن کریم میں چار جگہ آیا ہے اور سب جگہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فرمایا اور کسی جگہ یہ نہیں فرمایا ماذبح باسم غیر اللہ کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ غیر اللہ کا نام لیکر ذبح کرنا اور ہے اور غیر اللہ کے تقرب اور رضا حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنا اور ہے۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے لغیر اللہ اور باسم غیر اللہ کا فرق معمولی استعداد والوں پر بھی مخفی نہیں۔ "اہلال" کے لغوی معنی عربی زبان میں شہرت اور آواز دینے کے ہیں۔ لفظ اہلال لغت عرب میں ذبح کے معنی میں نہیں آتا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے بعد مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ۔ کو علیحدہ ذکر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ اہلال لغیر اللہ اور شے ہے اور ذبح لغیر اللہ اور شے ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ نے آیت مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تفسیر میں ۵۴ صفحہ کا ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا ہے جو فارسی میں ہے اور عجیب وغریب حقائق ومعارف پر مشتمل ہے اس وقت ہم اس کا خاص اور اہم اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ وہو هٰذا۔

"حلت اور حرمت کا دارومدار نیت پر ہے اور ذکر لسانی اس نیتِ قلبی کا ترجمان ہے اس لیے بغیر ذکر لسانی نیت قلبی کی اطلاع ناممکن ہے۔ حدیث میں ہے۔ انما الاعمال بالنیات عمل کی حقیقت یہی نیت قلبی ہے اور حرکات خاصہ صورتِ عمل ہیں اگر عمل ہے اور نیت نہیں تو جسم بے جان ہے اور كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً کا مصداق ہے معلوم ہوا کہ حلت اور حرمت کی علت ذبح کے وقت فقط زبان سے اللہ یا غیر اللہ کا نام لینا نہیں بلکہ حلت کی اصل علت خاص اللہ کی نیت ہے اور حرمت کی اصل علت غیر اللہ کی نیت ہے اور آیۂ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ میں فقط ذکر لسانی مراد نہیں اس لیے کہ اصل ذکر اور ذکر حقیقی وہ ذکر قلبی ہے اور ذکر لسانی کو اس لیے ذکر کہا جاتا ہے کہ وہ ذکر قلبی کا ترجمان ہے اس لیے کہ اگر کوئی شخص دل سے کسی کی یاد میں محو ہو اور زبان سے ساکت ہو تو وہ ذاکر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر زبان سے کسی کا نام لے اور دل میں کوئی اور بسا ہوا ہو تو حقیقت شناس لوگوں کے نزدیک یاد کرنے والوں میں اسکا شمار نہیں ہو سکتا نیت قلبی ایمان کی طرح باطنی ہے اور ذکر لسانی کلمۂ شہادت کی طرح اسکا ترجمان ہے۔ کلمۂ شہادت کو ایمان کی حقیقت نہیں کہا جا سکتا ورنہ لازم آئیگا کہ مؤمن کلمۂ اسلام کے تلفظ کے وقت مومن ہوا اور اس تلفظ سے پہلے مؤمن نہ ہوا اسی طرح جس شخص نے کسی جانور کے متعلق نیت تو غیر اللہ کی کی اور اس جانور کو غیر خدا کے لیے تجویز کر دیا مگر ذبح کے وقت زبان سے نام اللہ کا لیا تو اسکا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ تقرب غیر اللہ کی نیت کے بعد ذبح کے وقت محض زبان سے اللہ کا نام لینا عمل بے روح ہے۔

مشرکین عرب، نیت بھی غیر اللہ ہی کی کرتے تھے اور ذبح کے وقت بھی نام غیر اللہ ہی کا لیتے تھے اور مؤمنین مخلصین نیت بھی خاص اللہ ہی کی کرتے تھے اور نام بھی خاص اللہ ہی کا لیتے تھے۔ بتدعین نیت تو

کرتے ہیں غیر اللہ کی۔ اور ذبح کے وقت نام لیتے ہیں اللہ کا۔ یہ بین بین صورت شرک بھی ہے اور نفاق بھی ہے کہ صورت توحید کی ہے اور معنی شرک کے ہیں۔ اس تیسری قسم کا مصداق اس امت کے مشرک ہیں۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر ؛ ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اول کی دو صورتوں میں ظاہر اور باطن میں کوئی تخالف نہیں اس لیے اسکا حکم ظاہر ہے اور اس تیسری صورت میں ظاہر اور باطن میں تخالف ہے اس لیے کہ باطن میں نیت تو ہے غیر اللہ کی اور ظاہر میں ذبح کے وقت نام ہے اللہ کا۔ اس لیے اعتبار ظاہر کا نہ ہوگا۔ ایسا جانور اگرچہ ظاہر میں فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ کی قسم سے معلوم ہوتا ہے لیکن باطن اور حقیقت میں لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ کے قبیل سے ہے جس کا مقتضیٰ صریح ممانعت اور حرمت ہے ذکر لسانی کو اگر حلت اور حرمت میں دخل ہے تو باعتبار صورت کے ہے اور مرتبہ ثانیہ میں ہے۔ اور ذکر پنہانی اور نیت اندرونی کو باعتبار حقیقت کے مرتبۂ اولیٰ میں دخل ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ حلت و حرمت میں ذکر لسانی کو تو دخل ہو اور ذکر پنہانی کو اسمیں دخل نہ ہو۔ پس جس جانور میں نیت تو غیر اللہ کی ہو اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے تو اسکی حقیقت تو دوسری قسم کی ہوگی اور صورت دوسری قسم کی ہوگی۔ اور جب صورت اور حقیقت میں تعارض اور تخالف ہوا تو ترجیح حقیقت کو ہوگی۔

نیز جان کی نذر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے غیر اللہ کے لیے جان کی نذر جائز نہیں۔ اور اگر بالفرض جان کی نذر غیر اللہ کے لیے جائز ہوتی تو قربانی من جملہ عبادات کے نہ ہوتی اور قربانی اور غیر قربانی کے احکام نیت کے فرق پر مبنی ہیں۔

بطور احتمال عقلی یہاں ایک چوتھی قسم اور بھی نکل سکتی ہے جو اس قسم ثالث کا بالکل عکس ہے وہ یہ کہ نیت تو ہے خاص اللہ کے لیے نذر کی مگر ذبح کے وقت نام لیا جائے غیر اللہ کا یہ قسم آج تک کبھی وجود میں نہیں آئی محض احتمال عقلی کا درجہ ہے وجود نفس الامری سے اس کو کوئی حصہ نہیں ملا۔ نیز جاننا چاہیئے کہ آیت شریفہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں اہلال باعتبار زمانہ کے عام ہے وقت ذبح کے ساتھ مخصوص اور مقید نہیں اور جن حضرات مفسرین نے عند الذبح زیادہ فرمایا ہے انکی مراد تقیید اور تخصیص نہیں بلکہ یہ لفظ اس لیے زیادہ کیا ہے کہ نیت سابقہ کا علم اور ظہور ذبح کے وقت ہوتا ہے۔ اگر اللہ کے تقرب کی نیت ہے تو ذبح کے وقت اللہ کا نام لے گا۔ اور اگر غیر اللہ کی نیت کی ہے تو ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لے گا۔ نزول آیت کے زمانہ میں اللہ کی نذر اور غیر اللہ کی نذر میں امتیاز اور فرق اسی طرح ہوتا تھا کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ کی نذر ہے اور غیر اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی نذر ہے اور مشرکین امت کی یہ تیسری قسم کہ نیت تو ہو غیر اللہ کی اور ذبح کے وقت نام ہو اللہ کا یہ قسم اس زمانہ میں موجود ہی نہ تھی۔ یہ شرک اور توحید کا معجون مرکب بعد میں نمودار ہوا۔ یہ بین بین قسم اگر ظاہر اور صورت کے اعتبار سے جائز ہوگی تو باطن اور

حقیقت کے اعتبار سے ناجائز ہوگی۔ حاصل یہ کہ عند الذبح کی قید اس زمانے کے دستور کی طرف اشارہ کے لیے ہے احترازی قید نہیں عند الذبح کی قید اس لیے ذکر فرمائی ہے کہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کسی نے حیوان کو غیر اللہ کے نامزد کیا اور غیر خدا کے تقرب کی نیت کی تو اس جانور کی حرمت اس شرط پر موقوف ہے کہ اس کی یہ نیت ذبح کے وقت تک باقی رہے اور اگر ذبح سے پہلے اس نیت فاسدہ سے توبہ کرلے اور اللہ کے نام پر ذبح کرے تو پھر یہ جانور حرام نہ رہے گا بلکہ حلال ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ عند الذبح کی قید نیت اور فعل ذبح میں مقارنت اور اتصال کے بیان کرنے کے لیے ہے اور تبدل نیت اور تغیر ارادہ سے احتراز کے لیے ہے کہ اگر غیر اللہ کی نیت فعل ذبح کے ساتھ متصل اور مقرون ہے تب تو وہ جانور حرام ہے اور اگر ذبح سے پہلے نیت بدل جائے تو حرمت بھی مبدل بہ حلت ہو جائے گی۔

نیز عند الذبح میں لفظ عند ظرف زمان ہے جو محض اقتران پر دلالت کرتا ہے علیت پر دلالت نہیں کرتا اور حکم حلت وحرمت کا دارومدار علت پر ہے۔ ظرفیت زمانیہ اور مکانیہ پر اس کا مدار نہیں اور یہاں حرمت کی علت اہلال لغیر اللہ ہے اور عند الذبح کی قید اہلال اور ذبح میں اقتران بیان کرنے کے لیے ہے یعنی درمیان میں کوئی دوسری نیت فاصل اور متخیل نہیں۔ پس اگر علت یعنی نیت غیر اللہ ابتداء سے اخیر تک یعنی وقت ذبح تک مستمر ہے تو حرمت بھی مستمر ہے اور اگر علت یعنی نیت بدل جائے تو معلول یعنی حرمت بھی بدل جائے گی۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ما اہل بہ لغیر اللہ سے صرف وہی جانور مراد ہے کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے اور تشہیر سابق اور نیت متقدمہ کو حرمت میں کوئی دخل نہیں تب بھی اثبات حلت کے لیے کافی نہیں اس لیے کہ حرمت فقط مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں منحصر نہیں۔ سرقہ اور غصب کا گوشت اور مردار خور جانور کا گوشت بھی حلال نہیں حالانکہ وہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل نہیں اسی طرح یہ جانور اگرچہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل نہ ہو تب بھی حلال نہ ہوگا اس لیے کہ فقط غیر اللہ کے تقرب کی نیت حرمت کے لیے کافی ہے واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم (ماخوذ از مکتوب سوم از مکاتیب قاسم العلوم)

الغرض حق جل شانہ نے ان چیزوں کو حرام فرمایا کہ یہ چیزیں گندی اور ناپاک ہیں ان چیزوں کے استعمال سے انسان کا قلب اور اس کی روح گندہ اور ناپاک ہو جاتی ہے۔ حلال چیزوں کے کھانے سے قلب میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور حرام چیزوں کے استعمال سے دل سے اللہ کی محبت رخصت ہو جاتی ہے اور قلب میں بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معصیت کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ گندگی اور نجاست کا کیڑا گندگی ہی سے زندہ رہتا ہے۔ عطر سونگھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے شدید مجبوری کی حالت میں ان چیزوں کی حرمت میں کچھ سہولت اور رخصت عطا فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ پس جو شخص بھوک سے بہت ہی مجبور اور لاچار ہو۔ اور دل اسکا ان چیزوں کے کھانے سے متنفر اور بیزار ہو پس اگر ایسا شخص ان میں سے کسی چیز کو کھائے

بشرطیکہ وہ طالب لذت نہ ہو اور مقدار حاجت سے تجاوز نہ کرنے والا ہو یعنی سد رمق سے زیادہ نہ کھائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اس لیے کہ خبیث اور گندی چیز کا بقدر ضرورت استعمال بحالت مجبوری، کراہت قلب اور دلی نفرت کے ساتھ روح اور قلب کو گندہ نہیں کرتا۔ لیکن آخر گندی چیز تو گندی ہی ہے اسکا کچھ نہ کچھ اثر اور رنگ ضرور آئیگا مگر چونکہ یہ فعل بحالتِ مجبوری صادر ہوا ہے اس لیے حق تعالیٰ اس سے مؤاخذہ نہ فرمائینگے اس لیے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں کہ اس ناچاری کی حالت میں جو گندی چیز استعمال کی ہے اس پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ اور بڑے مہربان ہیں کہ اس پر بڑا رحم فرمایا کہ اس بے چارگی کی حالت میں کھانے کی اجازت عطا فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَ

جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور

يَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي

لیتے ہیں اس پر مول تھوڑا وہ نہیں کھاتے اپنے

بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ

پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ قیامت

الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۴﴾

کے دن اور نہ سنوارے گا انکو اور ان کو دکھ کی مار ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ

وہی ہیں جنہوں نے خرید کی گمراہی بدلے راہ کے اور مار

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

بدلے مہر کے سو کیا سہار ہے انکو آگ کی

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ

یہ اس واسطے کہ اللہ نے اتاری کتاب سچی اور جنہوں نے



اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۱۷۶﴾

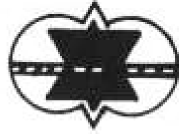
کئی راہیں نکالیں کتاب میں وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں

ذکرِ محرّماتِ معنویہ مثل دین فروشی وحق پوشی

قال تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ... الیٰ ... لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ

(ربط) گزشتہ آیات میں محرمات حسیہ کا بیان تھا۔ ان آیات میں محرمات معنویہ کو بیان کرتے ہیں جو حرمت میں محرمات حسیہ سے بڑھ کر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق جو اہل کتاب میتہ اور خنزیر کی حرمت پر اعتراض کرتے ہیں تعجب ہے کہ یہ لوگ اس علم کو چھپاتے ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے اتارا ہے اس علم کو چھپا کر مخلوق کو گمراہ کر رہے ہیں اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس امانت کی خیانت کے معاوضہ میں دنیا کا معمولی اور حقیر معاوضہ حاصل کر رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو مال دین کو فروخت کر کے اور حق کو چھپا کر حاصل کیا جائے وہ مردار اور خنزیر سے زیادہ ناپاک ہے ایسے لوگ اپنے شکموں میں سوائے آگ کے کچھ نہیں بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بلاواسطہ کلام بھی نہیں کریں گے۔ حالانکہ قیامت کے دن دربار عام ہوگا۔ مومن اور کافر۔ فاسق وفاجر سب جمع ہونگے اس دن کی ہم کلامی کوئی رتبہ اور شرف نہیں رکھتی۔ وہ دن تو عدالت اور فیصلہ کا ہوگا مجرم اور قصوروار بھی اسکا کلام سنیں گے لیکن یہ لوگ اس دن بھی کلام الٰہی سے محروم رہیں گے۔ غصہ اور سرزنش بھی بواسطہ فرشتوں کے ہوگی اور نہ اس دن انکو اللہ تعالیٰ پاک وصاف کریگا جیسے گنہگار مسلمانوں کو اس لیے عذاب دیا جائے گا کہ وہ پاک وصاف ہو کر دخول بہشت کے قابل ہو جائیں لیکن ان لوگوں کو اس لیے عذاب دیا جائے گا کہ ہمیشہ تکلیف اور درد اٹھاتے رہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ اور ان کے لیے ہمیشہ کا دردناک عذاب ہوگا۔ یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں اور عذاب کو مغفرت کے بدلہ میں بہزار رضا ورغبت خرید لیا ہے یہ اس قابل نہیں کہ انکو پاک کیا جائے اور اللہ کے کلام سے انکو عزت بخشی جائے یا کم از کم انکو دردناک عذاب سے نجات ہی دیجائے۔ ان لوگوں نے خود ہی اپنے لیے آگ کو پسند کیا ہے بس شاباش ہو انکی ہمت وجرارت پر۔ یہ لوگ آگ پر بڑے ہی صبر کرنے والے ہیں اور تمام سزائیں اس لیے ہیں کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا تاکہ لوگوں پر حق واضح ہو اور تحقیق جن لوگوں نے ایسی کتاب میں بے راہی اختیار کی کہ اسکے مقصود ہی کو بدل دیا۔ اظہار حق کی بجائے کتمان حق کرنے لگے، تحقیق حق کے بجائے تلبیس حق کرنے لگے تو بلاشبہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی کھلی مخالفت میں ہیں کہ جس کتاب کو ہدایت کے لیے نازل فرمایا تھا اسکو گمراہی کا ذریعہ بنا لیا۔ اور ظاہر ہے کہ جو منشار خداوندی کی کھلم کھلا مخالفت کرے وہ

ایسی ہی سزاؤں کا مستحق ہوگا۔



لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ

نیکی یہی نہیں کہ منہ کرو اپنے مشرق یا مغرب

وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

کی طرف لیکن نیکی وہ ہے جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ

پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دلوے مال

عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

اس کی محبت پر ناتے والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو

وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَ

اور راہ کے مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور

اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

کھڑی رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ

جب قول کریں اور ٹھہرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور

حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ

وقت لڑائی کے وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی

هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

بچاؤ میں آئے۔

ابواب البرّ والصّلہ

قال تعالیٰ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ۔۔۔۔ الیٰ ۔۔۔۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

یہاں پہنچ کر سورۂ بقرہ نصف ہو جاتی ہے۔ ابتدار سورت سے یہاں تک کے نصف میں اُمتِ دعوت کو خطاب تھا۔ یعنی ان لوگوں کو خطاب اور عتاب تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر تھے اور اس میں بھی زیادہ تر خطاب بنی اسرائیل کو رہا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے مگر چھپاتے تھے اور اقرار نہیں کرتے تھے۔ اور اس اخیر نصف میں امتِ اجابت کو خطاب ہے اور مختلف قسم کے احکام کی تعلیم اور تلقین ہے جو عبادات اور معاملات اور معاشرات وغیرہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس طرح سے یہ تفصیل اخیر سورت تک چلی گئی ہے۔

نیز سورۃ کے نصف اول میں زیادہ تر اصول دین اور ایمانیات کا بیان تھا اور اس اخیر نصف میں زیادہ تر احکامِ عملیہ کا بیان ہے۔ پھر جب ان احکامِ عملیہ کا آغاز فرمایا تو مجملاً ان تمام احکام کو لفظِ برّ سے تعبیر فرمایا جو برّ بمعنی وسعت سے ماخوذ ہے یعنی احکامِ عملیہ کا ایک وسیع اور طویل وعریض سلسلہ جو نصف سورت سے شروع ہو کر اخیر سورت تک چلا گیا۔ پھر ان احکامِ عملیہ کے بیان میں عجیب ترتیب کو ملحوظ رکھا کہ پہلے اصولِ برکو بیان فرمایا یعنی ایمانیات اور مکارمِ اخلاق کو بیان کیا جنکا شروع سورت میں یعنی اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ الخ میں اجمالاً ذکر تھا اور پھر فروعِ برّ کو بیان فرمایا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان احکامِ عملیہ کے مجموعہ کو "ابواب البر والصلہ" سے موسوم اور ملقب کیا جائے جیسا کہ صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک مستقل کتاب اور باب ہے۔ واللہ الہادی الیٰ سواء الطریق وبیدہٖ ازمۃ التوفیق والتحقیق۔

اصُول برّ

(ربط) گزشتہ آیات میں اہل کتاب کی حق پوشی اور رشوت ستانی اور ہدایت کے بدلہ میں ضلالت کو خریدنے کا بیان تھا اب آئندہ آیات میں اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب باوجود ان قبائح اور شنائع کے اپنے کو اہل برّ اور ابرار میں سمجھتے اور اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ نجات کے لیے فقط استقبال قبلہ کافی ہے اور یہ سب غلط ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نیکی اور خوبی فقط اسکا نام نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو لیکن اصل نیکی یہ ہے کہ اپنے دلوں کو اللہ کی طرف پھیر دو اور اس کی رضا اور اطاعت کو اپنا قبلۂ توجہ بناؤ۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک نیک وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے یعنی ذات وصفات میں اس کو یکتا اور یگانہ سمجھے اور آخری دن پر بھی یعنی قیامت کے آنے پر اور فرشتوں پر بھی ایمان

لائے۔ فرشتوں پر۔ ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ سمجھے کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں بغیر اُسکی مرضی کے کچھ نہیں کرتے نور سے پیدا ہوئے کسی کے دو بازو ہیں اور کسی کے تین اور کسی کے چار اور کسی کے زیادہ ہیں معصوم ہیں کھانے اور پینے سے پاک ہیں۔ اور تمام آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر بغیر تفریق کے ایمان لائے کہ جن کے واسطہ سے اللہ کے صحیفے اور اسکے احکام ہم تک پہنچے جن میں بعض احکام۔ گزشتہ بعض احکام کے ناسخ ہیں۔ ان تمام چیزوں کے اعتقاد میں بِرّ ہے اور اخلاق و اعمال میں بِرّ یہ ہے کہ مال کو باوجود محبوب اور ضرورتمند ہونے کے بلا تخصیص قرابت داروں کو محض حق قرابت کی وجہ سے دے تاکہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں کو جمع کر سکے اور یتیموں کو دے کہ جو بوجہ خردسالی کے کسب معاش نہیں کر سکتے اور بوجہ بے پدری کے کوئی انکا خبرگیراں نہیں اور ان غریب محتاجوں کو دے کہ جن کی آمدنی اُن کے ضروری خرچ سے کم ہے اور صبر و سکون[1] کی وجہ سے نہ وہ کسی سے سوال کرتے ہیں اور نہ اظہار حاجت کرتے ہیں۔ اور مسافروں کو دے جنکے پاس سفر میں خرچ نہ رہا ہو اگرچہ وطن میں مال ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ ابن السبیل سے مسافر مراد ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابن السبیل سے مہمان مراد ہے۔ اور سوال کرنے والوں کو دے خواہ مسلمان ہوں یا کافر۔ اگرچہ ہمیں ان کی حاجت اور ضرورت کا علم نہ ہو۔ اس لیے کہ ظاہر یہی ہے کہ بلا ضرورت کوئی عاقل سوال اور گدائی کی ذلت گوارا نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوال کرنے والے کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو رمال دے، گردنوں کے چھڑانے میں۔ یعنی غلاموں کے آزاد کرانے یا مسلمان قیدیوں کے چھڑانے میں جو کافروں کے ہاتھ میں گرفتار ہوں۔ یا قرض داروں کو قرض کی قید سے چھڑانے میں یا قیدیوں کے فدیہ دینے میں اپنا مال خرچ کرے۔

یہ تو حقوق العباد میں بِرّ یعنی نیکی کا بیان ہوا۔ اور حقوق اللہ میں بر اور نیکی یہ ہے کہ نماز کو قائم کرے اور تمام اعضاء سے اللہ کا حق ادا کرے اور زکوٰۃ دے جو کہ مال میں اللہ کا حق ہے۔ یہ وہ خصال بِرّ ہیں جو اللہ تعالےٰ نے بندوں پر لازم کی ہیں۔ اب آئندہ آیات میں ان خصال بِرّ کا ذکر فرماتے ہیں کہ جن کو آدمی خود اپنے اوپر لازم کرلے۔ چنانچہ فرماتے اور وہ لوگ بھی نیک ہیں جو اپنے عہد کو وفا کریں جو اللہ سے یا مخلوق سے کیا ہے۔ اللہ سے جو نذر مانی ہے یا کسی سے کوئی عہد کیا ہے اس کا ایفاء لازم ہے لیکن یہ واجب ہے کہ جس وقت عہد کیا ہے اسی وقت نیت وفا کی رکھیں۔ جو شخص عہد کرتے وقت نیت وفا کی رکھے وہ عنداللہ وفا کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ اگرچہ بعد میں کسی مجبوری سے وفاء عہد نہ کر سکے اور جس شخص نے عہد کرنے وقت وفاء کی نیت نہیں کی لیکن بعد میں لوگوں کی ملامت کی وجہ سے اپنے عہد کو پورا کیا تو یہ وفا

---

[1] سکون کے لفظ میں مسکین کے مادہ کی طرف اشارہ ہے اور عدم سوال میں لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کی طرف اشارہ ہے۔ نیز حدیث میں ہے لیس المسکین الذی ترده التمرة والتمرتان واللقمة واللقمتان ولکن المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن له فیتصدق علیه۔

معتبر نہیں انما الاعمال بالنیات اور اہل برّ میں ان لوگوں کا خاص طور پر شمار ہے جو صبر اور تحمل کرنے والے ہیں تنگ دستی اور شدتِ فقر میں اور حالت مرض میں اور لڑائی کے وقت میں۔ انسان پر تین قسم کی مصیبتیں آتی ہیں مالی اور بدنی اور روحانی۔ فقر مالی مصیبت ہے اور مرض بدنی مصیبت ہے اور لڑائی میں چونکہ جان کا خطرہ ہے تو وہ روحانی مصیبت ہے اور صابر کامل وہ ہے جو تینوں مصیبتوں میں صبر کرے اور اگر بعض مصیبتوں پر صبر کرے اور بعض پر نہ کرے تو وہ صابر کامل نہیں ایسے ہی لوگ اعتقادات میں سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی اور پرہیزگار ہیں جنکے اخلاق و اعمال درست ہیں ابرار اور اہل برّ وہی لوگ ہیں جن میں یہ تمام اوصاف جمع ہوں۔ یہود اور نصاریٰ کو نیکوکاری کا دعویٰ زیبا نہیں اس لیے کہ ان لوگوں کا نہ ایمان درست ہے اور نہ اخلاق و اعمال درست ہیں۔ ایمان باللہ میں تو یہ قصور کیا کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ نیز یہود نے یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ ط اور اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ کہا اور گوسالہ کو معبود بنایا اور اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ کہا۔ اور نصاریٰ اتحاد اور حلول کے قائل ہوتے۔ اور ایمان معاد میں یہ قصور کیا کہ جنت کو اپنے لیے مخصوص کیا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ۔ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً کہا اور ایمان بالملائکہ میں یہ قصور کیا کہ جبریل امینؑ کو اپنا دشمن جانا اور فرشتوں کی عصمت کے منکر ہوئے۔ اور ایمان کتب میں یہ قصور کیا کہ دنیاوی منافع کے لیے اللہ کی کتابوں میں تحریف کی اور حق کو چھپایا۔ اور ایمان انبیاء میں یہ قصور کیا کہ انبیاء میں تفریق کی اور بہت سے نبیوں کو قتل کیا اور ان پر اطمینان نہ کیا۔ بات بات میں حضرات انبیاء سے حجتیں اور بحثیں کیں، اور دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہوئے کہ احکام الٰہی کو رشوت لیکر بدل ڈالا اور دین کو دنیا کے بدلہ میں فروخت کیا اور گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں خریدا۔ اور بدعہدی تو انکی معروف اور مشہور ہے اور بے صبری یہاں تک پہنچی کہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ کہہ دیا اور بزدلی اس حد تک پہنچی کہ باوجود وعدۂ فتح کے اِذْھَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ ۔ کہہ کر بیٹھ گئے۔ پھر کس بناء پر نیکوکاری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ صحابہ کو دیکھو کہ ہر چیز میں کامل اور صادق ہیں۔ ایمان میں اور اخلاق میں اور اعمال میں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

ف اس آیت میں برّ کی چھ قسمیں بیان ہوئیں اوّل۔ ایمان کے اصول خمسہ۔ دوم۔ ایتاء مال محبوب سوم اقامۃ صلوٰۃ۔ چہارم ایتاء زکوٰۃ۔ پنجم۔ وفاء عہد۔ ششم صبر علی الباساء والضراء و حین الباس۔ پس جس نے ان چھ چیزوں کو مکمل کر لیا اُس نے برّ کو مکمل کر لیا اور ابرار کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔

الْقِصَاصُ	عَلَیْکُمُ	اٰمَنُوْا کُتِبَ	الَّذِیْنَ	یٰٓاَیُّھَا
برابر	بدلا	پر	حکم ہوا تم	اے ایمان والو !

فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ

مارے گیوں میں صاحب کے بدلے صاحب اور غلام کے بدلے غلام

وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ

اور عورت کے بدلے عورت پھر جس کو معاف ہوا اس کے بھائی کی طرف سے

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ

کچھ ایک تو چاہیئے مرضی پر چلنا موافق دستور کے اور پہنچانا اسکو نیکی سے یہ آسانی

تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ

ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی پھر جو کوئی زیادتی کرے بعد اسکے

ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ

تو اسکو دکھ کی مار ہے اور تم کو قصاص میں

حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

زندگی ہے اے عقلمندو شاید تم بچتے رہو

فروعِ برّ یعنی احکامِ عملیہ و فروعیہ کا بیان

قال تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ .... الی .... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝
گزشتہ آیات میں اصولِ برّ کا بیان تھا۔ اب اسکے بعد فروعِ برّ یعنی احکامِ عملیہ و فرعیہ کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ جس میں زیادہ تر احکام جزئیہ کا بیان ہے۔

حکم اوّل دربارۂ قصاص

اے ایمان والو ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ کے جو احکام تمہارے لیے لکھ دیئے گئے ہیں اُن سے سرِمو تجاوز نہ کرو خصوصًا خون کے معاملہ میں خاص صبر سے کام لو اور جوشِ انتقام میں حدودِ شرع سے تجاوز نہ کرو۔ مقتولین بقتل عمد کے بارے میں تم پر مساوات اور برابری فرض کر دی گئی ہے۔ ایک مقتول کو دو کر مقتول کے

برابر سمجھو۔ حسب اور نسب اور علم وفضل وغیرہ وغیرہ کی وجہ سے قصاص میں تامل نہ کرو۔ جاہلیت کے دستور پر نہ چلو۔ جاہلیت کا دستور یہ تھا کہ شریف النسب لوگوں کے غلام کے بدلہ میں رذیل لوگوں کے آزاد قتل کرتے تھے اور ایک عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کرتے اور ایک مرد کے بدلہ میں کئی کئی آدمیوں کو قتل کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امتیاز کو ختم فرما دیا اور حکم دے دیا کہ جانیں سب کی برابر ہیں۔ قصاص کے بارے میں امیر اور غریب، شریف اور رذیل کا کوئی فرق نہیں ورنہ اگر قصاص میں اس قسم کے امتیازات کا لحاظ کیا جائے تو قصاص کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ آزاد برابر ہے آزاد کے۔ اگرچہ ایک امیر یا شریف ہو اور دوسرا فقیر یا رذیل ہو اور غلام برابر ہے غلام کے۔ اگرچہ ایک غلام کسی معمولی آدمی کا ہو اور دوسرا غلام بادشاہ کا ہو۔ اور عورت برابر ہے عورت کے اگرچہ ایک بیگم ہو اور دوسری مزدورنی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ضروری ہے اور جاہلیت کا یہ طریقہ کہ اشراف اپنے غلام کے عوض میں آزاد کو قتل کریں اور اپنی عورتوں کے عوض میں مردوں کو قتل کریں اور ایک مرد کے عوض میں کئی کئی مردوں کو قتل کریں یہ ہرگز درست نہیں۔ جانیں سب برابر ہیں۔

یہ اس آیت کا ظاہری مدلول اور منطوق ہے۔ اور مفہوم مخالف اس آیت کا یہ ہے کہ غلام آزاد کے برابر نہیں اور عورت مرد کے برابر نہیں سو آیت کریمہ اسکے حکم سے ساکت ہے۔ ائمہ دین کا اس میں اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح غلام بدلہ میں آزاد کے اور عورت بدلہ میں مرد کے قتل کی جائے گی اسی طرح آزاد بدلہ میں غلام کے اور مرد بدلہ میں عورت کے قتل کیا جائے گا۔ شوافع یہ کہتے ہیں کہ آزاد کو بمقابلۂ غلام اور مرد کو بمقابلۂ عورت قتل نہ کیا جائے گا بلکہ دیت لے لی جائے گی۔ حنفیہ کہتے ہیں اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ سے زمانۂ جاہلیت کی رسم کو باطل کرنا مقصود ہے اور یہ مقصود نہیں کہ غلام آزاد کے برابر نہیں ورنہ لازم آئیگا کہ باندی اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو اور آزاد مرد اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو۔ حالانکہ باندی اور آزاد عورت میں بالاجماع کوئی فرق نہیں اور اسی طرح آزاد مرد اور آزاد عورت میں بالاتفاق کوئی فرق نہیں پس جس طرح باندی کا آزاد عورت سے قصاص لیا جاتا ہے اور آزاد عورت کا آزاد مرد سے قصاص لیا جاتا ہے اسی طرح غلام کا آزاد مرد سے بھی قصاص لیا جائے گا۔

نیز شوافع کا یہ استدلال۔ آیت کے مخالف سے ہے اور مفہوم مخالف کی دلالت اول تو ظنی ہے اور دوم یہ کہ مفہوم مخالف کا اعتبار اسی حد تک درست ہے کہ جب تک وہ مفہوم کسی دوسری نص صریح کے منطوق اور عموم کے منافی نہ ہو اور اس آیت کا مفہوم آیت اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ اور حدیث المسلمون؏ تتکافأ دماءھم۔ کے منافی ہے اس لیے اس جگہ مفہوم مخالف کا اعتبار نہ ہوگا اور اَلْحُرُّ

؏ تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں ۱۲

بِالْحُرِّ الخ سے جو بظاہر قصر مفہوم ہوتا ہے وہ قصر اضافی پر محمول ہو گا۔ رسمِ جاہلیت کے مقابلہ میں قصر مراد ہے قصرِ حقیقی مراد نہیں۔

فائدہ جاننا چاہیئے کہ مقتولین میں فقط قصاص یعنی فقط جان لینے کے اعتبار سے برابری اور مساوات ہے قتل کی کیفیت میں مساوات اور برابری نہیں۔ مثلاً یہ جائز نہیں کہ آگ سے جلانے والے کو آگ میں جلایا جائے اور پانی میں غرق کرنے والے کو پانی میں غرق کرکے مارا جائے اور اگر کسی نے کسی کو جادو سے مارا ہے تو اسکو جادو سے مارا جائے۔ اس لیے فِي الْقَتْلٰى فرمایا فِي الْقَتْلِ نہیں فرمایا۔ مقتولین میں برابری ہے۔ کیفیتِ قتل میں برابری نہیں خوب سمجھ لو۔

اب قصاص کے بعد مسئلۂ عفو کا بیان فرماتے ہیں پس جو شخص کہ اس کے لیے اس کے بھائی کی جانب سے اگر پوری معافی نہ ہو بلکہ کچھ تھوڑی سی بھی معافی ہو جائے بایں طور کہ بعض وارث معاف کردیں اور بعض نہ کریں تو قاتل سے قصاص ساقط ہو جائیگا اور دیت بذمۂ قاتل واجب ہو جائے گی اس لیے کہ خون کوئی شئی منقسم نہیں کہ اسکا بعض حصّہ تو لیا جائے اور بعض حصّہ چھوڑا جائے اس لیے قصاص تو ساقط ہو جائے گا اور جن وارثوں نے خون معاف نہیں کیا ہے۔ انکو بقدر انکے حصّہ کے دیت دلائی جائے گی۔ ایسی صورت میں قاتل قصاص سے تو بری الذمہ ہو جائیگا البتہ اس کے ذمہ یہ واجب ہو گا کہ معاف کرنے والے کی مرضی کا اتباع کرے جو اس کی مرضی ہو اسکو قبول کرے بشرطیکہ وہ معمول شرع کے مطابق ہو ایسی شرط نہ ہو جو شریعت کے خلاف ہو مثلاً ولیٔ مقتول۔ قاتل سے یہ کہے کہ اس شرط سے معاف کرتا ہوں۔ کہ اپنے لڑکے کو میرا غلام بنائے یا اپنی دختر سے زنا کی اجازت دے۔ پس اس قسم کی غیر معقول شرطیں غیر مقبول ہیں اس میں اتباع ہرگز جائز نہیں اور نیز قاتل کے ذمّہ یہ واجب ہے کہ جس چیز کا دینا قبول کیا ہے اس کو نیکی اور سلوک کے ساتھ معاف کرنے والے کی طرف ادا کردے بلا تاخیر کے وقتِ مقررہ پر دیت کی پوری رقم ادا کردے نہ ٹلائے اور نہ اس کو پریشان کرے اور نہ کوئی دغل وفصل کرے یہ دیت اور عفو کی اجازت تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف ہے اور رحمت اور مہربانی ہے ورنہ جرم کے لحاظ سے تو سوائے سزائے قتل کے اور کوئی گنجائش نہ تھی۔ تخفیف یہ کہ یہود کی طرح قصاص کو۔ جب اور نصاریٰ کی طرح عفو کو لازم نہیں قرار دیا مہربانی یہ ہے کہ قاتل، اولیاءِ مقتول کی خوشامد کرکے معاف کرالینے اور اُن کو راضی کرلینے سے زندہ رہ سکتا ہے اور وارثانِ مقتول کو اگر حاجت ہو تو مال لے لیں اور اگر ثوابِ آخرت کے طالب ہوں تو حِسبۃً للہ خون معاف کر دیں پس جو شخص اس تخفیف اور رحمت کے بعد حد سے تجاوز کرے مثلاً معاف کرنے اور دیت لینے کے بعد جب قاتل مطمئن ہو جائے تو اسکو قتل کردے یا قاتل دیت کا وعدہ کرکے فرار ہو جائے تو ایسے شخص کے لیے دردناک عذاب ہے اور قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن اس میں تمہاری بہت سی جانوں کی زندگی ہے۔ ایک جان لینے سے بہت سی جانیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یعنی قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن بہت سی جانیں اس سے محفوظ رہتی ہیں۔ قاتل گناہ سے پاک ہوا

اور عذاب دوزخ سے رہائی پائی اور حیات ابدی اسکو حاصل ہوئی اور مقتول اگرچہ مارا گیا لیکن جب اس کا عوض اور بدلہ لے لیا گیا تو اسکا مرنا رائیگاں نہیں گیا۔ وارثان مقتول کے لیے باعث عزوجاہ ہوا اور قصاص لے لینے سے وارثوں کا دل ٹھنڈا ہوا غصّہ کی آگ بجھ گئی اور آئندہ کے لیے کشت وخون کا سلسلہ بند ہوا فریقین ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے پس اس حکم کا مشروع ہونا خلائق کے لیے موجب رحمت اور سرمایۂ زندگی ہوا اے عقل اور فہم والو اگر تم مغز سخن کو دریافت کرنا چاہو اور پوست پر قناعت نہ کرو تو سمجھ لو کہ قصاص سراسر زندگی ہے البتہ جن لوگوں کی عقل خالص نہیں وہ بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے فقط ظاہر پر اکتفا کرتے ہیں اور قصاص کو اتلافِ جان سمجھتے ہیں اور یہ حکم اس لیے مشروع ہوا کہ شاید تم افراطِ غضب سے پرہیز کرو تاکہ غضب خداوندی سے بچ جاؤ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ

حکم ہوا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت اگر کچھ مال چھوڑے

خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ

کہ دلوا مرے ماں باپ کو اور ناتے والوں کو دستور سے

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ

ضرور ہے پرہیزگاروں کو پھر جو کوئی اسکو بدلے بعد اسکے کہ سن چکا تو اس

فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ

کا گناہ انہیں ہی پر جنہوں نے بدلا بیشک اللہ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا

ہے سنتا جانتا پھر جو کوئی ڈرا دلوانے والے کی طرفداری سے یا

أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

گناہ سے پھر ان میں صلح کروا دے تو اس پر گناہ نہیں البتہ اللہ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾ ع

بخشنے والا ہے مہربان۔

ع ۲۲ ۶ ۶

حکمِ دوم وصیّت

قال تعالیٰ۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ.. الی.. إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

گزشتہ آیات میں قصاص کو حیات فرمایا۔ آئندہ آیات میں وصیّت کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو خاندان کی حیات اور زندگی کا سامان ہے۔ شروع اسلام میں جب تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا تو والدین اور اقارب کے لیے وصیت فرض تھی مقدار کی کوئی تعیین نہ تھی۔ وصیت کرنے والے کی صواب دید پر تھا کہ جتنی مقدار مناسب سمجھے اتنی مقدار کی وصیّت کر دے اسکے بعد جو باقی بچے وہ سب اولاد کا ہے اس آیت میں اسی حکم کا ذکر ہے اور چونکہ وصیت اور اقارب کی اعانت امر فطری اور جبلی ہے اور ہر ملت و مذہب میں رائج ہے اس لیے اس آیت کو پچھلی آیت کی طرح يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ سے شروع نہیں فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے موت کسی کے سامنے آجائے بشرطیکہ وہ اتنا مال چھوڑے کہ تجہیز و تکفین کے بعد بچ رہے تو اس پر لازم ہے وصیت کرنا والدین اور دیگر اقارب کے لیے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ وہ وصیّت شریعت کے مطابق ہو۔ مثلاً یہ نہ کرے کہ والدین کو نظر انداز کر دے اور دور کے رشتہ داروں کو مقدم کر دے یا فقیر رشتہ دار کو محروم کرے اور دولت مند کے لیے وصیّت کرے غرض یہ کہ جو وصیّت شریعت کے مطابق ہو جاتی ہے اسکا پورا کرنا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ضروری ہے کسی کو اس میں تغیر اور تبدل کا اختیار نہیں پس جو شخص حق لازم کی وصیت سن لینے کے بعد وصیت کے مضمون میں کچھ تغیر اور تبدل کرے تو اس تغیر و تبدل سے جو حق تلفی ہوگی اس کا گناہ تبدیل کرنے والوں پر ہوگا۔ حاکم اور مفتی نے اگر ظاہر اور قواعد شریعت کی بنا پر فیصلہ کیا ہے اور فتویٰ دیا ہے تو حاکم اور مفتی گنہ گار نہ ہوگا کیونکہ تحقیق اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں تبدیل کرنے والوں کے اقوال کو سنتے ہیں اور اُن کی نیتوں اور ارادوں کو جانتے ہیں اور حاکم اور مفتی کی معذوری کو بھی جانتے ہیں۔ البتہ ایک صورت میں وصیت میں تغیر و تبدل جائز ہے وہ یہ کہ وصیت کرنے والے سے کسی غلطی کا یا دیدہ دانستہ صریح گناہ کا اندیشہ ہو کہ غیر مستحق کو دے اور مستحق کو محروم کرے یا کسی کو کم اور کسی کو زیادہ دے۔ پس یہ شخص اگر اس وصیت کو درست کر دے یعنی اس وصیت کو شریعت کے مطابق کر دے تو ایسے تغیر و تبدل میں اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی رحمت فرمانے والے ہیں۔ نیت فاسدہ سے گناہ کرنے والوں کو بھی بخش دیتے ہیں اور جو شخص نیک نیتی سے کوئی تغیر اور تبدل کرے اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی؟

يَا أَيُّهَا	الَّذِينَ	آمَنُوا	كُتِبَ	عَلَيْكُمُ	الصِّيَامُ
اے	ایمان والو!		حکم ہوا	تم پر	روزے کا

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

جیسے حکم ہوا تھا تم سے اگلوں پر شاید تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

پرہیزگار ہوجاؤ کئی دن ہیں گنتی کے پھر جو کوئی تم میں

مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى

بیمار ہو یا سفر میں تو گنتی چاہیئے اور دنوں سے اور جن

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ

کو طاقت ہے تو بدلا ایک فقیر کا کھانا پھر جو کوئی

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ

شوق سے کرے نیکی تو اسکو بہتر ہے اور روزہ رکھو تو تمہارا بھلا ہے اگر

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

تم سمجھ رکھتے ہو

حکم سوم صوم

قال تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ... الیٰ... اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بجائے اہل ایمان کے اپنے نفس موذی کو مارو کہ جو ہر وقت تمہاری تاک میں ہے اور تمہارے خدا کے درمیان سدِّ راہ ہے تمہارا دشمن ہے اور تمہارے جانی اور ایمانی دشمن یعنی شیطان کا دوست بلکہ حقیقی اور بڑواں بھائی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ شیطان اور نفس دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ ساتھ پیدا ہوئے اس لیے ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس دشمن کو مارو اور روح کو زندہ کرو جو تمہارے پاس فرشتوں کی جنس کی ایک چیز ہے۔ نفس کے مارنے اور روح کے زندہ کرنے کا بہترین طریقہ صبر ہے اور صبر حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چند روز روزے رکھو قوت شہویہ اور قوت

غضبیہ جو تمام معاصی کا منبع ہے اسکے کچلنے کے لیے روزہ تریاق اور اکسیر کا حکم رکھتا ہے لیکن یہ روزہ ہنود اور صابئین کی طرح نہ رکھو کہ دن میں تو خود ردہ اشیاء[1] اور پھل اور میوے کھاتے رہو اور بوقت شب کھانے سے رکو۔ یہ طریقہ شریعت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا جیسے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا کہ مطلقاً کھانے اور پینے اور عورتوں کی صحبت سے دن میں کامل پرہیز رکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ تک یہی طریقہ رہا البتہ تعیین ایام میں اختلاف رہا حضرت آدمؑ پر ہر مہینہ میں تین دن کے روزے یعنی ایام بیض کے فرض تھے۔ یہود پر یوم عاشوراء اور ہفتہ اور اسکے سوا اور چند روز کے روزے فرض تھے۔ نصاریٰ پر ماہ رمضان کے روزے فرض تھے۔

معاذ بن جبلؓ اور ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ اور عطاءؒ اور ضحاکؒ اور قتادہؒ سے منقول ہے کہ عاشورہ اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے لیکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مقرر رہے رمضان کے روزوں کے حکم سے یہ حکم منسوخ ہوا۔ حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ واللہ ہر گزشتہ امت پر پورے ایک ماہ کے روزے فرض رہے جس طرح ہم پر فرض ہیں اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا روزہ اگلی امتوں پر فرض کیا تھا (رواہ ابن ابی حاتم) الغرض روزہ کی فرضیت قدیم ہے کوئی شریعت اسکی فرضیت سے خالی نہیں رہی اس لیے یہ مبارک عبادت تم پر فرض کی گئی تاکہ تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ کیونکہ روزہ کی خاصیت ہی یہ ہے کہ روزہ کی عادت اور کثرت آدمی کو پرہیزگار بنا دیتی ہے اور یہ روزے تم پر شمار کیے ہوئے دنوں کے لیے فرض کیے گئے ہیں جو ایک مہینہ کی مدت ہے نہ بہت کم اور نہ بہت زیادہ اگر بہت کم ہوتی تو تھوڑی مدت کی عبادت سے نفس عبادت کے رنگ سے رنگین نہ ہوتا۔ اور اگر روزہ کی مدت بہت زیادہ ہوتی تو مشقت میں پڑ جاتے اس لیے تھوڑے ہی دنوں کا روزہ تم پر فرض کیا گیا مگر اس میں تمہاری سہولت کی رعایت کی گئی۔ پس ایک سہولت تو یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو جس کی وجہ سے روزہ رکھنا دشوار ہو تو اسکو اجازت ہے کہ روزہ افطار کر لے مگر اتنے دنوں کو شمار کر کے بجائے رمضان کے دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لے خواہ مسلسل یا فاصلہ سے اور دوسری سہولت یہ ہے (جو بعد میں منسوخ ہوگئی) کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں مگر باوجود اسکے روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو اسکے ذمے اسکا فدیہ یعنی روزہ کا بدلہ دینا ہے اور وہ فدیہ ایک مسکین کی خوراک ہے اس لیے کہ یہ شخص خدا کے لیے خود ترکِ طعام و شراب نہیں کر سکتا تو کسی مسکین ہی کو کھلا دے کہ جب وہ کھا کر عبادت کریگا تو ثواب میں اسکا بھی حصہ ہو جائیگا اور یہ بدلہ بہت ہی کم ہے۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ۔ لیکن جو شخص خوشی سے

[1] جیسے گاندھی کا طریقہ تھا کہ برت رکھتا تھا۔ روٹی تو نہ کھاتا تھا مگر انار اور انگور اور سیب کا عرق پیتا تھا گویا کہ پوری کچوری سے تو برت ٹوٹ جاتا تھا مگر عرق انار اور انگور سے برت نہ ٹوٹتا تھا ۱۲ ہندوؤں کی برت کو فاقہ کہنا تو جائز ہے مگر اسکو روزہ کہنا ناجائز ہے۔

خیر اور نیکی میں زیادتی کرے یعنی بجائے ایک مسکین کے کئی مسکینوں کو کھانا دے دے تو وہ بھی بہتر ہے جتنی نیکی زیادہ کرو گے اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا لیکن تمہارا خود روزہ رکھنا فدیہ سے کہیں بہتر ہے اگرچہ فدیہ مقدارِ واجب سے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اگر تم روزہ کے فضائل اور فوائد کو جانتے ہو کہ روزہ کس درجہ کی عبادت ہے روح کے زندہ کرنے اور نفس اور شہوات کے کچلنے میں کوئی اسکا بدل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عمل کا اجر محدود ہے مگر صبر اور روزہ کا اجر غیر محدود ہے۔ نماز اور زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی ایک محسوس صورت ہے جو ریا وغیرہ کے ذریعے سے توڑی جاسکتی ہے مگر روزہ کی کوئی صورتِ محسوسہ نہیں کہ جسکو توڑا جاسکے۔



شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ

مہینہ رمضان کا جس میں نازل ہوا قرآن

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ

ہدایت واسطے لوگوں کے اور کھلی نشانیاں راہ کی اور

الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ

فیصلہ پھر جو کوئی پاوے تم میں یہ مہینہ تو اسکو روزہ رکھے

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ

اور جو کوئی ہو بیمار یا سفر میں تو گنتی چاہیے اور دنوں

اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ

سے اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر مشکل

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ

اور اس واسطے کہ پوری کرو گنتی اور بڑائی کرو اللہ کی اس پر کہ تمکو راہ بتائی

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵

اور شاید تم احسان مانو

تعیینِ ایّامِ معدودہ

قال تعالیٰ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ.. الیٰ... وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ہ

گزشتہ آیات میں بلا تعیین چند دنوں کے روزہ رکھنے کا حکم مذکور تھا اب ان آیات میں حق تعالیٰ شانہٗ اُن ایام معدودات کی تعیین فرماتے ہیں یعنی وہ شمار کیے ہوئے دن جن میں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے وہ ماہ رمضان المبارک ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا جو تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت اور امتیاز حق و باطل کی صاف صاف اور نہایت واضح اور روشن دلیلیں اور نشانیاں ہیں جو سوائے قرآن کے اور کسی کتاب میں نہیں۔ توریت اور انجیل بھی نور اور ہدایت تھی اور حق اور باطل میں فرق کرتی تھی مگر قرآن کی طرح واضح اور روشن نہ تھی۔ قرآن کریم کا ہر حرف ہدایت اور امتیاز حق اور باطل کی واضح اور روشن دلیل ہے اسی وجہ سے بینات کو جمع لایا گیا اور ہُدیٰ کو مفرد لایا گیا۔ ہدایت کبھی خفی ہوتی ہے اور کبھی جلی اور کبھی آفتاب کی طرح اجلیٰ اور روشن ہوتی ہے۔ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کریم ہدایت اور امتیاز حق و باطل میں آفتاب کی طرح روشن ہے توریت و انجیل اس درجہ روشن نہ تھیں پس تم میں سے جو شخص یہ مہینہ پائے تو اسکو چاہیئے کہ اسکے روزے رکھے جتنا مہینہ پاوے اتنے کے روزے رکھے اگر پورا مہینہ پائے تو پورے مہینے کے روزے رکھے اور اگر کچھ دن پائے تو اتنے دن روزے رکھے غرض یہ کہ جو شخص اس مہینہ کو پائے اسکے ذمہ یہ لازم اور فرض ہے کہ اس مہینہ کے روزے رکھے اور ابتداء میں جو فدیہ کی اجازت دی گئی وہ منسوخ ہوئی اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہے اب انکو افطار کی اجازت نہیں رہی اس آیت سے فدیہ کا حکم منسوخ ہوگیا اور البتہ مریض اور مسافر کے لیے جو سفر اور مرض کی وجہ سے افطار کی رخصت اور اجازت دی گئی تھی وہ ہنوز اسی طرح باقی ہے کہ جو شخص ایسا بیمار ہو کہ جسکو روزہ رکھنا دشوار ہو یا شرعی سفر پر ہو یعنی سفر میں جتنی مسافت شریعت میں معتبر ہے اتنی مسافت کے سفر کا ارادہ ہو تو ایسے شخص کو رمضان میں افطار کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے شمار کے مطابق روزے رکھنا اس پر لازم ہے۔ مریض اور مسافر کے حکم کو اس لیے مکرر بیان کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ فقط فدیہ کا حکم منسوخ ہوا ہے معذور کیلئے افطار اور قضاء کا حکم منسوخ نہیں ہوا اور قضاء کے حکم میں فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ فرمایا یعنی اور دنوں میں گنتی اور شمار کے مطابق روزے رکھنے چاہئیں اور دنوں کی قید اس لیے لگائی کہ رمضان کے فوت شدہ روزوں کی قضاء آئندہ رمضان میں جائز نہیں۔ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں قضاء کے روزے رکھنے چاہئیں اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت اور آسانی کرنا چاہتے ہیں اور تم پر سختی اور دشواری نہیں چاہتے اس لیے تمکو مرض اور سفر کی حالت میں افطار کی اجازت دی اور دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے

شمار کے مطابق قضاء کا حکم اس لیے دیا کہ تم اپنے روزوں کے شمار کو پورا کر لو تاکہ تمہارے ثواب میں کمی نہ رہ جائے اور تم اس شمار کو پورا کرکے متقی اور پرہیزگار بن جاؤ اور اس میں بھی یہ سہولت ہے کہ فوت شدہ روزوں کی قضا خواہ ایک ہی مرتبہ کر لو یا متفرق کر کے رکھ لو دونوں اختیار ہیں اور تاکہ تم اللہ کی کبریائی اور بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ایسے طریقہ کی ہدایت کی کہ جس سے تم رمضان المبارک کی فوت شدہ خیرات و برکات کی قضاء سے کچھ تلافی کر سکو۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ سے رمضان کے تیس دن پورے کرنا مراد ہیں اور لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ سے ختم رمضان کے بعد عید کا چاند دیکھ کر اور عید میں جاتے وقت اور عید کی نماز میں تکبیر کہنا مراد ہے جس طرح نمازؔ اور حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکر خداوندی مسنون ہے اسی طرح رمضان کے روزوں سے فارغ ہونے کے بعد تکبیر و تحمید مسنون ہے اور تاکہ تم اللہ کا شکر کیا کرو کہ اس نے تم پر ایک مہینہ کے روزے فرض کیے کہ جو درجاتِ عالیہ کے ملنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور اس پر بھی شکر کرو کہ اس نے حالتِ مرض اور سفر میں تمہیں افطار کی اجازت دی کہ جس میں تمہارے لیے تخفیف اور سہولت ہے۔ غرض یہ کہ عزیمت بھی نعمت ہے اور رخصت بھی نعمت ہے سب نعمتوں کا شکر کرو تاکہ کامل متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔

★ نزولِ قرآن اور صیامِ رمضان میں مناسبت

نزول قرآن اور صیام رمضان میں مناسبت یہ ہے کہ حق جل شانہٗ نے اس مہینہ کو قرآن کریم کے نازل کرنے کے لیے پسند کیا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام معجز نظام کے انوار و تجلیات اور خیرات و برکات کی کوئی حد اور نہایت نہیں۔ محبین اور عاشقین دنیا میں اللہ کے دیدار سے محروم ہیں لیکن اس کے کلام سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ کلام کے پردہ سے کچھ اسکا جلوہ نظر آجاتا ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

چیست قرآں اے کلام حق شناس | رونمائے ربّ ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنئے | معنئے در معنئے در معنئے

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے توریت اور انجیل اور زبور اسی مہینہ میں آتاری۔ یکم رمضان المبارک

ع کما قال تعالیٰ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ وقال تعالیٰ فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ پہلی آیت سے نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد ذکر خداوندی کا حکم ہے اور دوسری آیت میں حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکر الٰہی کا حکم ہے۔ ۱۲

کو حضرت ابراہیم پر صحیفے اور چھ رمضان کو توریت نازل ہوئی اور بارہ رمضان کو زبور اتری اور اٹھارہ رمضان کو انجیل نازل ہوئی اور چوبیس رمضان کی شب کو قرآن کریم نازل ہوا۔

غرض یہ کہ ماہ رمضان عجیب مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ کا کلام نازل ہوا اور اللہ کی کتاب اتری جو ایک نعمت کبریٰ اور منت عظمیٰ ہے۔ لہٰذا اس عظیم الشان نعمت کے شکریہ میں کوئی خاص عبادت اس مہینہ میں مقرر ہونی چاہیئے جو کلام الٰہی کے مناسب ہو سو وہ روزہ ہے۔ جو روزہ دار کو ترک طعام و شراب اور ترک لذت کی وجہ سے فرشتوں کے قریب بنا دیتا ہے اور قلب میں کلام خداوندی کے اسرار و تجلیات کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کیونکہ بشری اور نفسانی کدورتوں اور ظلمتوں کے دور کرنے اور قلب کے جلاا ور صیقل کرنے میں روزہ ایک بے مثال تریاق اور بے نظیر اکسیر ہے انوار و تجلیات کے دسترخوان سے وہی شخص کماحقہٗ بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جس نے اس حسی اور مادی دسترخوان کو کم از کم کچھ دنوں کے لیے لپیٹ کر رکھ دیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر توریت لینے کے لیے گئے تو چالیس دن کے روزے رکھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بیابان میں چالیس روزے رکھے اس وقت اللہ نے انکو انجیل عطا کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا میں اعتکاف فرمایا اور روزے رکھے۔ اسی غار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت کا خلعت عطا ہوا۔ معلوم ہوا کہ روزہ کو کلام خداوندی کے ساتھ خاص مناسبت ہے اس لیے اس مبارک مہینہ میں دن میں تو روزہ اور رات میں تراویح مسنون ہوئی اور عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف سنت ہوا اور دن اور رات میں قرآن کریم کی تلاوت اور دور کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا۔

حدیث میں ہے کہ جبریل امین رمضان المبارک میں حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کا دور کرتے اور جس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس سال جبریل امین نے پورے قرآن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ دور کیا۔ ایک مرتبہ آپ پڑھتے اور جبریل امین سنتے اور دوسری مرتبہ جبریل پڑھتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سنتے اس طرح دو قرآن کریم کا دو مرتبہ دور ہوا۔ اور یہ مہینہ تمام کا تمام ہی مبارک ہے مگر شب قدر اس مہینہ کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ اسی شب میں قرآن اترا۔ اور اسی میں فرشتوں کا خاص طور سے نزول ہوتا ہے۔ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ رمضان کا پورا مہینہ نہایت مبارک ہے مگر وہ انوار و برکات جو اس مہینہ کے دنوں سے وابستہ ہیں وہ اور ہیں اور جو خیرات و برکات اس مہینہ کی راتوں سے متعلق ہیں وہ اور ہیں اور ممکن ہے کہ اسی وجہ سے یہ حکم ہوا ہو کہ افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کریں۔ تاکہ دونوں وقتوں میں پورا امتیاز حاصل ہو جائے اور جس طرح قرآن مجید خداوند ذوالجلال کے کمالات ذاتیہ اور شئون صفاتیہ کا مظہر اتم ہے اسی طرح ماہ رمضان حق تعالے کی خیرات و برکات ذاتیہ کا مظہر اتم ہے اس مہینہ میں جو خیر و برکت بھی نازل ہوتی ہے وہ براہ راست بارگاہ ذات سے فائض ہوتی ہے قرآن کریم

کی طرح یہ مہینہ بھی اپنی نوع میں حقیقت جامعہ ہے اسی مناسبت سے اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا اور چونکہ درختوں میں کھجور کا درخت شجرۂ طیبہ ہے اور کھجور اسکا ثمرۂ طیبہ اور حقیقت جامعہ ہے اور حضرت آدم کے خمیر کا بقیہ ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اذا افطر احدکم فلیفطر علی تمر فانہ برکۃ — جو کوئی روزہ افطار کرے تو کھجور سے افطار کرے کیونکہ کھجور سراسر خیر و برکت ہے۔

اور خلوِّ معدہ میں جب یہ مبارک پھل پہنچے گا تو یہی جامع اور مبارک غذا جزو بدن بنے گی جس سے روزہ کی برکتوں میں اور اضافہ ہوجائیگا۔ اس طرح سے روزہ اور غذائے جامع کی برکتوں کے مل جانے سے قلب نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائیگا اور اسی وجہ سے کہ کھجور ایک نہایت مبارک اور جامع غذا ہے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری میں بھی کھجور کے کھانے کی ترغیب دی اور ارشاد فرمایا۔

نعم سحور المؤمن التمر — کھجور مؤمن کی کیا اچھی سحری ہے۔

قرآن کریم میں ایمان کو شجرۂ طیبہ یعنی کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور رمضان کا روزہ ایمان کا ایک شعبہ ہے اس لیے رمضان کا افطار اور سحری مرد مؤمن کے لیے کھجور سے مسنون ہوئی۔ اور شب قدر اس مہینہ کا خلاصہ اور زبدہ ہے گویا کہ شب قدر بمنزلہ مغز کے ہے اور یہ مہینہ پوست کے ہے۔ پس جس کا یہ مہینہ جمعیتِ خاطر کے ساتھ گذر جائے اور اس مبارک مہینہ کی خیرات و برکات سے بہرہ اندوز ہوجائے تو اسکا تمام سال جمعیت اور خیر و برکت کے ساتھ گزرتا ہے۔ وفقنا اللہ تعالیٰ للخیرات والبرکات فی ھذا الشھر المبارک ورزقنا اللہ سبحانہ النصیب الاعظم منہ آمین۔
(مکتوب ۱۶۲ دفتر اول)

فائدۂ جلیلہ رمضان کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کے دن اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھے جاتے تھے اس میں اختلاف ہے کہ وہ روزے فرض تھے یا نفل۔ عبداللہ بن عباس اور معاذ بن جبل اور عطار رضی اللہ عنہم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روزے فرض تھے اور ابن ابی لیلیٰ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نہ تھے بلکہ محض بطور تطوع اور نفل رکھے جاتے تھے۔ اکثر احادیث سے وجوب ہی معلوم ہوتا ہے بہرحال جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو صوم عاشورہ اور ہر مہینے میں تین روزوں کی فرضیت تو باقی نہ رہی البتہ استحباب باقی رہ گیا اور اس میں بھی ویسا اہتمام نہ رہا جیسا کہ پہلے تھا۔

اسی وجہ سے علماء کا اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض صحابہ اور تابعین ادھر گئے ہیں کہ ان گنتی کے دنوں سے عاشورہ اور ہر مہینے کے تین دن کے روزے مراد ہیں۔ جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو یہ روزے منسوخ ہوگئے اور جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک یہ ہے کہ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ سے رمضان کے روزے مراد ہیں اور یہ آیت منسوخ نہیں۔ اور صوم عاشورہ اور ایام بیض کا حکم من جانب اللہ

نہ تھا بلکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے ان دنوں کے روزوں کو پسند فرمایا۔ جیسا کہ ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ وہ عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ دن بہت مبارک ہے اس دن میں اللہ تعالے نے بنی اسرائیل کو دشمن سے نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بطور شکر یہ اس دن کا روزہ رکھا۔ اس لیے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کا حق دار ہوں اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا (بخاری ومسلم)

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ اور ابو داؤدؒ اور حاکمؒ نے معاذ بن جبلؓ سے عاشورہ کا روزہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کا واجب ہونا روایت کیا لیکن یہ وجوب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا اور اس آیت سے منسوخ ہو گیا۔

پس معلوم ہوا کہ راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے رمضان کے روزے مراد ہیں۔ عاشوراء اور ہر مہینہ کے تین روزے مراد نہیں اس لیے کہ افطار کر کے فدیہ دے دینے کی اجازت احادیث اور روایات میں رمضان المبارک کے روزوں کے متعلق آئی ہے۔ عاشوراء اور ہر مہینہ کے تین دن کے روزوں کے متعلق فدیہ کا حکم کہیں ثابت نہیں۔ سنن ابو داؤد کی ایک روایت سے یہ ایہام ہوتا ہے کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ کا حکم عاشورہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کے متعلق ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ روایت مختصر ہے۔ دوسری مفصل روایت میں رمضان کے روزوں کا مفصل ذکر ہے اور عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا حکم رمضان ہی کے روزوں سے متعلق ہے اس روایت میں رمضان کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایہام ہوا۔ واللہ اعلم۔

اقوالِ علماء کرام دربارۂ تفسیر آیت فدیۂ صیام

قال تعالیٰ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط

اس آیت کی تاویل اور حکم میں علماء کا اختلاف ہے آیت مذکورہ کے متعلق علماء تفسیر کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے اس فریق سے آیت کی مختلف توجیہات منقول ہیں جنکو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

گروہ اوّل اکثر علماء محققین کی رائے یہی ہے کہ آیت میں نسخ ضرور واقع ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ اور سلمۃ بن الاکوعؓ اور دیگر صحابہ سے یہی منقول ہے اور بخاری اور مسلم اور

ابوداؤد و بیہقی وغیرہم کی احادیث اور روایات سے بھی یہی ظاہر ہے کہ ابتداء اسلام میں لوگوں کو اختیار تھا کہ اگر روزوں کی ہمت ہو تو روزے رکھیں ورنہ روزہ افطار کرلیں اور روزہ کے بدلہ میں فدیہ دیدیں۔ وجہ یہ تھی کہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہ تھے اگر ابتداء ہی سے روزہ کا قطعی حکم ہو جاتا تو شاق ہوتا بعد چندے یہ اختیار منسوخ ہوگیا اور فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ سے روزہ رکھنے کا حکم قطعی ہوگیا۔ چنانچہ حافظ بدرالدین عینیؒ شرح بخاری میں آیاتِ صیام کی ترتیب نزولی اور ناسخ و منسوخ کی تعیین کے بارے میں لکھتے ہیں۔

كان فی بدء الاسلام فرض علیهم الصوم فاشتد علیهم فرخص لهم فی الافطار والفدیة وقال معاذؓ كان فی ابتداء الامر من شاء صام ومن شاء افطر واطعم عن كل یوم مسكینا حتی نزلت الآیة التی بعدها فنسختها (عینی شرح بخاری ص ۲۷۴ ج ۱)

شروع اسلام میں روزے فرض ہوتے لیکن (عادت نہ ہونے کی وجہ سے) لوگوں پر گراں گزرے تو افطار کرکے فدیہ دے دینے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ شروع اسلام میں جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا افطار کرتا اور اسکے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔ یہاں تک کہ اسکے بعد کی آیت نازل ہوئی اور یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

امام ابن جریر طبریؒ بروایت ابن ابی لیلیٰؒ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم لما قدم علیهم امرهم بصیام ثلثة ایام من كل شهر تطوعا غیر فریضة قال ثم نزل صیام رمضان قال وكانوا قوما لم یتعودوا الصیام قال وكان یشتد علیهم الصوم قال فكان من لم یصم اطعم مسكینا ثم نزلت هٰذه الآیة فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ آئے تو اپنے صحابہ کو ہر مہینہ میں تین دن کے روزوں کا حکم دیا مگر بطور فرض نہیں بلکہ بطور نفل حکم دیا۔ اسکے بعد رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا مگر چونکہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہ تھے اس وجہ سے انکو روزہ رکھنا گراں ہوا تو یہ سہولت کردی گئی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دے چنانچہ کچھ عرصہ تک لوگ ایسا ہی کرتے رہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھتا وہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دیتا چند روز کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ الی آخرہ۔ اس وقت